برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔ تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات) مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ مسلم تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات۔ حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل) تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔ اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے)۔ کتابتِ حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۷۶ | ماہ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ مطابق جنوری ۱۹۷۶ء | شمارہ ۱

فہرست مضامین

نظرات

فرض کیجئے آپ ایک نہایت عالیشان اور پرشکوہ بلڈنگ کے مالک ہیں اور اس میں اچانک ایسی آگ لگ گئی ہے جس کے شعلے چاروں طرف بلند ہو رہے ہیں اور تیز ہواؤں نے انھیں اور زیادہ مشتعل اور خطرناک بنا دیا ہے، بلڈنگ کی چھت کی کڑیاں تڑاق تڑاق کرکے ٹوٹنے لگی اور در و دیوار جلنے لگے ہیں۔ آپ آگ بجھانے کی ہزار کوشش کر رہے ہیں مگر آگ قابو میں نہیں آتی، اس وقت اگر کچھ لوگ آپ کی ہمدردی میں آگ بجھانے کے لئے آجائیں تو کیا آپ ان سے یہ کہیں گے کہ آپ کا مشرب اور مسلک کیا ہے؟ پہلے آپ یہ بتایئے کہ آپ میرے ہم خیال اور ہم عقیدہ ہیں یا نہیں؟ اگر آپ میرے ہم خیال اور ہم عقیدہ نہیں ہیں تو میں آپ کو آگ بجھانے کی کوششوں میں شرکت کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ فرمائیے کہ کیا کوئی معقول انسان جس کو اس بلڈنگ سے محبت ہو بقائمی صحت ہوش و حواس یہ رویہ اختیار کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں!!

آج یہی حال اسلام کا ہے، وہ چاروں طرف سے نرغہ میں پھنسا ہوا ہے، ہر سمت سے اس پر یورش ہو رہی ہے، اپنے اور بیگانے سب اس پر ظلم کر رہے ہیں، پورے عالم اسلام پر نگاہ ڈالئے کہیں افراط زر اور سیاسی خود مختاری و آزادی نے قرآن مجید کے ارشاد "اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ" تم کو بہتات نے خدا اور یوم آخرت سے غافل بنا دیا ہے" کے مطابق فرزندان توحید کو راہ سے بے راہ کر دیا ہے کہیں غربت و افلاس نے اور کہیں جہالت نے انھیں حق سے بیگانہ اور دین قیم کے واجبات و مطالبات کی طرف سے بے حس اور بے خبر بنا دیا ہے، پھر مغربی تہذیب، مغربی افکار و آرا، اور

پر مبنی تحریکات و رجحانات نے ایک طوفان بلکہ وہ ستم ڈھایا ہے کہ اسلام کی کشتی ڈگمگانے لگی ہے، اس بنا پر آج اسلام کی حفاظت کے لئے ایک نہیں سینکڑوں محاذ ہیں۔ تعلیم کا بھی ہے اور تعلیم بھی قدیم اور جدید دونوں، تصنیف وتالیف کا بھی ہے اور سیاست کا بھی، تبلیغ واشاعت کا بھی ہے اور وعظ وارشاد کا بھی، روحانی تصفیہ وتزکیۂ باطن کا بھی ہے اور اقتصادی ومعاشی پروگراموں کو ترقی دینے کا بھی۔ اور سماجی فلاح وبہبود کے میدان میں کام کرنے کا بھی، یہ سب محاذ اپنی ایک مستقل اہمیت وضرورت رکھتے ہیں، نیت میں خلوص اور عمل میں للّٰہیت اور ایک اعلیٰ مقصدِ حیات کے ساتھ وابستگی شرط ہے۔ اگر نیت وارادہ میں للّٰہیت اور خلوص ہے تو بڑے سے بڑا وہ کام جسے ہم اپنی اصطلاح میں "دنیوی" کہتے ہیں وہ بھی عبادت اور رضائے رب کے حصول کا ذریعہ ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو بڑی سے بڑی عبادت، تبلیغ اور وعظ وارشاد، اور مجاہدہ وریاضت ایک دھوکا اور فریب ہے۔

اسلام میں آج سے نہیں شروع سے مختلف فرقے اور مختلف مذاہب ومسالک ہیں اور اسلام میں جامعیت وہمہ گیری کے ساتھ جو قانونی لچک ہے اس کے پیش نظر ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ لیکن جب تک مسلمانوں کو اسلام سب سے زیادہ عزیز رہا اور وہ اپنے ہر ذاتی اور جماعتی مفاد کو اسلام کے مفاد اور اس کی مصلحت پر قربان کر دینے کے جذبہ سے سرشار رہے یہ اختلافات جو کلامی اور فقہی مسائل میں پیدا ہوئے تھے اور جن کے باعث مسلمانوں میں گروہ بندی پیدا ہوئی تھی اسلامی اخوت ومحبت اور مسلمانوں کے ملی اتحاد میں مانع نہیں ہوئے، لیکن اس کے برعکس جب کبھی مسلمانوں نے ان اختلافات کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اسلامی مفاد مجروح ہو گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کی اجتماعیت برباد ہو گئی اور ملی اتحاد واتفاق کا شیرازہ منتشر ہو گیا جس سے اسلام کے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور پھر نہ یہ بچے اور نہ وہ مسلمان بحیثیت ایک ملت کے سب ہی حریفانہ کوششوں اور تدبیروں کا شکار ہو گئے، "برہان" کا یہ وہ نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے

اس نے اپنی زندگی کے ۷۰ برس میں صلح کل کو اپنا شعار بنائے رکھا اور کبھی شخصی یا جماعتی بحث وجدال کے خارزار میں اپنا دامن الجھنے نہیں دیا۔

چند مہینے ہوئے ایک کتابچہ "فتنۂ مودودیت" کے نام سے ہمیں موصول ہوا تھا جو در حقیقت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی کا ایک پرائیویٹ مکتوب مدرسۂ مظاہر العلوم سہارنپور کے ایک سابق استاد جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے متاثر تھے ان کے نام تھا اور ۵۲ء میں لکھا گیا تھا، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا چونکہ اس قسم کی بحث میں پڑنا برہان کے مسلک کے خلاف تھا اس لئے ہمارا ارادہ اس پر تبصرہ کرنے کا نہیں تھا لیکن کتابچہ ملنے کے چند روز کے بعد جناب ناشر کا ایک خط ملا جس میں حضرت شیخ الحدیث کی طرف سے کتاب پر برہان میں تبصرہ کی فرمائش کی گئی تھی۔ حضرت موصوف کی جو عظمت اور قدر ومنزلت اور نہ صرف یہ بلکہ اس طرف ایک روحانی کشش جو خاکسار راقم الحروف کے دل میں ہے اس کا تقاضا تھا کہ فوراً ارشاد کی تعمیل کی جاتی لیکن مشکل یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل کے بارہ میں برہان کے اپنے معیار اور اصول کے مطابق اگر تبصرہ لکھا جاتا تو وہ چھ سات قسطوں سے کم میں نہیں آتا۔ اور افسوس ہے کہ چند در چند مشاغل علمی کے باعث اس کی فرصت بالکل نہیں ہے، اس لئے سر دست چند معروضات پر اکتفا کیا جاتا ہے، کبھی موقع ہوا تو اس پر مفصل تبصرہ بھی کر دیا جائے گا۔

---

(۱) حضرت شیخ الحدیث نے اپنے والا نامہ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر جو گرفت کی اور جو علمی ایرادات وارد کئے ہیں وہ بے شبہ بالکل صحیح اور درست ہیں، اگرچہ اس انداز کا مفرطانہ فکر ان حضرات کے ہاں ملتا ہے جو کسی ایک اصلاحی تحریک کے بانی ہوئے ہیں مثلاً شیخ عبدالوہاب نجدی اور مہدی سوڈانی وغیرہ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ علمائے اہل سنت والجماعت کے مسلک اور ان کی تصریحات

کے خلاف وہ تمام چیزیں ہیں جن کا ذکر اس تحریر میں ہے، ان کے علاوہ مولانا مودودی کی اگر اور تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی کچھ اور چیزیں ایسی ملیں گی جو علمی اور فکری حیثیت سے ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔

(۲) لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے صرف نظر کرنا قرین انصاف نہیں ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی علوم وفنون نے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں اسلامی تعلیمات و احکام سے متعلق جو سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا کر دیے تھے ان کے ازالہ اور مسلمانوں کے ذہن وفکر میں یقین و اعتماد کی کیفیت پیدا کرنے کی غرض سے مدلل و مبرہن اور دلنشین و موثر پیرایۂ بیان میں جتنی اور جیسی تحریریں مولانا مودودی نے لکھی ہیں ہند و پاک میں کسی نے نہیں لکھیں، اور یہ تحریریں بے اثر نہیں رہیں۔ آج دنیا کے ہر ملک میں انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ موجود ہے جو ان تحریروں سے متاثر ہے اور عملاً اس طبقہ میں بحیثیت مجموعی اسلامی ڈسپلن پایا جاتا ہے۔

(۳) بنابریں علیہ کیا اسلامی مفاد کا یہ تقاضا نہیں کہ مخالفت کو مولانا مودودی کے بعض افکار و خیالات کی سنجیدہ اور متین زبان میں علمی تردید تک محدود رکھا جائے اور ان کے ساتھ تمسخر و استہزا کا معاملہ نہ نہ کیا جائے، آخر "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ اور ادفع بالتی ھی احسن" کا اور کیا مطلب ہے۔

(۴) حضرت شیخ الحدیث کا یہ مکتوب گرامی پچیس برس پہلے کا لکھا ہوا ہے اور اس میں اگر درشت بیانی پائی جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا مودودی نے بھی بعض اکابر جمعیت کا نام لیکر ان کی شان میں گستاخی کی تھی اس بناپر اس خط سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی، البتہ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ آج جبکہ جماعت اسلامی ممنوع ہے اس مکتوب کو شائع کرنا اور وہ بھی اشتعال انگیز عنوان سے بزدلی اور سخت قسم کی اخلاقی کمزوری ہے، پھر تبلیغی جماعت کا اس سے دلچسپی لینا بھی اس کے مسلک اور وقار کے خلاف ہے۔

عہد نبوی کے غزوات وسرایا
اور
ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۶)

سعید احمد اکبر آبادی

بنو قریظہ

اب مدینہ کے مشہور اور بڑے قبائل میں سے صرف ایک قبیلہ بنو قریظہ کا رہ گیا تھا اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو سازشیں ہوئی تھیں بنو قریظہ ان سب میں اپنے ہم مذہبوں کے شریک وسہیم تھے لیکن چونکہ انھوں نے بنونضیر کی جلا وطنی کے بعد بھی مدینہ میں قیام کرنا پسند کیا اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس سے زیادہ اور کیا رعایت اور رواداری ہوسکتی تھی کہ آپ نے ان کو مدینہ میں قیام کی اجازت دے دی البتہ معاہدہ کی تجدید ضروری تھی، چنانچہ وہ آپ نے کی، اور جیسا کہ گذر چکا ہے اس معاہدہ کی ایک اہم دفعہ یہی تھی کہ مدینہ پر دشمن حملہ آور ہوگا تو بنو قریظہ اس کی کوئی مدد نہیں کریں گے اور ایک پرامن شہری کی طرح رہیں گے، لیکن وہ اپنی فطرت سے کس طرح باز آسکتے تھے بلکہ جیسا کہ واقدی نے بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب کی زبانی نقل کیا ہے ان لوگوں نے معاہدہ کرکے مدینہ میں قیام کا فیصلہ کیا ہی اس غرض سے تھا کہ جب بھی ان کو موقع ملے گا وہ مسلمانوں کے دشمنوں سے

مگر انھیں نقصان پہونچانے کی کوشش کریں گے[1]۔ اس سلسلہ میں غزوۂ احزاب (خندق) کا ذکر ضروری ہے۔

غزوۂ احزاب

اوپر گذر چکا ہے کہ بنو نضیر کے بڑے بڑے سرداروں نے قریش اور قبیلۂ غطفان اور سلیم (جو اسلام دشمنی میں قریش سے کم نہیں تھے) اور دوسرے قبیلوں میں اپنے وفد بھیجکر ان کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی سخت ترغیب دی اور انھیں فتح و نصرت کا یقین دلاکر بہت کچھ سبز باغ دکھائے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہزار کا لشکرِ جرار تیار ہوگیا، اس میں قریش اور ان کے ساتھ بنو کنانہ اور اہل تہامہ ان سب کی تعداد چار ہزار تھی باقی چھ ہزار کی تعداد غطفان اور ان کے ساتھ نجد کے جو قبائل تھے ان پر مشتمل تھی، ہر قبیلہ کا قائد لشکر (کمانڈر) الگ الگ تھا، چنانچہ ابوسفیان بن حرب قریش کا قائد لشکر تھا اور یہی کمانڈر ان چیف بھی تھا، غطفان عیینہ بن حصن الفزاری کی زیر قیادت تھا۔ بنو مرۃ: حارث بن عوف کے، قبیلۂ اشجع، مسعود بن رخیلہ کے بنو سلیم، سفیان بن عبد شمس کے اور بنو اسد، طلیحہ بن خویلد الاسدی کے زیر قیادت تھے، ان کے ساز و سامان اور طنطنہ و طمطراق کا یہ عالم تھا کہ اس ٹڈی دل فوج میں چھ سو شہسوار (Cavalry) تھے جن میں سے تین سو تو صرف قریش کے تھے، باقی غطفان اور دوسرے قبیلوں کے تھے اور اونٹ ڈیڑھ ہزار تھے۔

دومۃ الجندل کی مہم

یہ تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک نیا شگوفہ یہ کھلا کہ بنو نضیر جو جلا وطن ہوکر مدینہ کے شمالی علاقوں میں جا بسے تھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان یہودی نو آبادیوں میں بھی آگ لگا دی تھی جو شام کے راستہ پر فلسطین تک پھیلی ہوئی تھیں، دومۃ الجندل جو شام کی سرحد اور مدینہ سے پانچ سو میل دور کی مسافت پر واقع تھا اس کے باشندوں پر بھی ان لوگوں کے اثرات تھے، ابن سعد میں ہے کہ شام سے

---

[1] مغازی واقدی ص ۲۶۲ بحوالۂ سیرت النبی ج ۱ ص ۴۴۳

جو قافلے مدینہ آتے تھے دومۃ الجندل کے لوگ ان کو ستاتے اور پریشان کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات کا علم ہوا تو آپ ان لوگوں کی سرزنش کی غرض سے ماہ ربیع الاول ۵ھ میں ایک ہزار صحابہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ آپ کے ہاں جاسوسی کا انتظام تو بہت اعلیٰ تھا ہی، ابھی آدھے راستہ میں ہی تھے کہ آپ کو قریش وغطفان وغیرہما کے منصوبوں کا علم ہوا اور آپ دومۃ الجندل کا ارادہ ترک کر کے مدینہ واپس آگئے،

صحابہ سے مشورہ اور خندق کی کھدائی | مدینہ پہونچکر آپ نے مشورہ کیا کہ اب جبکہ دشمن قبائل مدینہ پر اجتماعی حملہ کا منصوبہ بناکر اس کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں مسلمانوں کو ان کے دفاع میں کیا کرنا چاہیئے، حضرت سلمان فارسی نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ اہل ایران اس قسم کے موقع پر ایسا ہی کرتے ہیں، اگرچہ عرب اس طریقہ جنگ سے بالکل ناآشنا تھے لیکن حضور کو یہ تجویز پسند آئی [1] اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چند انصار و مہاجرین کو ساتھ لے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے اور مدینہ کے اطراف میں گھوم پھر کر ان مقامات کا معائنہ فرمایا جو جنگ اور محاصرہ میں اہمیت رکھ سکتے تھے۔ اور اس مقام کی تلاش کی جہاں پڑاؤ ڈال کر مسلمان سپاہی اتر سکیں، آپ نے اس وقت یہ طے کیا کہ مدینہ پر حملہ ہوا تو عورتوں، بچوں، جانوروں اور قیمتی گھر گرہستی کے سامان کو ان گڑھیوں میں منتقل کیا جائیگا جو مدینہ کے اطراف میں کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں اور جنھیں عربی میں آطام کہتے ہیں اور اسلامی لشکر کے کیمپ کے لئے آپ نے جو مقام منتخب فرمایا وہ سلع پہاڑی کا دامن تھا۔

---

[1] مستشرقین سب اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس زمانہ کے اصول جنگ کے اعتبار سے یہ طریقہ اعلیٰ اور ترقی یافتہ طریقۂ جنگ تھا، غزوۂ احد کے موقع پر بھی آپ کی رائے قریب یہی تھی، لیکن پرجوش اور نوجوان افسروں کے اصرار پر آپ نے مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا اور اس کا جو انجام ہوا سب کو معلوم ہے۔

مدینہ میں تین طرف باغوں اور نخلستانوں کا جال پھیلا ہوا تھا جو شہر کے لئے حصار کا کام دیتے تھے، البتہ شمالی رخ جسے شامی بھی کہہ سکتے ہیں کھلا ہوا تھا اور یہی سب سے خطرناک تھا، اگرچہ ایک حد تک مغربی رخ بھی ایسا ہی تھا۔ مشرق میں بنو قریظہ آباد تھے، ان سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی، بہرحال مدینہ کا جو رخ کھلا ہوا تھا یعنی شمالی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے مشورہ سے اسی رخ خندق کا کھودنا طے ہوگیا تو اب اس علاقے کی پیمائش کی گئی، مسلمان جو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جمع ہوگئے تھے ان کی تعداد تین ہزار تھی، ان پر کام کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ ہر دس آدمیوں کی ایک ٹکڑی کو بیس گز خندق کھودنے کا کام سپرد ہوا۔ اسی طرح ڈاکٹر حمید اللہ کے اندازہ کے مطابق یہ خندق تقریباً ساڑھے تین میل لانبی تھی خندق کی چوڑائی کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ہے، لیکن اس کا ثبوت موجود ہے کہ دشمن کے سواروں نے متعدد بار گھوڑا کدا کر خندق کو پار کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے، اور ایک مرتبہ اسی قسم کی کوشش میں ایک سوار خندق کے اندر گر کے مرگیا۔ اس سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے قیاس کیا ہے کہ خندق کی گہرائی تو دس گز تھی ہی اس کی چوڑائی بھی دس گز ہوگی[1] لیکن ہمارے خیال میں اگر قیاس کا معیار یہی ہے تو خندق کی چوڑائی دس گز سے یقیناً زیادہ ہونی چاہئے کیونکہ ایک اسپ تازی کے لئے دس گز پھلانگ جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

خندق کھودنے کا کام شروع ہوا تو صحابۂ کرام صبح سے ہی اس میں لگ جاتے اور بھوک پیاس کی پروا کئے بغیر شام تک اسے کرتے رہتے تھے اس درمیان میں اگر کسی کو کوئی ضرورت پیش آجاتی تو حضورؐ سے اجازت لے کر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے یہ منظر دیکھا کہ صحابہ فاقہ سے ہیں۔ سردی بلا کی پڑ رہی ہے، لیکن اس عالم میں بھی وہ تیشہ زنی میں مصروف ہیں

---

[1] عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۶۷

خندق کھود رہے ہیں اور مٹی اپنی کمر پر لاد لاد کر باہر پھینک رہے ہیں تو آپ کا جی بھر آیا اور زبان قدس گویا ہوئی "اے اللہ! اصل زندگی تو آخرت کی ہی ہے، تو انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما دے" جاں نثاروں نے یہ سنا تو بلند آواز سے بولے: ہم وہ ہیں جنھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں پر، جب تک ہم زندہ ہیں، جہاد کرنے کی بیعت کی ہے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ لشکر کے قائد اعظم تھے لیکن ایک مزدور کی طرح اس مہم میں برابر کے شریک تھے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضور خندق کھودتے جاتے اور مٹی باہر پھینکتے جاتے تھے، یہاں تک کہ شکم مبارک گرد سے اٹ گیا۔ حضرت جابر سے روایت ہے کہ ہم لوگ خندق کھود رہے تھے کہ اچانک ایک سخت چٹان آگئی جو سر نہیں ہوتی تھی، حضورؐ کو اس کا علم ہوا تو خندق میں اتر کے اس زور سے پھاوڑا مارا کہ چٹان غبار بنکر اڑ گئی۔[1]

مدینہ پر حملہ

خندق کتنے دنوں میں تکمیل کو پہونچی؟ اس میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک چھ دنوں میں، بعض کی رائے میں چند روز، اور ایک خیال یہ بھی ہے کہ چوبیس روز میں بنکر تیار ہوئی، بہرحال خندق سے فراغت ہوئی ہی تھی کہ دشمن کی فوج آپہونچی اور اس نے مدینہ کا محاصرہ اس طرح کیا کہ قریش، بنی کنانہ اور ان کے احابیش[2] یہ سب مقام جرف اور زغابہ کے درمیان رومہ پر اور غطفان اور ان کے ساتھی قبائل جبل احد کی سمت

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۃ الخندق

[2] یہ لوگ سخت سیاہ فام اور افریقی الاصل تھے ان لوگوں کو قریش کے امراء و رؤسا کی کاشتکاری کے لئے لایا گیا تھا۔ بعد میں ان کے متعدد قبیلے بن گئے۔ چنانچہ خزاعہ کے بنی المصطلق، الھون بن خزیمہ، اور ان کی شاخیں عضل اور القارہ یہ سب احابیش میں شمار ہوتے تھے، ان کا سب سے بڑا قبیلہ الحارث بن عبد مناف بن کنانہ تھا۔

(عمران مدینہ ص ۸۱)

ذنب نقمی نامی مقام پر فروکش ہو گئے، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اپنی پوزیشن سنبھال لی، تین ہزار فداکاروں کے ساتھ جبل سلع کی طرف پشت کر کے اپنے کیمپ قائم کر لئے،[1] مستورات کو مدینہ کے ارد گرد جو گڑھیاں تھیں ان میں منتقل کر دیا۔ حضرت عائشہ اور ان کے ساتھ چند خواتین کو بنی حارثہ کے گڑھی میں رکھا گیا، علاوہ ازیں آپ نے دوسرے انتظامات یہ کئے کہ مدینہ کی اندرونی حفاظت اور اس کی نگرانی کا انچارج حضرت ابن مکتوم کو بنایا۔ اور چونکہ مشرق میں بنو قریظہ کی طرف سے اندیشہ تھا اس لئے حضرت سلمۃ بن اسلم کو دو سو آدمیوں کے ساتھ متعین کیا کہ اس طرف کا دھیان رکھیں کہ حملہ نہ ہونے پائے، حضور کا معمول تھا کہ جنگ میں اپنا کیمپ ذرا بلند اور محفوظ مقام پر لشکر سے الگ رکھتے تھے تاکہ دشمن کی نقل و حرکت اور اسلامی لشکر کی حالت پر نظر رکھ سکیں، چنانچہ یہاں بھی آپ نے یہی کیا۔ جبل سلع کی پشت پر لشکر اسلام نے خیمہ افگن ہو کر اپنے مورچے سنبھال لئے تو اب حضور خود اپنا کیمپ جبل سلع کے اوپر ایک محفوظ تر مقام پر لے گئے، اسی کے قریب آپ کے چار سپہ سالاروں یعنی حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوبکر، حضرت عثمان اور حضرت ابوذر غفاری کے خیمے تھے بعد میں ان پانچوں خیموں کی یادگار میں مسجدیں بنا دی گئی تھیں جو "ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں" اب تک مساجد خمسہ کے نام سے مشہور ہیں اور پائی جاتی ہیں (ص ۷۳)

اب دونوں لشکر آمنے سامنے تھے، اُدھر دس ہزار کا لشکر جرار اور اس طرف صرف تین ہزار کی جمعیت، اور اس میں بھی جو منافقین آملے تھے وہ بہانہ بہانہ سے بھاگنے کی کوشش کرتے تھے، قرآن مجید کی سورۂ احزاب

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۱

میں اس کا ذکر ہے ارشاد ہوا:

يقولون ان بيوتنا عورة وما هي بعورة ، ان يريدون الا فرارا ٥

منافقین کہتے ہیں ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ ایسے نہیں ہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ بھاگ جانا چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت مسلمانوں کے لیئے انتہائی خطرناک، نازک اور تشویش انگیز تھا، قرآن مجید میں اس کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے:

اذ جاء وكم من فوقكم ومن اسفل منكم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون با الله الظنونا هنالك ابتلى المومنون وزلزلوا زلزالا شديدا ٥

(سورۂ احزاب)

اور اے مسلمانو! تم یاد کرو اس وقت کو جبکہ تمھارے دشمن (غطفان اور اور ان کے ساتھی قبائل) اوپر سے (یعنی بجانب مشرق وادی کے اوپر سے) اور قریش اور ان کے ساتھی قبائل بجانب مغرب) نیچے بطن وادی سے آپہونچے تھے اور اس وقت تمھاری نگاہیں خیرہ ہوگئی تھیں اور کلیجے منہ کو آلگے تھے اور تم اللہ کے بارہ میں طرح طرح کے خیالات کرنے لگے تھے، یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمانوں کو آزمائش میں ڈال دیا گیا اور انھیں سخت جھنجھوڑ دیا گیا تھا۔

اس وقت صرف ایک خندق تھی جو دونوں کے درمیان حائل تھی، ایک مرتبہ ابوسفیان گھوڑے پر سوار اپنی فوج کا جائزہ لیتے ہوئے ادھر آنکلا تو

خندق دیکھکر ٹھٹک کے رہ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے بولا: اخاہ! اب مقابلہ پر کیوں نہیں آتے، یہ خندق کا طریقہ کس سے سیکھا ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا: "یہ طریقہ میرے خدا نے مجھکو بتایا ہے" [۱] دشمن اِدھر اُدھر سے کہیں سے خندق پار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک تو خندق کی چوڑائی اور گہرائی اس سے مانع تھی اور پھر جو ادھر کا رخ کرتا تھا مسلمان تیر اندازوں کے تیر اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

اسی کشمکش میں ایک مرتبہ عرب کے چند نامی گرامی شہسواروں کا ایک دستہ جن میں عمرو بن عبد ودّ العامری، عکرمۃ بن ابی جہلؓ، ہبیرۃ بن ابی وہب اور ضرار بن الخطاب الفہری ایسے نامور ان قریش شامل تھے، ایک کسی قدر تنگ مقام سے خندق کو پار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس مقام پر حضرت علی تعینات تھے، انھوں نے یہ دیکھا تو چند ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھکر شہسواروں کو چیلنج کیا۔ عمرو بن عبد ودّ اس دستہ کا سردار تھا، اس نے غزوۂ بدر میں ایک زخم کاری کھایا تھا اور اسی وقت سے انتقام کی فکر میں تھا۔ حضرت علی نے اس سے کہا کہ دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرے، یا اسلام قبول کر یا مجھ سے نبرد آزما ہو، ابن عبد وُدّ نے جواب دیا: میں نہ اسلام قبول کر سکتا ہوں اور نہ تم سے جنگ کرنا مجھے پسند ہے، کیونکہ

---

[۱] ابن ہشام،

تمہارے والد سے میری صاحب سلامت تھی، اس رشتہ سے تم میرے بھتیجہ ہوتے ہو، حضرت علی تڑپ کے بولے: "مگر میں تو تم سے جنگ کرنا چاہتا ہوں" یہ فقرہ سمند ناز پر ایک تازیانہ تھا۔ ابن عبدوُد طیش میں آکر گھوڑے پر سے اتر آیا اور تلوار نیام سے نکال کر حضرت علی پر حملہ آور ہوا۔ حضرت علی نے وار روکا اور جھپٹ کر اس پر حملہ کیا مگر ابن عبدوُد پہلو بچا گیا، راوی کا بیان ہے کہ دونوں میں اسی طرح جنگ ہوتی رہی، یہاں تک کہ غبار بلند ہوا اور اندھیرا چھا گیا۔ دیکھنے والوں کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے! حافظ ابن عبد البر کے الفاظ ہیں: "فتنازلا و تجادلا و ثار النقع بینھما حتی حال دونھما" آخر جب غبار چھٹا تو لوگوں نے دیکھا کہ حضرت علی ابن عبدوُد کے سینہ پر سوار ہیں اور اس کا سر قلم کر رہے ہیں۔ ابن عبدوُد کے ہمراہیوں نے یہ منظر دیکھا تو ان پر ایسا سہم چڑھا کہ جس راستے سے آئے تھے اسی سے گھوڑے اڑاکر واپس ہوگئے۔[۱]

اس موقع پر کتب سیرت میں حضرت علی کے تین یا چار اشعار نقل کئے گئے ہیں جو آپ نے عمرو ابنِ عبدوُد کے قتل ہونے پر ازراہ فخر پڑھے، لیکن خود ابن ہشام نے ان کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اہل علم کے نزدیک ان اشعار کی نسبت حضرت علی کی طرف صحیح نہیں ہے۔[۲]

---

[۱] الدرر ص ۱۸۵

[۲] جلد ۳ ص ۲۳۶

بنو قریظہ کی استمالت قبائل نے دیکھا کہ محاصرہ طویل ہوتا جاتا ہے اور خندق کو پار کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اب انھوں نے بنو قریظہ کو اکسایا اور ورغلایا کہ وہ پیچھے سے یعنی مشرق کی طرف سے حملہ کر دیں، چنانچہ ابو سفیان نے عکرمہ بن ابی جہل کو قریش اور غطفان کے چند لوگوں کے ساتھ بنو قریظہ کے پاس بھیجا اور ان کو یہ پیغام دیا کہ اب ہمارے اونٹ اور گھوڑے ہلاک ہونا شروع ہو گئے ہیں، ہم زیادہ دنوں تک یہاں قیام نہیں کر سکتے تم لوگ کل صبح جنگ کے لئے آجاؤ تاکہ ہم سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اچانک دھاوا بول دیں[1] لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے ہی نگرانی کے لئے دو سو آدمیوں کا دستہ ان لوگوں کے رخ پر متعین کر رکھا تھا اس لئے بنو قریظہ کو ابوسفیان کے پیغام پر عمل کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

---

[1] البدایہ ص ۱۸۷

گزارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیے تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقع پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

(مینیجر)

حدیث کا درایتی معیار

(داخلی فہم حدیث)

(۶)

مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

شرک کی پیوندکاری سے رشتہ کی نورانی خاصیت سلب ہوجاتی ہے

یہ خالص نورانی رشتہ (تار) ہے جس میں شرک کی پیوندکاری اس کی خاصیت کو سلب کرلیتی اور اس کے اثرات زائل کردیتی ہے۔ جوہر انسانیت میں نورانی بنیاد کی وجہ سے مومن و مشرک میں حسن عمل کی صلاحیت ہوتی اور ہر ایک سے کم و بیش اس کا صدور ہوتا ہے۔ لیکن حسن عمل کو بارگاہ قبولیت تک پہونچانے والا وہ رشتہ و تعلق (نورانی تار) ہے جو ایمان باللہ کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اگر یہ رشتہ ہی شرک کی آمیزش سے خالی نہ رہا تو اس میں حسنِ عمل کو خالص کرنے کی صلاحیت کیوں کر پیدا ہوگی کہ جس کے بغیر قبولیت کی کوئی شکل نہیں؟

پھر اللہ کے ساتھ شرک دراصل اس ذہنی فیصلہ میں آمیزش ہے جو پوری قوت کے ساتھ ذہن میں راسخ ہوتا اور فکر و عمل کی ساری قوتوں پر حاوی ہوتا ہے جب اس فیصلہ میں شرک کی آمیزش ہوئی تو اس کے بعد جس قدر حسنِ عمل صادر ہوں گے ان میں نہ وہ خواص و اثرات پیدا ہوں گے جو ایمان باللہ کا خاصہ ہیں اور نہ نورانی دنیا سے ان کو مناسبت ہوگی کہ اثرات وہاں تک وسیع ہوں۔

روح اور عقل دونوں کی نورانی حقیقت پامال ہوتی ہے | دراصل عقیدہ و بنیاد میں آمیزش سے اللہ و بندہ کے درمیان جذب و انجذاب اور تاثیر و تاثر کی وہ قوت و کیفیت نہیں پیدا ہوتی جو ایمان باللہ سے مطلوب ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ کا اصلاً تعلق روح کی نورانی حقیقت سے ہے جس کی ترجمانی عقل کی نورانی حقیقت کرتی ہے۔

روح کی نورانی حقیقت

هی کوۃ من عالم القدس[1]		عالم قدس کی جانب ایک دریچہ ہے

عقل کی نورانی حقیقت کا ثمرہ

من اشرف ثمرۃ العقل معرفۃ اللہ[2]		عقل کا اشرف ثمرہ اللہ کی معرفت ہے۔

حسن عمل میں جس قدر نورانی خواص و اثرات پیدا ہوتے ہیں وہ اسی نورانی حقیقت کی راہ سے آتے ہیں۔ کفر اور شرک دونوں میں یہ راستہ حسن عمل میں نورانیت پہونچانے کے قابل نہیں رہتا۔ کفر میں وہ دروازہ ہی نہیں کھلتا جس سے یہ نورانیت داخل ہو اور شرک میں آمیزش و پیوند کاری کی وجہ سے نورانی صلاحیت ختم ہو جاتی۔ اسی بنا پر کفر و شرک کی عدم مغفرت اور ان کی وجہ سے کسی حسن عمل کی بارگاہ قبولیت تک نہ پہونچنے کی وعید ہے۔

کفر سے متعلق آیتیں اور حدیثیں | کفر سے متعلق قرآن حکیم میں ہے:

مثل الذین کفروا بربھم اعمالھم کرماد اشتدت بہ الریح فی یوم عاصف لا یقدرون مما کسبوا علی شیٔ[3]		ان کی مثال جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا ان کے اعمال کی مثال "راکھ" کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے اعمال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً حتی اذا جاءہ		جنھوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال سراب (ریت) کی طرح ہے جو میدان میں ہو

---

[1] ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ باب حقیقۃ الروح۔ [2] ... [3] ...

لم یجدہ شیئاً [۱] | جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہونچے تو وہاں کچھ نہ پائے

حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

قلت یارسول اللہ ابن جدعان کان فی الجاھلیۃ یصل الرحم ویطعم المسکین فھل ذاک نافعہ | میں نے رسول اللہ سے سوال کیا کہ ابن جدعان جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا اور مسکین کو کھانا کھلاتا تھا کیا یہ چیزیں اس کو نفع دیں گی؟

رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا ینفعہ انہ لم یقل یوماً رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین [۲] | اس کو نفع نہ دیں گی کیونکہ کسی دن اس نے نہیں کہا اے میرے رب قیامت کے دن میرے گناہوں کو بخش دے۔

شرک سے متعلق آیتیں اور حدیثیں | شرک سے متعلق قرآن حکیم میں ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء [۳] | بیشک اللہ یہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے ماسوا جس کو چاہے بخشتا ہے۔

بقیہ حاشیہ ص۱۷ [۲] راغب اصفہانی۔ الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ [۳] ابراہیم ع ۳

حاشیہ صفحہ ہذا

[۱] نور ع

[۲] مسلم باب الدلیل علی ان من مات علی الکفر لا ینفعہ عمل

[۳] النساء ع ۱۸

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم اولئك لهم الامن وهم مهتدون[1]

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ایمان کے ساتھ ظلم (شرک) کی آمیزش نہیں کی انہیں لوگوں کے لئے امن و اطمینان ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

"ظلم" سے مراد اس جگہ شرک ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے:

ان الشرك لظلم عظیم[2]

یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال کے ذریعہ شرک کو اس طرح قریب الفہم بنایا۔

ان من اشرك باللہ کمثل رجل اشتری عبداً من خالص ماله بذهب او ورق فقال هذه داری وهذا عملی فاعمل وادِّ الی فکان یعمل ویؤدی الی غیر سیدہ فایکم یرضی ان یکون عبدہ کذلك[3]

اس شخص کی مثال جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا ایسی ہے جیسے کسی نے اپنے خالص مال [illegible] سے غلام خریدا اور اس کو بتادیا کہ یہ میرا گھر [illegible] یہ میرا کام ہے۔ کام کرو اور اس کا نفع مجھے پہونچاؤ غلام کام تو کرتا ہے لیکن نفع اپنے آقا کے علاوہ کسی اور کو پہونچاتا ہے تم میں سے کون ایسے غلام کو پسند کر سکتا ہے؟ (اللہ کو نفع پہونچانے کا کوئی سوال نہیں یہ محض سمجھانے کے لئے ہے)

شرک کی وجہ سے رشتہ کی نورانی خاصیت سلب ہوجانے کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے:

ان اللہ تعالی لیغفر لعبدہ مالم یقع

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی بخشش اس وقت تک کرتا

---

[1] الانعام ع ۹   [2] لقمان ع ۲

[3] ترمذی ابواب الامثال باب ما جاء مثل الصلوٰۃ والصیام والصدقۃ

الحجاب قالوا یارسول اللہ وما الحجاب قال ان تموت نفس وھی مشرکۃ[1]

ہے جب تک حجاب نہ واقع ہو۔ صحابہ کرام نے سوال کیا کہ حجاب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا شرک کی حالت میں کسی کی موت ہو جائے۔

رسول اللہ سے سوال کیا گیا:

ای الذنب اعظم عند اللہ

کونسا گناہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے۔

آپ نے فرمایا:

ان تجعل للہ ندًا وھو خلقک[2]

اللہ کا مقابل تو کسی کو ٹھہرائے حالانکہ اس نے تجھکو پیدا کیا۔

شرک کی بہت سی قسمیں قرآن میں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معنویت حاصل کر کے مزید تفصیل بیان فرمائی اور ان راہوں کی نشاندہی کی جن سے شرک داخل ہو کر عقیدہ و بنیاد میں فساد پیدا کرتا اور رشتہ کی نورانی خاصیت سلب کرتا ہے۔

شرک خفی کا تعلق فسادِ نیت سے ہے

بعض حدیثوں میں ایک اور شرک کا ذکر ملتا ہے جس کا نام شرک خفی یا معنوی شرک ہے۔ اس میں حسنِ عمل سے اللہ کی رضا و خوشنودی نہیں مقصود ہوتی بلکہ ریا و نمود طلب شہرت و جاہ اور غیر کی محبت و عداوت مقصود ہوتی ہے اس کی بنیاد قرآن حکیم کی یہ آیت ہے:

افرأیت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ[3]

کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ باب الاستغفار والتوبۃ

[2] مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی ان من مات لا یشرک بہ شیئًا الخ

[3] جاثیہ ع ۳

یہ شرک فساد عقیدہ سے نہیں بلکہ فساد نیت سے پیدا ہوتا اور اسی عمل کو باطل کرتا جس میں یہ شرک پایا جاتا ہے۔ فساد نیت نورانی رشتہ کے قیام میں مانع نہیں ہے جبکہ فساد عقیدہ نورانی رشتہ کے قیام میں مانع ہے۔ خاکی و مادی اثرات کے غلبہ کی وجہ سے طرح طرح کی مادی خواہشات جنم لیتی ہیں جن کی بحیثیت مجموعی دو بڑی قسمیں ہیں:

(۱) خواہش لذت و شہوت اور (۲) خواہش جاہ و ریاست

خواہشات (جس قسم کی بھی ہوں) کی تکمیل میں چونکہ رضاء الٰہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور دوسری چیزیں مقصود بن جاتی ہیں اس لئے مذکورہ آیت میں خواہش کو معبود بنانے سے تعبیر کیا گیا۔ اور رسول اللہؐ نے اس کو قریب الفہم بنانے کے لئے شرک اصغر یا شرک خفی کا نام دیا جیسا کہ ان کی تعریف سے ظاہر ہے۔

شرک خفی سے متعلق حدیثیں رسول اللہؐ نے فرمایا

الشرك الخفى ان يعمل الرجل لمكان الرجل[1]	شرک خفی یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی وجہ سے کرے
ان اخوف ما اخاف على امتى الشرك الاصغر قالوا وما الشرك الاصغر يا رسول الله قال الرياء يقول الله عز وجل لهم يوم القيمة اذا جزى الناس باعمالهم اذهبوا الى الذين كنتم تراؤون فى الدنيا فانظروا هل تجدون عندهم جزاء[2]	مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے۔ صحابہ نے سوال کیا شرک اصغر کیا ہے — فرمایا "ریا" قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا اللہ ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے ان کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کے لئے یہ کام کرتے تھے دیکھو کہ ان کے پاس بدلہ دینے کے لئے کچھ ہے؟

---

[1] مستدرک حاکم ج ۴ کتاب الرقاق [2] مسند ابن حنبل ج ۵ حدیث محمود بن لبید

خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نتذاکر المسیح الدجال فقال الا اخبرکم بما هو اخوف علیکم عندی من المسیح الدجال قال قلنا بلی فقال الشرک الخفی ان یقوم الرجل یصلی فیزین صلوته لما یری من نظر رجل له

ایک مرتبہ ہم لوگ دجال سے متعلق باتیں کر رہے تھے رسول اللہ تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے نزدیک دجال سے بڑھکر جو خوفناک ہے کیا میں تم کو اس کی خبر نہ دوں ہم سب نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ فرمایا وہ شرک خفی ہے کہ (مثلاً) کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔

اتخوف علی امتی الشرک والشهوة الخفیة قال قلت یا رسول اللہ اتشرک امتك من بعدك قال نعم اما انهم لا یعبدون شمسا ولا قمرا ولا حجرا ولا وثنا ولکن یراؤون باعمالهم والشهوة الخفیة ان یصبح احدهم صائما فتعرض له شهوة فیترك صومه

مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک اور چھپی ہوئی شہوت ہے میں نے (راوی) کہا یارسول اللہ کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک کرنے لگے گی؟ آپ نے فرمایا "ہاں" وہ سورج چاند پتھر اور بت کی پرستش نہ کرے گی لیکن اعمال دکھانے کے لئے کرے گی۔ چھپی ہوئی شہوت یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص صبح کے وقت روزہ دار ہوگا پھر اس کو شہوت نفس کا تقاضا ہوگا اور روزہ توڑ دے گا۔

من صلی وهو یرائی فقد اشرك ومن

جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک

---

[1] مشکوۃ باب الریاء والسمعۃ

[2] مسند ابن حنبل ج ۴ حدیث شداد بن اوس

صام وھو یرائی فقد اشرک ومن تصدق وھو یرائی فقد اشرک [1]

کیا جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔

یہ اور اس قسم کی جتنی روایتیں ہیں وہ سب فسادِ نیت سے متعلق ہیں نہ کہ فسادِ عقیدہ سے۔ شرک کا اطلاق ان پر مجازاً ہے نہ کہ حقیقۃً۔

نفاق سے محبت کی حس کند ہو جاتی اور کشش مضمحل ہو جاتی ہے

اس رشتہ کی طرف کشش فطری اور اس کی محبت ذاتی ہے جس طرح مقناطیس کی طرف لوہے کی کشش ہوتی ہے اسی طرح فطرت کی کشش اس رشتہ کی طرف ہے لیکن لیا اوقات خاکی و مادّی اثرات کے غلبہ کی وجہ سے قلب میں ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے جس کا اصطلاحی نام "نفاق" ہے اس کی وجہ سے محبت کی حس کند ہو جاتی اور فطرت کی کشش مضمحل ہو جاتی ہے۔ جس طرح مخدرات (سست کرنے والی چیزیں) کے استعمال سے اعضاء کی حس ماؤف ہو جاتی اور گرمی و سردی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح نفاق سے اس رشتہ کی حس نورانیت ماؤف ہو جاتی اور محبت کی کشش باقی نہیں رہتی۔

نفاق کا تعلق قلب سے ہے

"نفاق" کا اصل تعلق قلب سے ہے جس کے بارے میں ہے:

مثل نورہ فی قلب المومن کمشکوۃ فیھا مصباح [2]

قلب مومن میں اللہ کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کہ طاق میں چراغ رکھا ہو۔

لیکن قلب چونکہ روح کا محافظ ہے اس لئے روح و عقل دونوں کی نورانی حقیقت نفاق سے متاثر ہوتی اور بعض صورتوں میں بالکلیہ ختم ہو جاتی ہے۔

نفاق سے متعلق آیتیں

قرآن حکیم میں ہے:

---

[1] مستدرک حاکم ج ۴ کتاب الرقاق

[2] شیخ احمد سرہندی مکتوبات مجدد ص ۱۱۴

كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون[1] — ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر اعمال کی وجہ سے زنگ لگ گیا ہے۔

ونطبع على قلوبهم فهم لا يسمعون[2] — ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں پھر وہ نہیں سنتے ہیں۔

امام غزالی نے "رین" اور طبع کی یہ تفسیر کی ہے۔

واما الآثار المذمومة فانها مثل دخان مظلم يتصاعد الى مرآة القلب ولا يزال يتراكم عليه مرة بعد اخرى الى ان يسود ويظلم ويصير بالكلية محجوبا عن الله تعالى وهو الطبع الرين[3] — آثار مذمومہ مثل تاریک دھواں کے ہیں جو آئینہ دل کی طرف چڑھتے اور تہ بہ جمتے ہیں یہاں تک کہ آئینہ دل تاریک ہو کر اللہ تعالیٰ سے بالکلیہ محجوب ہو جاتا ہے اسی کو قرآن حکیم نے رین اور طبع سے تعبیر کیا ہے۔

نفاق سے متعلق حدیثیں "نفاق" پوشیدہ بیماری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی آیتوں سے معنویت حاصل کر کے اس کی علامتیں بیان فرمائیں اور شاخوں کی نشاندہی کی مثلاً

تجد من شر الناس يوم القيمة ذا الوجهين الذي يأتي هولاء بوجه وهؤلاء بوجه[4] — قیامت کے دن بدترین شخص اس کو پاؤ گے جو دورخا ہو ان کے پاس آئے تو ان کی سی باتیں کرے اور ان کے پاس جائے تو ان کی سی باتیں کرے۔

---

[1] تطفیف ع ۱ [2] اعراف ع ۱۲

[3] امام غزالی۔ احیاء علوم الدین بیان جامع اوصاف القلب

[4] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم

من مات ولم يغزو ولم يحدث به نفسه مات على شعبة من النفاق[1]

جو شخص مرگیا اور اس نے اللہ کی راہ میں نہ کبھی جنگ کی اور نہ کبھی دل میں اس کا خیال گذرا تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔

ان المنافق اذا مرض ثم عوفي كان كالبعير عقله اهله ثم ارسلوه فلم يدر لم عقلوه ولم ارسلوه[2]

منافق جب بیمار ہو کر تندرست ہو جاتا ہے تو اس کی مثال اونٹ کی ہوتی ہے جس کو اس کے مالک نے باندھا اور پھر کھولدیا مگر وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ کیوں اس کو باندھا گیا اور پھر کھولدیا گیا۔

آية المنافق ثلث اذا حدث كذب واذا وعد اخلف واذا ائتمن خان[3]

منافق کی تین علامتیں ہیں (۱) جب وہ بات کرتا تو جھوٹ بولتا (۲) جب وعدہ کرتا تو اس کے خلاف کرتا اور (۳) جب امانت رکھی جاتی تو خیانت کرتا ہے۔

اربع من كن فيه كان منافقا خالصا ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها اذا ائتمن خان واذا حدث كذب واذا عاهد غدر واذا خاصم فجر[4]

جس میں چار خصلتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں کوئی ایک ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت پائی جائے گی یہاں تک کہ اسکو چھوڑ دے وہ یہ ہیں (۱) جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۳) جب عہد کرے تو بیوفائی کرے (۴) اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

---

[1] مسلم و مشکوۃ کتاب الجہاد [2] ابو داؤد و مشکوۃ باب عیادۃ المریض و ثواب المرض۔
[3، 4] بخاری کتاب الایمان باب علامۃ المنافق

خصلتان لا یجتمعان فی منافق حسن سمت ولا فقہ فی الدین[1]

دو خصلتیں منافق میں نہیں جمع ہوتی ہیں (۱) اچھی عادت اور (۲) دین کی سمجھ

تلک صلوۃ المنافق یجلس یرقب الشمس حتی اذا اصفرت وکانت بین قرنی الشیطان نقر اربعا لا یذکر اللہ فیہا الا قلیلا[2]

یہ منافق کی نماز ہے کہ وہ آفتاب کو دیکھتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ زرد ہوکر شیطان کی دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو کھڑے ہوکر چار چونچیں مار لیتا ہے اور اس میں اللہ کی یاد بہت کم ہوتی ہے۔

نفاق کا اعلیٰ درجہ کفر سے بدتر ہے

نفاق کے بے شمار درجے اور مرتبے ہیں لیکن بدترین درجہ عقیدہ میں نفاق کا ہے جو کفر و شرک سے بھی بدتر ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر وما ہم بمومنین یخدعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضا ولہم عذاب الیم بما کانوا یکذبون[3]

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں یہ لوگ اللہ اور مومنوں کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ وہ صرف اپنے کو دھوکا دے رہے ہیں اور نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔

کفر اور شرک کی وجہ سے نورانی صلاحیتیں اتنی زیادہ بیکار نہیں ہوتیں جتنی نفاق کے اس درجہ میں ہوتی ہیں اور شر و فساد کا مظاہرہ اس قدر نہیں ہوتا جس قدر اس میں ہوتا ہے اسی

---

[1] ترمذی ومشکوٰۃ کتاب العلم [2] مسلم کتاب الصلوۃ باب استحباب التبکیر بالعصر
[3] البقرہ ع ۲

بنا پر قرآن حکیم میں ہے:

ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار[۱] — بیشک منافقین آگ کے نچلے درجہ میں ہوں گے۔

اس درجہ کے منافقین کا پتہ لگانا بیحد مشکل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعور نبوت کے ذریعہ ان کی نشاندہی کی اور بعض کے نام بھی بتائے اور بعض کے لئے فرمایا:

لا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط[۲] — وہ جنت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو۔

نفاق کا ادنیٰ درجہ فسق کے مساوی ہے

نفاق کا ادنیٰ درجہ ظاہری اعمال کے اعتبار سے فسق کے مساوی ہے جس کی بنار پر قرآن حکیم میں ہے:

ان المنافقین ہم الفاسقون[۳] — بیشک منافقین ہی فاسق ہیں۔

حضرت حذیفہؓ سے ایک اعرابی نے سوال کیا:

فما بال ہؤلاء الذین ینقبون بیوتنا ویسرقون اعلاقنا[۴] — ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ہمارے گھروں میں نقب زنی کرتے اور ہمارے نفیس مال کی چوری کرتے ہیں۔

جواب میں فرمایا:

اولئك الفساق[۴] — یہ لوگ فاسق ہیں۔

فسق کا تعلق نفس امارہ سے ہے

فسق کا اصل تعلق نفس امارہ سے ہے جس پر شیطان کا عمل دخل ہوتا ہے۔

واما النفس الامارة فجعل الشیطان قرینها[۱] — نفس امارہ کا ہمنشین شیطان کو بنایا گیا ہے۔

---

۱ النساء ع ۲۱

۲ مسلم کتاب صفات المنافقین

۳ التوبہ ع ۸

۴ بخاری کتاب التفسیر سورۂ توبہ

لیکن بعض صورتوں میں دونوں کے اعمال کا مظاہرہ یکساں ہوتا اور یہ پتہ لگانا دشوار ہوتا ہے کہ اس کا تعلق قلب کی بیماری سے ہے یا نفس امارہ سے ہے اس لئے نفاق کی تعبیر فسق سے کردی جاتی ہے۔ نفاق سے جو عمل سرزد ہوتے ہیں ہماری زبان میں ان کی تعبیر فساد باطن اور "فسق" سے جو ہوتے ہیں ان کی تعبیر فساد ظاہر سے زیادہ سمجھ میں آنے والی ہے۔

نفاق کے اسباب شاہ ولی اللہ نے نفاق عملی و نفاق اخلاقی کی جو تشریح کی ہے اس سے اسباب نفاق پر روشنی پڑتی ہے مثلاً

(۱) ایمان کا ضعف یعنی قوت و مضبوطی کے ساتھ ایمان ذہن میں قرار نہ پکڑے۔

(۲) رسالت کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اگرچہ بالکلیہ انکار کے درجہ تک نہ پہونچیں۔

(۳) قلب پر دنیائے دنی کی لذت و ہوس کا شدید غلبہ کہ اس میں اللہ و رسولؐ کی محبت کے لئے جگہ نہ رہ جائے۔

(۴) قلب پر حرص، حسد کینہ وغیرہ کا حملہ کہ مناجات کی حلاوت اور عبادات کی برکات ختم ہوجائیں۔

(۵) دنیوی امور کی طرف اتنی زیادہ مشغولیت کہ اخروی امور کی طرف اہتمام کی فرصت نہ رہے

(۶) خاندان و قبیلہ اور اعزا و اقربار کی محبت کا غلبہ کہ احکام خداوندی کی پرواہ نہ رہے۔[1]

اصل سبب اصل سبب پہلا ہے اور بقیہ اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ نفاق میں جس درجہ کا ضعف ہوتا ہے فسق میں اس درجہ کا نہیں ہوتا کبھی فسق ترقی کرکے نفاق کے درجہ تک پہونچتا ہے جس طرح نفاق کا ادنیٰ درجہ فسق کے مساوی ہوتا ہے اس طرح ہر منافق فاسق ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر فاسق منافق بھی ہو

باقی

---

[1] ابن قیم۔ کتاب الروح

فنِ اصولِ تفسیر ــــــــــ ایک جائزہ

(از جناب مولوی عتیق احمد صاحب قاسمی)

قرآنِ پاک ایک دائمی پیغامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے، اُمتِ مسلمہ خصوصاً علمائے امت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پیش آمدہ نت نئے مسائل و مشکلات کا حل قرآن کو سامنے رکھ کر تلاش کریں، اور ان مواقع کے لئے قرآن نے جس معجزانہ انداز میں رہنمائی کی ہے اس کو اُجاگر کریں۔

حضرت ایاس بن معاویہؒ ان الفاظ میں تفسیر قرآن کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

مَثَلُ الذین یقرؤن القرآن وھم لا یعلمون تفسیرہ کمثل قوم جاءھم کتاب من ملکھم لیلا ولیس عندھم مصباح فدخلتھم روعۃ لا یدرون ما فی الکتاب ومثل الذی یعرف التفسیر کمثل رجال جاءھم المصباح وقرأو ما فی الکتاب	جو لوگ بغیر تفسیر جانے قرآن پڑھتے ہیں ان کی حالت اس قوم کی سی ہے جس کے پاس رات کے وقت اس کے بادشاہ کا فرمان آیا ہو مگر ان لوگوں کے پاس چراغ نہیں ہے جس کے نتیجے میں ان کے اندر خوف سمایا ہوا ہو کہ پتہ نہیں اس میں کیا لکھا ہوا ہے، اور جو لوگ تفسیر کو جان کر قرآن کو پڑھتے ہیں ان کی حالت ان لوگوں کی طرح ہے جن کے پاس چراغ آگیا ہو اور انھوں نے فرمان کے مضمون کو پڑھ لیا ہو۔

مقدمتان فی علوم القرآن ص ۲۶۲

تفسیر بالرای | بلا شبہ ایک دور وہ تھا جس میں قرآن کے بارے میں چند الفاظ کہہ دینے پر بھی ایک

طبقہ تفسیر بالرای کا حکم لگایا کرتا تھا، لیکن ہمارے قدیم علما اور مفسرین نے تفسیر بالرای کی حقیقت کو واضح کر کے اس الزام کی قلعی کھول دی ہے، چنانچہ تفسیر بالرای کے حدود کی تعیین ابن تیمیہ غزالی، بدرالدین زرکشی، نے اور سیوطی نے واضح طور پر کی ہے[1]۔

اصولِ تفسیر کی ضرورت | تفسیر میں حدود کی رعایت نہ رکھی جائے تو دوسرے فتنوں کے ابھرنے کا موقع فراہم ہو سکتا ہے۔

چنانچہ شروع سے لے کر اب تک جو تفسیریں منظرِ عام پر آئی ہیں اور قرآن کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے ہمارے مفسرین نے جو انداز اختیار کیا ہے اس میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن بایں ہمہ کچھ لوگوں نے ایسی بھی تفسیریں کی ہیں جن کو ہم تحریف کا نام دے سکتے ہیں اگرچہ ان مفسرین کی نیتیں تحریف کی نہ رہی ہوں بلکہ اس کی جگہ ان کے دلوں میں اسلام اور قرآن کے لئے بے انتہا خیر خواہی کا جذبہ رہا ہوں۔

جب قرآن کا طالب علم مختلف تفاسیر کا مطالعہ کرتا ہے تو ہر ہر آیت کے ماتحت دسیوں اقوال اور متعارض تشریحات دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور انتخاب و تطبیق میں اس کی قوت فیصلہ جواب دے جاتی ہے، کیوں کہ اس کے پاس اصول و قواعد نہیں ہیں جن کی روشنی میں وہ ترجیح و تطبیق کا کام کر سکے، ان مختلف اقوال سے گھبرا کر بعض ناپختہ ذہن اشخاص نفس تفسیر سے ہی بدظن ہو جاتے ہیں۔

تفسیر اور روایات ضعیفہ | کوئی بھی منصف مزاج اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ بہت سی کتب تفسیر میں عموماً صحیح و سقیم، ضعیف و قوی، ہر طرح کی روایات پائی جاتی ہیں، کیوں کہ تفسیری روایات میں تنقیح و تحقیق کا کام نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ قدیم دور سے یہ شکوہ چلا آرہا ہے، چنانچہ امام احمدؒ بن حنبل اپنے زمانہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔ (ثلاثۃ لیس لہا اصل التفسیر والملاحم والمغازی)

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۳۲، احیاء العلوم جلد ۱ صفحہ ۲۹۱ تا صفحہ ۲۹۴، البرہان فی علوم القرآن ج ۲ النوع الحادی والاربعون معرفۃ تفسیرہ وتاویلہ تعالیٰ فی علوم القرآن النوع الحادی والاربعون ۱۲۔

اسی طرح امام مسلمؒ نے مقدمہ مسلم میں ایک روایت نقل کی ہے، اس سے بھی مذکورہ بالا بات کی تائید ہوتی ہے، روایت کا حاصل یہ ہے کہ ایاسؒ بن معاویہ نے سفیان بن حسین سے فرمایا کہ آپ تفسیر سے کافی شغف رکھتے ہیں، آپ کسی سورت کی تلاوت کر کے اس کی تفسیر بیان فرمائیں تاکہ میں آپ کی معلومات کا جائزہ لوں، چنانچہ حضرت سفیان نے حسب فرمائش تلاوت کر کے تفسیر بیان کی۔

حضرت ایاسؒ نے غور سے سننے کے بعد نصیحت فرمائی (ایاک والشناعة فی الحدیث)

اس نصیحت کے بارے میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ رقمطراز ہیں۔

قلت ولعل ایاس بن معاویة اوصاہ خاصة بھٰذہ النصیحة النافعة لانہ کان مولعا بتفسیر القرآن العظیم والمشتغلون بالتفسیر کثیر اما یتساھلون فی امر الروایة والنقل فنبھه علی التجنب عن ھٰذہ البلیة العظمیٰ وھٰذا من دلائل فطنة ایاس المشھورة۔

شاید ایاسؒ بن معاویہ نے انھیں خاص طور پر یہ مفید نصیحت اس لئے کی کہ ان کو تفسیر کے ساتھ شغف تھا اور مفسرین بسا اوقات روایات اور نقل کے معاملے میں تساہل سے کام لیتے ہیں، تو انھوں نے اس عام ابتلاء سے بچنے کی تنبیہ کی۔

یہ نصیحت بھی حضرت ایاس کے شہرۂ آفاق ذکاوت کی ایک دلیل ہے۔

فتح الملہم ص ۱۲۶/۱

تفسیر میں ضعیف و موضوع روایات کے رواج کے اسباب

سوال یہ ہے کہ تفسیر میں ضعیف روایتیں کیسے داخل ہوئیں؟ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ متقدمین نے ضیاع سے بچانے کے لئے تمام آثار و اقوال کو جمع کرلیا اور تحقیق و تنقیح کا کام آئندہ کی نسلوں پر چھوڑ دیا، لیکن بعد والوں کی کوتاہی ہے کہ اب تک یہ کام تشنۂ تکمیل رہا۔

ابن خلدون اپنے انداز میں اسباب کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں

"اہل عرب چونکہ ان پڑھ تھے، لہٰذا جب ان کو اسرار کائنات، آفرینش عالم، اور گذشتہ واقعات وغیرہ کی معلومات کا شوق ہوا تو انھوں نے ان چیزوں کے متعلق اہل کتاب۔

خصوصاً یہود مدینہ سے دریافت کیا، لیکن یہود مدینہ کی معلومات تورات وغیرہ کے بارے میں ثانوی درجے کی تھیں لہٰذا انھوں نے افسانوی انداز کے قصے سنائے اور اہل عرب نے فارط اشتیاق میں اسے نقل کردیا، بعد کے مفسرین نے تساہل سے کام لیا اور تحقیق کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ۔ مقدمہ ابن خلدون عربی ص ۲۲۳ مطبعہ خیریہ اولی

مناہل العرفان کے مصنف نے تفسیری روایات کے ضعف کا تجزیہ کرتے ہوئے پانچ اسباب بیان کئے ہیں۔

" (۱) وہ روایتیں جن کو بددین اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے والوں نے گھڑ کر رائج کرنے کی سعی کی۔

(۲) وہ روایتیں جن کو باطل فرقوں نے اپنے عقائد کی تائید کے لئے اختراع کیا۔

(۳) وہ روایتیں جن کو بعض مفسرین نے بلا جانچ پڑتال درج کردیا۔

(۴) بے بنیاد اسرائیلی روایتیں جو ذخیرۂ تفسیر میں آگئیں۔

(۵) صحیح اسرائیلی روایات کیوں کہ فرمانِ نبوی " لا تصدق اھل الکتاب ولا تکذب " کی بناپر یہ روایتیں بھی قابل حجت نہیں رہیں "۔ مناہل العرفان ص ۴۹۱-۴۹۲ الطبعۃ ثالثۃ

غلط فہمی کا ازالہ | اصولِ تفسیر کے مدون نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحابۂ کرام اور قدیم مفسرین رحمہم اللہ کے یہاں تفسیر قرآن کے کچھ اصول ہی نہیں تھے، بلکہ ان کی تفاسیر سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ حضرات مفسرین کے یہاں بھی چند جنچے تلے اصول تھے جن کی وہ پابندی کرتے تھے لیکن باضابطہ قواعد و اصول مدون نہ ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ بہت سے تفسیر لکھنے والوں کے یہاں بعض اہم اصول نظر انداز ہوجاتے تھے۔

اصولِ تفسیر کا دائرۂ بحث | ہر فن میں کچھ مخصوص اصطلاحات ہوا کرتی ہیں، ان اصطلاحات سے واقفیت کے بغیر اصحابِ فن کا کلام سمجھنا اور مختلف اقوال میں تطبیق دینا مشکل ہوتا ہے، قدیم مفسرین کے یہاں بھی کچھ اصطلاحات تھیں جن سے ناواقف ہونے کی بناء پر بسا اوقات ان کے کلام میں تعارض

معلوم ہوتا ہے، ان اصطلاحات کی وضاحت اور ان میں تدریجی تبدیلیوں کی نشاندہی اس فن کا اہم جزء ہے، جس طرح کہ اصول حدیث کا ایک بڑا حصہ محدثین کی اصطلاحات کی تشریحات سے پر ہے۔

اصولِ تفسیر کا ایک لازمی جزیہ ہے کہ علومِ قرآنی پر اصولی انداز سے بحث کی جائے اور تفصیلات وجزئیات سے اعراض کیا جائے، مثلاً اسباب نزول پر اس انداز پر کلام کیا جائے کہ تفسیر میں اسباب نزول کی کیا اہمیت ہے؟ آیا آیات کا مصداق صرف موقع اور موردِ نزول ہی ہے یا الفاظ میں تعمیم دیکھ کر اس میں توسیع کی گنجائش ہے؟ اور اسبابِ نزول کے پیشِ نظر ہم آیات کو کس حد تک مقید کر سکتے ہیں؟

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فیض الباری میں فرماتے ہیں

ان القرآن قد یکون له معنی بالنظر الی سیاقه فاذا نظر الی شان نزوله یظهر له معنیٰ آخر	قرآن کا کبھی اس کے سیاق کے اعتبار سے ایک معنی ہوتا ہے اور جب اس کے شانِ نزول پر نظر ڈالی جاتی ہے تو دوسرا معنی معلوم ہوتا ہے

فیض الباری ص ۳۶ ج ۱

منشا یہ ہے کہ اصولی مسائل زیرِ بحث لائے جائیں، رہیں تفصیلات مثلاً اسباب نزول کا احاطہ، ہر ہر آیت کے مکانِ نزول کی تعیین تو اس کے لئے اسبابِ نزول ایک مستقل فن ہے اس کی بحث وہاں ہونی چاہیئے۔

اسبابِ نزول کی طرح غریب القرآن بھی ایک عظیم الشان فن ہے، اس پر گفتگو کا انداز یہ ہو کہ قرآن کے لغات کو حل کرنے میں احادیث کا کتنا دخل ہے اور ادبِ جاہلیت کا کس قدر؟ اگر ادبِ جاہلیت سے ایک معنی معلوم ہوتا ہو، لیکن حدیث دوسرے معنی کی نشاندہی کر رہی ہو تو اس وقت کیا صورت اختیار کی جائے؟

باقی رہا غریب القرآن سے متعلق تمام احادیث وآثار کا جمع کرنا یا قرآن کے غرائب کو اشعار

جاہلیت کی روشنی میں حل کرنا تو یہ کام فن غریب القرآن کے سپرد کر دیا جاتے۔

ایسے ہی ناسخ و منسوخ کے بارے میں اصول کلام ہو، مثلاً قرآن کا نسخ کن ادلہ سے ہو سکتا ہے؟ نسخ کے کیا معنی ہیں؟ ناسخ و منسوخ میں کیا کیا شرطیں ہونی چاہئیں؟ نسخ کے بعد آیاتِ منسوخہ کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

مختلف مکاتبِ فکر | جس طرح دیگر فنون میں اصحابِ فن کے درمیان فکر و نظر کا اختلاف کوئی عجیب بات نہیں ہے، اسی طرح اصولِ تفسیر کو مدون کرتے وقت بہت سے مسائل میں مختلف مکاتبِ فکر کی مختلف رائیں ہو سکتی ہیں، کیونکہ اختلافِ رائے فطرت کی دین ہے اور اپنے حدود میں رہ کر یہ باعثِ رحمت بھی ہے۔

چنانچہ قرآن و حدیث کی باہمی نسبت کے بارے میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں۔

ان الشافعیۃ جعلوا القرآن کالمتن	شوافع نے قرآن کو متن اور حدیث کو شرح قرار
والحدیث کالشرح فاخذوا المراد	دے کر دونوں کے مجموعہ سے مراد کو متعین کیا۔
من المجموع ونحن اخذنا بالقرآن	اور ہم (احناف) نے قرآن کو پہلے درجہ پہلا
اولاً ثم اجبنا العمل بالحدیث ثانیا	پھر دوسرے نمبر پر حدیث پر عمل کو واجب کیا
فوضعنا ھذا فی مرتبتہ	تو ہم نے حدیث کو اس کے مرتبے میں رکھا۔

فیض الباری ص ۲۳۵ ج ۱، ۲۳۶ ج ۱

حاصل یہ ہے کہ اختلاف اصول تفسیر کے اندر بھی ہے اور اسی کے ساتھ بہت سے مسائل میں شدید علمی معرکے بھی، مگر یہ نقطہائے نظر اسی وقت تک قابلِ قبول ہیں جب تک قرآن وحدیث سے باہر نہ ہوں۔

چنانچہ تفسیر میں ایک جماعت کا جھکاؤ روایات کی طرف ہے، دوسرے گروہ کا میلان ادب عربی کی طرف، یہ میلانات کوئی غیر معقول چیز نہیں ہیں بشرطیکہ دوسرے پہلوؤں کو نظرانداز نہ کیا جائے اور تصویر کے دونوں رُخ سامنے رکھے جائیں

اصولِ تفسیر کا موجودہ سرمایہ: اصولِ تفسیر کے موضوع پر تحقیق و تفتیش کے بعد متعدد کتابیں سامنے آتی ہیں لیکن ان میں بنیادی اہمیت چند ہی کتابوں کو حاصل ہے۔

(۱) پہلی کتاب تقی الدین ابن تیمیہؒ کی "مقدمۃ فی اصول التفسیر" کے نام سے ملتی ہے جس میں بعض اہم مسائل پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ کلام کیا گیا ہے مثلاً مفسرین کے تفسیری اختلافات کو دور کرنے کے اصول و قواعد، یہ اپنی جگہ اچھی بحث ہے۔

لیکن بہت سے دوسرے مسائل کو اس میں سرے سے نہیں چھیڑا گیا ہے، کیوں کہ ان کے پیشِ نظر تمام اصول و قواعد کو جمع کرنا نہیں تھا، چنانچہ وہ خود آغازِ کتاب میں رقمطراز ہیں

اما بعد فقد سألنی بعض الاخوان ان اکتب له مقدمة تتضمن قواعد کلیة تعین علی فهم القرآن ومعرفة تفسیره ومعانیه والتمییز فی منقول ذلك ومعقوله بین الحق وانواع الاباطیل والتنبیه علی الدلیل الفاصل بین الاقاویل فان الکتب المصنفة فی التفسیر مشحونة بالغث والسمین والباطل الواضح والحق المبین

مجھ سے میرے بعض دوستوں نے ایک ایسا مقدمہ لکھنے کی درخواست کی جو ان قواعدِ کلیہ پر مشتمل ہو جو فہمِ قرآن اور اس کے تفسیر و مطالب کی واقفیت پر تعاون کرے، نیز تفسیر کے معقول و منقول میں صحیح اور غلط باتوں کے درمیان امتیاز کرنے میں تعاون کرے، اور مختلف تفسیری اقوال میں فیصلہ کن دلیل پر آگاہ کرے کیوں کہ تفسیر میں تصنیف شدہ کتابیں ہر طرح کی باتوں سے پر ہیں۔

(مقدمۃ فی اصول التفسیر ص۱)

اس کے علاوہ بھی ابن تیمیہ نے اپنے دیگر رسالوں میں بعض اہم قواعدِ تفسیر کی نشاندہی کی ہے، لہٰذا ہم انھیں اصولِ تفسیر کا بانی قرار دے سکتے ہیں۔

(۲) ابنِ تیمیہ کے بعد قرآنیات پر بہت سی تصانیف آئیں، مگر اصولِ تفسیر پر کوئی بنیادی کام نہیں ہو سکا، یہاں تک سیکڑوں سال بعد شہرۂ آفاق محدث شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" سامنے آئی جو اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے اور اختصار کے ساتھ اصولِ تفسیر کے اکثر مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں

امید داشتہ از حضرت باری آنست کہ طالب علماں را بمجرد فہم ایں قواعد راہے واسع در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر یا گذرانیدن آنہا بر مفسران بسیر بند باں ضبط در ربط بدست نیارند

(الفوز الکبیر صـ۲)

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے یہ امید ہے کہ محض ان قواعد کے سمجھنے سے طالب علموں کے لئے قرآن پاک کے معانی کے سمجھنے کے لئے کشادہ راستہ کھول دیں گے حتیٰ کہ اگر عمر تفاسیر کے مطالعہ کرنے میں یا تفاسیر کو مفسرین کے پاس پڑھنے میں لگا دیں تو بھی اس مربوط طریقہ پر حاصل نہیں کر سکتے

بلا مبالغہ یہ قول حقیقت کی ترجمانی ہے۔

اگر اصولِ تفسیر کو ایک مدّون فن کی حیثیت میں مان لیا جائے تو اس کی تدوین کا سہرا شاہ صاحبؒ کے سر باندھا جائے گا۔

بقول علامہ سید سلیمان ندوی

"الفوز الکبیر کو اصولِ تفسیر میں متن کی حیثیت حاصل ہے۔" (معارف سید سلیمان نمبر صـ۲۴۹)

(۳) حضرت شاہ صاحب کے بعد کافی عرصہ تک سکوت رہا، اس موضوع پر کوئی اہم کتاب سامنے نہیں آئی، تا آنکہ چودھویں صدی کے نصف اول میں مولانا عبد الحمید فراہیؒ کی ایک تحقیقی کتاب "التکمیل فی اصول التاویل" منظرِ عام پر آئی۔

مولانا فراہیؒ کے بعض اصولوں میں گو کلام کرنے کی گنجائش ہے، خاص طور سے عربی ادب کو تفسیر میں غیر معمولی دخل دینا اور بظاہر روایات سے یک گونہ اختلاف ایک مکتبِ فکر کے یہاں قابلِ اعتراض ہے، اس کے باوجود قرآنیات کے سلسلہ میں ان کی دقتِ نظر کا کوئی منصف مزاج انکار نہیں کر سکتا۔

موصوف نے مدۃ العمر تفسیر کا تنقیدی جائزہ لیا اور مفسرین کی بعض لغزشوں کی نشاندہی بھی کی التوا نے "التکمیل"، "فاتحہ نظام القرآن"، "دلائل النظام"، "اسالیب القرآن" وغیرہ سے اصولِ تفسیر کا تفصیلی خاکہ سامنے آجاتا ہے اور بہت سے اصول و قواعد معلوم ہو جاتے ہیں۔

التکمیل میں مختلف عنوانوں کے تحت اصول تفسیر کی افادیت اسکے اغراض و مقاصد کو مدلل طور پر واضح کیا ہے افسوس کہ مولانا صاحب کا کام ادھورا رہ گیا

مذکورہ بالا کتابیں میرے محدود مطالعہ کے مطابق فنِ اصولِ تفسیر میں اہم ہیں، ان کے علاوہ نواب

صدیق حسن صاحب بھوپالی کی "الاکسیر فی اصول التفسیر"، شیخ محمد خضری کی "مبادی التفسیر" اور اس طرح کی دوسری کتابوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔

<u>اصول تفسیر کے مصادر و مآخذ</u> ماقبل کی بحثوں سے اتنی بات منقح ہو کر سامنے آگئی ہوگی کہ اصولِ تفسیر اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت سے علوم و فنون سے آگے ہے، اس کے فوائد بے شمار ہیں اور اس کی جڑیں اسلام کے ابتدائی دور سے ملتی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس کی تدوین و تنقیح کی طرف و صنتک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔

اب ہم مختصر انداز میں ان مصادر و مآخذ کی نشاندہی کریں گے جو ہمارے محدود مطالعہ کے مطابق اصول تفسیر پر کام کرنے والوں کو بنیادی عناصر و ارکان کا کام دیں گے۔

مآخذ (۱) (۱) قرآن کے مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ خود قرآن میں کہیں صراحۃً اور کہیں اشارۃً تفسیر کے بعض شرائط و اصول ملتے ہیں۔

قرآن میں ذکر شدہ اصول تفسیر کے ایک بڑے حصّے کو مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدظلہ نے اپنی کتاب "فہم قرآن" میں جمع کرنے کی سعی فرمائی ہے۔

(۲) کتب حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ نے بھی بہت سے اصول و قواعد کی نشاندہی فرمائی ہے مثلاً فرمایا

مآخذ (۲) (۱) "من تکلم فی القرآن برایه فاصاب فقد اخطأ" اخرجه الترمذی ابوداؤد والنسائی

(۲) عن ابی ھریرۃ قال کان اھل الکتاب یقرأون التوراۃ بالعبرانیۃ ویفسرونھا بالعربیۃ لاھل الاسلام فقال رسول اللہ: لا تصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوھم وقولوا: امنا باللہ وما انزل علینا الآیۃ رواہ البخاری فی کتاب الاعتصام

(۳) عن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللہ انزل القرآن علی سبعۃ احرف لکل منھا ظھر وبطن ولکل حد مطلع (مشکوٰۃ)

مآخذ (۳) (۳) اس قسم کی احادیث کے تحت محدثین و علماء کی تشریحات۔

ماخذ (۴) (۴) صحابہ کرام کے اقوال نیز تابعین وتبع تابعین وغیرہ کے آثار، یہاں چند نمونے ملاحظہ فرمائیں (۱) اخرج الطبرانی والبزار وغیرھم عن عبد اللہ بن مسعود موقوفا ان ھذا القران لیس منہ حرف الا لہ حد ولکل حد مطلع (اتقان ص ۱۸۴/۲)

(۲) قد اخرج ابن جریر من طرق عن ابن عباس قال التفسیر اربعۃ اوجہ وجہ تعرفھا العرب من کلامھا وتفسیر لا یعذر احد بجھالتہ وتفسیر تعرفہ العلماء وتفسیر لا یعلمہ الا اللہ (الاتقان ص ۱۸۲/۲)

(۳) قال مجاھد لا یحل لاحد یومن باللہ والیوم الآخر ان یتکلم فی کتاب اللہ اذا لم یکن عالما بلغات العرب (الاتقان ص ۱۸۰/۲)

(۴) روی البیہقی فی شعب الایمان عن مالک قال لا اوتی برجل غیر عالم بلغۃ العرب یفسر کتاب اللہ الا جعلتہ نکالا

(۵) قد روی الحاکم فی المستدرک ان تفسیر الصحابی الذی شھد الوحی والتنزیل لہ حکم المرفوع ای فی سبب النزول ونحوہ)

ماخذ (۵) بعض تفاسیر کے مقدمے مثلاً مقدمہ ابن جریر، مقدمہ البحر المحیط، مقدمہ تفسیر القاسمی، مقدمہ ابن کثیر، مقدمہ تبصیر الرحمٰن، مقدمہ تفسیر المنار وغیرہ

ماخذ (۶) تفاسیر کے ضمن میں نسخ، محکم، متشابہ، ربط آیات اور عموم خصوص وغیرہ متعلقہ مسائل پر مفسرین کا کلام۔

ماخذ (۷) علوم قرآنی پر لکھی ہوئی کتابیں، اصول تفسیر کا ایک بڑا حصہ ان کتابوں میں بھی ملتا ہے، اس موضوع پر بہت سی قدیم تصانیف اب ناپید ہیں، سیوطیؒ نے "الاتقان" کے شروع میں اپنے زمانے تک کی کتابوں کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے، سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر جلد دوم میں علوم قرآنی پر لکھی ہوئی کتابوں کی ایک اچھی خاصی فہرست

پیش کی گئی ہے۔

صاحب مناہل العرفان نے بھی جلد اول کے شروع میں مختصر انداز میں علوم قرآنی کی تاریخ بیان کی ہے، چند وہ کتابیں جو کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ دستیاب بھی ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) البرہان فی علوم القرآن (بدر الدین زرکشی) - (۲) مقدمتان فی علوم القرآن (پہلے مقدمہ کے مصنف نامعلوم، دوسرے کے مصنف ابن عطیہ، (۳) الاتقان فی علوم القرآن (جلال الدین سیوطیؒ) (۴) التبیان لبعض المباحث المتعلقہ بالقرآن (شیخ طاہر جزائری) (۵) مناہل العرفان فی علوم القرآن (عبد العظیم الزرقانی)

ان کتابوں میں التفسیر والتاویل اور شرائط التفسیر والمفسر کے تحت جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اصول تفسیر کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ماٰخذ (۸) اصولِ تفسیر پر مستقل تصانیف

ماٰخذ (۹) اصول فقہ کی کتابیں، اب تک اصولِ تفسیر کو اصولِ فقہ کا ایک جز قرار دیا جاتا رہا، یہی وجہ ہے کہ اس فن کو اس کے شایانِ شان مقام نہیں دیا گیا، پھر بھی اصولِ فقہ کے تحت جو کچھ مواد جمع ہے وہ اصولِ تفسیر کی تدوین میں بہت ہی معاون ہے۔

حرفِ آخر: ان مصادر کے نشاندہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اصولِ تفسیر سے متعلق صرف انھیں میں مواد ملے گا، بلکہ دیگر فنون کی تصنیفات میں بھی جابجا اصول و قواعد دستیاب ہو سکتے ہیں لیکن زیادہ مواد انھیں ماٰخذ میں ملے گا۔

شاید یہ مضمون کسی کے دل میں اس موضوع پر کام کرنے کا جذبہ پیدا کر سکے اور کوئی بندۂ خدا وقت اور وسائل کی سازگاری سے یہ اہم کام کر گزرے۔

علم منطق ـــــ ایک جائزہ

(۳)

مولانا بدرالزماں نیپالی مرکزی دارالعلوم بنارس

غرض یہ کہ ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) نے منطق اور اس کے قواعد و قوانین کا اختراع اور اس کی ایجاد نہیں کی۔ بلکہ اس کی تدوین و ترتیب کا کام اس نے سب سے پہلے انجام دیا۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ منطق ارسطو کی مزاولتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ جس کو اس نے مرتب کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اور مقبولیتِ عام حاصل کی۔ اور اس سے پہلے منطق کوئی قابل ذکر شیٔ نہ تھی۔ حالانکہ یہ خیال خام ہے۔ چنانچہ ہم شہرستانی کا بیان بھی نقل کر رہے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں۔

وهو (ارسطو) واضع لا بمعنى انه لم يكن المعاني مقومة بالمنطق قبله فقومها بل بمعنى انه جرد آلة عن المادة فقومها تقريبا الى اذهان المتعلمين حتى يكون كالميزان عندهم۔ (۲۶)

ارسطو واضع منطق اس معنی کر کے نہیں ہے کہ معانی اس سے پہلے منطق کی گرفت میں تھے ہی نہیں۔ تو وہ معانی کو منطق کی گرفت میں لے آیا۔ بلکہ واضع اس طرح سے ہے کہ اس نے مادہ سے ایک آلہ الگ کیا ہے پھر اذہان متعلمین سے اس کو قریب کرنے کے لئے ایک فن کی حیثیت سے پیش کیا تا کہ وہ طلباء کے لئے میزان کا فائدہ دے۔

اس کی مزید تشریح ہمیں قاضی صاعد اندلسی (متوفی ۴۶۲ھ) سے ملتی ہے۔ اور انہیں کی عبارت کو قاضی جمال الدین قفطی (۶۴۶ھ) نے نقل کیا ہے۔ بہر حال وہ کہتے ہیں۔

وهو (ارسطو) اول من خلص صناعة	ارسطو پہلا شخص ہے جس نے تمام منطقی صنعتوں سے
البرهان من سائر الصناعات المنطقية	صنعت برہان (قیاس) کو الگ کر لیا اور اشکال ثلاثہ کی
وصورها بالاشكال الثلاثة وجعلها	تصویر تیار کردی اور ان کو علوم نظری کے لئے آلہ
آلة للعلوم النظرية حتى لقب بصاحب	قرار دیدیا۔ یہاں تک کہ اسے صاحب منطق کا لقب
المنطق۔ (۲۷)	مل گیا۔

معاملہ یہاں بالکل واضح ہوگیا کہ ارسطو نے منطق کے ہر ہر جز کی ایجاد نہیں کی ہے بلکہ تمام منطقی صنعتیں اس سے پہلے بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ اور ان کی تعلیم و تعلم، اس کی تدوین سے پہلے باقاعدہ جاری تھی۔ جس کا پتہ ہم "دیمقراطیس" کی تحصیل منطق سے لگا سکتے ہیں۔ جو نقل کیا جا چکا۔ اور اس سے بھی کہ ارسطو اور اس کے استاذ افلاطون دونوں متقدمین کے خیالات کو ہضم کرکے اپنے جودت فکر کے ذریعہ ایک جدید نظریہ حاصل کر لینے میں بڑے ہی ماہر تھے۔

ارسطو چونکہ اپنے استاذ سے بھی دقیق النظر واقع ہوا تھا۔ اس لئے اس کی سمجھ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہم برہانیات (قیاسات) کو الگ کرکے ایک فن کی حیثیت سے پیش کر دیں۔ چنانچہ اس نے کیا بھی یہی، کہ علوم نظری کے لئے اس فن کو ایک آلہ بنا دیا۔ اور یہی آلہ منطق کے لقب سے ملقب ہوا۔

(۱) افلاطون (Plato) تمام مؤرخین کے نزدیک افلاطون فلسفہ کے اساطین سبعہ اور اساطین خمسہ دونوں میں سے ہر ایک کا اہم رکن شمار کیا جاتا ہے۔ وہ ۴۲۹ ق م کے درمیان ایتھنا میں پیدا ہوا۔ اور ۳۴۷ ق م میں روم کے ایک شہر "قونیہ" کے اندر وفات پائی اور یہیں قلعہ کے پاس مدفون ہوا۔ (۲۸)

افلاطون جس طرح بڑے ہی لطیف انداز میں تعلیم دیتا تھا۔ جس کا صرف ادراک ہو پاتا تھا ارسطو چل چل کر بھی تعلیم دیتا تھا۔ چنانچہ قاضی صاعد اندلسی لکھتے ہیں۔

واما افلاطون فشارک سقراط فی الاخذ عن فیثاغورس الا انہ لم یشتھر بالحکمۃ الا من بعد سقراط وکان یعلم الفلسفۃ وھو ماش فعرف ھو وتلامیذہ بالمشائین۔ (۲۹)	افلاطون فیثاغورس سے علم حاصل کرنے میں سقراط کا شارک تھا۔ مگر یہ کہ اسے سقراط کے بعد ہی فلسفہ دانی میں شہرت ملی۔ وہ فلسفہ کی تعلیم چل چل کر دیتا تھا اس وجہ سے وہ اور اس کے تلامذہ مشائین کے نام کے ساتھ پہچانے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مشائیت کی ابتداء افلاطون ہی سے ہو چکی تھی۔ اور اس کے تلامذہ کو مشائین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

افلاطون یہ پہلا فلسفی ہے۔ جس کے بارے میں ہمیں صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فلسفیانہ تصنیفات کے اندر تصورات کا ایک مکمل خاکہ پایا جاتا ہے۔ اس نے فیثاغورس کے علاوہ سقراط جیسی ذی علم شخصیت کی بھی شاگردی کی تھی (۳۰) اور اس کی جوتیاں صاف کی تھیں۔ جس کے نتیجے میں اس کو ایک نئے علم کی طرف کچھ رہنمائی ہوئی۔ گرچہ وہ اس کا مکمل طور پر تجربہ نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ اس کے مدرسہ کے پروردہ ارسطو ہی کا حصہ تھا۔ چنانچہ منطق کے بارے میں ہمیں ارسطو سے پہلے کی بعض تحریروں کا پتہ "کلیے" دیتا ہے کہ "ارسطو سے پہلے کی بعض تحریریں اس علم (منطق) کے متعلق پائی جاتی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے منطق کسی نہ کسی تحریری صورت میں ضرور پائی جاتی تھی۔ (۳۱)

اسی کے ساتھ ڈاکٹر محمد البہی مصری کا یہ بیان ملا لیجئے کہ "افلاطون وارسطو میں سے (ہر ایک کا ایک الگ الگ فلسفیانہ نظام ہے اور) ہر ایک کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے نظام کے اندر وہ متقدمین فلاسفہ کے افکار و نظریات کو کوٹ کوٹ کر بھر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے فلسفیانہ مذہب میں پرانے مدرسوں کے آثار صاف طور پر نمایاں ہیں۔ چنانچہ افلاطون کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ صوفیاء اور فلاسفۂ الٰہیات کے زمرے میں ہونے کے باوجود منطق میں صاحب "کلیات" ہے۔ جس طرح ارسطو "معیار فکر" کا مستخرج اور

صاحب "ارغانون" ہے۔ (۳۲) جو منطق کی سب سے پہلی کتاب قرار دی جاتی ہے۔
اب دونوں بیانات کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو دو چیزوں میں سے ایک ضرور لازم آئے گی۔ اول یہ کہ "کلیات" افلاطون کی کوئی مستقل تصنیف ہو، جس میں منطق کے مسائل سے بحث کی گئی ہو۔ دوم یہ کہ وہ تصورات اور غیر مرتب قسم کی کچھ کلی باتیں ہوں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بہر حال "ارغانون" (جو مسلم طور پر ایک مبسوط کتاب ہے) کے بالمقابل اس کا ذکر ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ضرور کوئی کتاب ہے۔ لیکن بالفرض اسے تصنیف نہ سمجھا جائے جب بھی افلاطون کی منطقیت اور ارسطو سے پہلے استخراج منطق کے سلسلے میں کد و کاوش اور ایک حد تک کامیابی کا پتہ چلتا ہے۔

افلاطون نے ایتھینز میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں شہرستانی کے قول کے مطابق ارسطو طیماوس اور ثاوفرسطس نے تعلیم پائی اور یہ کہ وہ اس مدرسے میں مذکورہ بالا دو طریقے پر تعلیم دیتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد مدرسے کا منتظم و منصرم سپیسیپوس (Speusippus) قرار پایا پھر اس کے بعد دیگرے لوگ اس کے مہتمم ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ ادارہ ۵۲۹ء میں قیصر جسٹینین کے عہد میں بند کر دیا گیا، کیونکہ اس نے تمام مدارس اور مکاتب پر پابندی لگادی اور اوقاف ضبط کر لئے (۳۳)

(۲) ارسطو (ارسطو طالیس Aristotle) ارسطو ۳۸۴ ق م میں یونانی شہر استاجیرس میں پیدا ہوا باپ "نیقوماخس" (Nicomachus) کی وفات کی وجہ سے اس کی تعلیم بچپن میں ٹھیک سے نہ ہو سکی اٹھارہ سال کی عمر میں اس کے سرپرست پرکینس (Proxenus) نے اس کو تحصیل علم کے لئے ایتھنا بھیجا۔ جو ان دنوں علوم عقلیہ کا گہوارہ تھا۔ یہاں ارسطو نے افلاطون کی خدمت میں بیس سال تک رہ کر علوم عقلیہ کی تکمیل کی۔ اس کو قدرت نے تحصیل علم کے لئے بلا کا حرص عطا کیا تھا وہ راتوں رات جاگ کر مطالعہ کرتا رہا، حتیٰ کہ اس کی ذہانت، محنت، جفاکشی، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کی دھاک بیٹھ گئی، وہ جس معاملہ میں غور و فکر کرتا اس میں سے ایک نئی چیز نکال لیتا تھا۔ اس کا تدبر ہی استخراج و استنباط کا ضامن تھا۔ اسے ایک ناقدانہ طبیعت ملی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ

کسی بھی مسئلہ میں تقلید کو روا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ متقدمین فلاسفہ نے کسی چیز کے بارے میں اگر کوئی نظریہ قائم کر لیا ہو تو ضروری نہیں کہ وہ از روئے تحقیق صحیح بھی ہو، کیونکہ غلط خیالات اور باطل افکار کو معاشرے کے دماغ میں باپ دادا کی کورانہ تقلید کی وجہ سے جگہ مل جاتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے وہ عقیدے کی طرح قلب و جگر میں راسخ ہو جاتے ہیں۔

انہیں بے لاگ تنقیدات اور تحقیقی نظریات کے پیش نظر بعضوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنے شفیق استاذ افلاطون کا بھی مخالف اور معاند ہے۔ حالانکہ اس نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا کہ استاذ کی ہر ہر رائے پر آمنا و صدقنا نہیں کہہ دیا۔ بلکہ اپنے علمی معیار پر ہر ایک کو وزن کیا۔ جس میں غلطی دیکھی اس پر سخت ترین انداز میں تنقید کی۔ لیکن اس قدر احتیاط کے ساتھ کہ نہ تو شخصیت مجروح ہو اور نہ اثبات مدعیٰ میں کوئی خامی رہ جائے۔ اس قسم کی تنقیدیں اس کی کتابوں میں بے شمار پائی جاتی ہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے اس نے اپنی فکری ورزش شروع کر رکھی تھی۔ چنانچہ وہ جسمانی غذا کے لئے چند لقمے پر قناعت کرتا تھا۔ لیکن روحانی غذا کے لئے اس مقدار کو کافی نہیں سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کثرت مطالعہ کا شوقین ہو گیا تھا۔ قدیم فلسفہ پر مجتہدانہ نظر ڈالنے کے باعث اس نے علوم کے اندر اتنی مہارت اور بصیرت پیدا کر لی تھی کہ پورے مدرسے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بلکہ اس کی زود فہمی اور باریک بینی اس حد تک مسلم ہو چکی تھی کہ ہر مشکل معاملہ میں جب تک اس کی طرف مراجعت نہ کر لی جاتی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاتا تھا۔

افلاطون کی وفات (۳۴۷ ق م) کے بعد جب وہ اثینا کے سفیر کی حیثیت سے ایک زمانہ تک مقدونیہ میں مقیم رہ گیا اور استاذ کے مدرسہ کی حالت معلوم نہ ہوئی تو اثینا واپس چلا آیا اس وقت "اکسینوفراط" اس مدرسہ کا معلم تھا۔ تعلیم برائے نام جاری تھی، مدرسہ کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ اس لئے ارسطو نے وہاں یونہی بیکار بیٹھا رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اور افلاطونی مذہب فکر کے مخالف اور مقابل ایک مذہب فکر کی بنیاد ڈال دی۔ لیکن یہاں مستقل طور سے قیام نہ کر سکا اور ایشیائے کوچک میں اپنے رفیق درس شاہ اٹرینس (Atarneus)

کے پاس پہنچا۔ ابھی تین سال کی مدت گذری تھی کہ شاہ مقدونیہ فیلبس نے اپنے بیٹے سکندر مقدونی کی تعلیم و تربیت کے لئے اس کو بلالیا۔ سکندر کی عمر ابھی چودہ سال کی رہی ہوگی کہ اس نے ارسطو جیسے عظیم مفکر اور فلسفی سے تحصیل علم شروع کر دیا۔ آٹھ سال تک علوم و معارف اور سیاست و حکمرانی کے ایسے ایسے نکات سیکھتا رہا جو اس سے پہلے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں گذرے تھے ارسطو ہی کی تعلیم و تربیت کے اثرات تھے جن سے وہ تدبیر مملکت اور فتح و شکست کے رموز کا عظیم واقفکار بن گیا۔

ارسطو اس طویل زمانے تک اپنے افکار میں جلاء اور اپنے خیالات میں پختگی پیدا کرتا رہا۔ آخر کار اب اس لائق ہو گیا تھا کہ اپنی قوتِ ذہن کے ذریعہ ایک نئے طرز کا علم مدون کر سکے اور نئے پیرائے میں اس کی ترجمانی کر سکے، چنانچہ وہ اپنی عمر کے آخری دور میں اس وقت ایتھنا کے لئے رخصتِ سفر باندھا جب فیلبس کے انتقال کے بعد سکندر تخت نشیں ہوا۔

ارسطو نے اس مرتبہ وہاں پہنچ کر "لیسیم" (Lyceum) نامی مقام پر اسکول تیار کرایا، اس لئے اس مدرسہ کا نام بھی اسی مقام کے نام سے مشہور ہو گیا "کلیمنٹ" کی تصریح کے بموجب اسی وجہ سے فرانس میں اب تک پبلک اسکول کو "لیسی" کہتے ہیں۔ (۳۴)

اس کا مدرسہ آج کل کے کالجوں کی طرح بڑی بڑی بلڈنگوں اور عظیم الشان عمارتوں پر مشتمل نہ تھا، بلکہ سادہ انداز کا ایک علمی مندر تھا، جہاں دورِ حاضر کی طرح سے علم دشمن نہیں بلکہ علم دوست جمع ہوتے تھے۔ اس کا مدرسہ اولاً ایک باغیچہ میں تھا جیسا کہ تاریخ الفلاسفہ میں ہے "قد اکتنفتہ صفوف من الاشجار" (۳۵) کہ جس جگہ مدرسہ تھا وہاں ارد گرد درختوں کی قطاریں تھیں۔

قرین قیاس یہ ہے کہ تعلیم کا سلسلہ اس باغ میں شروع کیا گیا ہوگا۔ اور پھر ضرورت کے مطابق اس کی تعمیر اور توسیع ہوئی ہوگی۔ اگر ارسطو اور سکندر کے باہمی روابط، اور سکندر کی علم دوستی پر نظر رکھی جائے تو یہ بات اقرب الی الفہم ہو جاتی ہے۔

بہر حال ارسطو کا یہ مدرسہ افلاطون کی طرز و فکر کا متحمل نہ تھا، بلکہ وہ اس کا ضد تھا۔ ارسطو کو اس وقت غیر معمولی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ وہ طلبار کی تمناؤں کا مرکز بن چکا تھا سب اس کا شاگرد بن جانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ بس اتنی دیر تھی کہ وہ کوئی مدرسہ قائم کر کے تدریسی میدان میں اتر آئے۔

چنانچہ جب اس نے اس مدرسے میں درس دینا شروع کیا تو ہر طرف سے طلبہ کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔ اس مدرسے کو پورے ملک یونان میں ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ کسی بھی دوسرے کو نہ ہو سکی، یہی نہیں بلکہ ملک کے تمام جامعات پر اس کو برتری حاصل ہو گئی وہ اپنی عادت کے مطابق طلبار کو گھوم گھوم کر تعلیم دیتا تھا۔ اس لئے وہاں کے فارغین اور ازمنۂ متاخرہ میں اس طریق فکر کے اختیار کرنے والوں کو بھی مشائین کہا جانے لگا۔

ارسطو نے اس مدرسہ کا انتظام و انصرام تیرہ ۱۳ سال تک کیا، اور اس مدت میں اپنی اہم اہم کتابیں تصنیف کیں، چونکہ اس نے پختگی حاصل کر لینے کے بعد تمام چیزوں پر کلام کیا تھا۔ اس لئے اس کے یہاں اور فلسفیوں کے اعتبار سے قوی دلائل پائے جاتے ہیں، اور اس کی باتیں وزن دار ہوتی ہیں۔ ارسطو نے بہت سی چیزوں کو تجربات کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی اس لئے سکندر تجربات کے لئے اس کی مالی امداد کیا کرتا تھا۔ چنانچہ جس زمانے میں یہ اپنے ایشیائی مہم پر تھا۔ ارسطو کے لئے اس نے عملی تجربات کے مواقع فراہم کر دئے تھے ۳۵۔

ارسطو نے اپنی وفات سے پہلے ہی اپنے شاگرد اور بھانجے (اور قفطی کے نزدیک بھتیجے) "تاؤفرسطس" کو اپنے مدرسے کا مہتمم بنا دیا تھا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کو ترقی دے گا اور ہر طرح سے اس کے انتظامات کو سنبھال سکے گا۔ لیکن وہ تمام تر کوششوں کے باوجود اس مدرسہ کو اس مقام پر نہ لے جا سکا جس کی تمنا ارسطو کو تھی۔

منطق کا استخراج و تدوین اور اس کے اسباب

ارسطو نے منطق کو اپنے اسلاف کی طرح جانا پہچانا اور اپنے فہم و ذکاء کے باعث اس کے حقائق و رموز تک

رسائی حاصل کر کے متقدمین پر فوقیت لے گیا۔ ابتک کسی کو اس طرف توجہ نہ ہوئی تھی کہ اصولیات منطق سے برہان وقیاس کا استخراج کرے اور اس کو ایک فن کے طریقے پر مرتب کرے۔ اس کی پہلی شخصیت ہے جسے ان دونوں چیزوں کی توفیق ملی۔

ارسطو نے دیکھا کہ آج تک جنھوں نے منطق پر کچھ کلام کیا ہے وہ نہایت ہی بے بصیرتی کے ساتھ اس قوت پر ایک سرسری نظر ڈال کر چلے گئے ہیں۔ اس لئے اس کی بیدار مغزی اور رمز شناسی نے اس کا مطالبہ کیا کہ اس قوت سے جو کام لیا جا سکتا ہو، اور جس اصول کے تحت لیا جا سکتا ہو ان کو اپنے دماغ سے نکال کر زبان پر لاؤ اور پھر اس کو مرتب اور مدون شکل میں قوم کے سامنے پیش کر دو استخراج منطق کا یہ پہلا سبب تھا۔ دوسرا سبب پیش آیا کہ جس وقت ارسطو نے اپنے طلباء میں فکری اور استقرائی خامیوں کو تیزی کے ساتھ راہ پاتے دیکھا اور اس کا اندازہ کر لیا کہ اس کی اصلاح صرف منطق کو برتنے کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا برتنا بغیر اصول ومبادی کے مرتب کئے ہوئے ممکن نہیں تو فوراً منطق کے استخراج اور تدوین کی طرف توجہ کی اور جلد ہی اس کے قواعد اور طریقے متعین کر دئے۔

ارسطو نے اشیاء کا مطالعہ بڑی وقت نظری سے کیا۔ اور متقدمین فلاسفہ کے نظریات پر عموماً اور اپنے استاذ افلاطون کے آراء پر خصوصاً ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ تقریباً ان سب کا یہ خیال تھا کہ حواس کے ذریعہ صحیح طریقے پر علم نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ کیونکہ حِسّ انسانی بہت سے ادراکات کی تحصیل سے عاجز رہ جاتی ہے۔ اس لئے انہوں نے اسے پس پشت ڈالدیا۔ اور اس طرح وہ بہت سے طبعی احکام کی تعلیل اور ان سے کما حقہ استفادہ کی صلاحیت کھو بیٹھے۔ ارسطو اس بنیادی چیز کو تاڑ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ذہن میں حاصل ہونے والے موجودات سے، خارج میں پائی جانے والی اشیاء پر ٹھیک استدلال ہو سکے گا۔ اس لئے اس کو موشگافی کی ضرورت ہی سرے سے نہیں پڑی۔ اس لئے اولاً ان احساسات کے ضمن میں آنے والی تمام چیزوں کا ابتدائی مطالعہ شروع کیا، اور دھیرے دھیرے تمام طبیعات کو گرفت میں لے کر آزمائش

کرڈالی، کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ بیک وقت عقل اور طبیعی حیثیت سے اشیاء پر غور و خوض کیا جائے۔ چنانچہ اس نے جب یہ مرحلہ طے کر لیا تو احساس اور طبیعت سے حاصل شدہ احکام اور ان کے علل و اسباب پر گہری نظر ڈالی۔ جس کے ثمرہ میں کچھ اصول و مبادی تک رسائی ہوئی، اور یہی اصول و مبادی ایک مستقل علم کے قوانین اور قواعد تھے۔ اس طرح اس نے ایک نیا علم پیدا کر لیا۔ جسے اگرچہ بالکلیہ جدید نہیں کہا جا سکتا تاہم قواعد کی رو سے بلا شبہ اپنی نوعیت کا یہ پہلا علم تھا۔ اور بنیادی حقائق پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پہلے کی تمام کوششوں کو جامع تھا۔ اسی علم کو منطق کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ارسطوی منطق کے اجزاء

ارسطو نے استخراج منطق کے بعد اس کے اجزاء کی طرف توجہ کی تو اسے منطق کے اندر آٹھ اجزاء کا پتہ چلا جن کے اسماء ضروری تشریح کے ساتھ ذیل میں بالترتیب درج ہیں۔

یونانی	عربی اردو	انگلش	تشریح
(۱) قاطیغوریاس	مقولات (مفردات)	The categories	اس کے اندر ایسے اجناس سے بحث ہوتی ہے جس کے اوپر احساسات کسی بھی جنس کا پتہ نہیں دے سکتے گویا یہ مبحث مفردات سے متعلق ہوتا ہے۔
(۲) باری ارمینیاس ہرمینیاس	عبارہ (قضایا تصدیقیہ)	The Herme nautics	یہ قضایا تصدیقیہ اور ان کے تمام اقسام پر مشتمل ہوتا ہے یعنی یہ مقدمہ ہوتا ہے۔
(۳) اناٹولیقا اول	تحلیل القیاس (قیاس)	The prior Analy--tics	یہ قیاس اور اس کے منتج ہونے کے بارے میں ہوتا ہے۔

(۴) انالوطیقا ثانی	برہان	The posterior Analytics	یہ اس قیاس کے اندر غور و فکر کرنے پر متضمن ہوتا ہے جو یقین کا فائدہ پہنچائے ۔
(۵) طوبیقا	جدل	The Topics	اس میں ان قیاسات کا ذکر ہوتا ہے جو مخالف کو زیر کرنے اور اس کو بند کر دینے کا فائدہ پہونچا سکیں ۔
(۶) سوفسطیقا	سفسطہ	The sophistics	یہ ان قیاسات پر مشتمل ہوتا ہے جن سے خلاف حق کو ثابت کیا جاتا ہے ۔ اور مناظر کو مغالطہ میں ڈالدیا جاتا ہے ۔ یہ بیان محض اس لئے رکھا گیا ۔ تاکہ مغالطات کو جان لینے کے بعد ان سے احتراز کیا جا سکے ۔
(۷) ریطوریقا	خطابت	The Rhetoric	اس میں ایسے قیاس کا تذکرہ ہوتا ہے ۔ جن کی مدد سے عوام کو کسی چیز کی ترغیب دلائی جاتی ہے ، کسی کام پر ابھارا جاتا ہے اور اس سے یہ بات جان لی جاتی ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنی بات کو کس انداز میں پیش کرنا چاہئے

(۸) ابوطیقا بوطیقا	شعر	The poetic	اس میں ایسے قیاس سے بحث ہوتی ہے، جو تشبیہ اور تمثیل کے طریقوں کو واضح کرتا ہے، کسی شئی کی طرف رغبت دلانے یا اس سے نفرت دلانے میں کیا انداز اختیار کرنا چاہئے، اور خیالات کو کس طرح پیش کرنا چاہئے۔ اس کی تشریح کرتا ہے۔

ارسطو نے منطق کے اندر جو آٹھ شقیں نکالیں اور ہر ایک کے قواعد اور اصول بنائے۔ وہ الگ الگ مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہر ایک کے نام بھی جدا جدا ہیں۔ ارسطو نے صرف تحلیل اصطلاحات سے کام لیا تھا۔ ان اجزاء کے نام متعین نہیں کئے تھے۔ اس لئے بعد میں آنے والوں نے ہر ایک کے نام وضع کئے۔ چونکہ منطق ہی کے یہ تمام اجزاء تھے۔ اس لئے انہیں صرف ایک کتاب میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی لئے بعد میں آنے والوں نے اس کی اس تصنیف کا نام "اورجانون" یا "ارغنون" (organon) رکھا، مفتاح الفلسفہ میں ہے کہ یہ نام ارسطو نے خود ایجاد نہیں کیا تھا۔ (۳۶)

بعضوں نے ارسطو کی اس کتاب کا نام "نص" قرار دیا ہے۔ جواز روئے تحقیق درست نہیں ابن خلدون کی تعیین کے مطابق کتاب اورجانون یا ارغنون کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منطق الصورۃ (Deductive) کہلاتا ہے اور دوسرا منطق المادۃ (Inductive) پہلے میں اول کے تین اجزاء اور ثانی میں آخر کے پانچ اجزاء داخل ہیں۔

اسکندر افرودیسی (۳۷) (۱۹۸ - ۲۱۱ ق م) کا خیال ہے کہ اورجانون کے اندر کتاب الخطابہ اور کتاب الشعر داخل نہیں ہے۔ بلکہ یہ الگ الگ دو مستقل کتابیں ہیں۔ اس رائے کے بموجب

ارسطو کی کتاب جو اول الذکر حصوں کا مجموعہ ہوگی۔ ثقات کا ایک بڑا گروہ اسی کا قائل ہے۔ لیکن پانچویں صدی عیسوی کے شارحین کے سرخنہ امونیوس، سامبلیسیوس اور داؤد ارمنی ان دونوں کو کتاب میں داخل مانتے ہیں۔ بلکہ امونیوس تو فرفریوس صوری (۲۳۲-۳۰۴ء) کی ایساغوجی یا مدخل کو بھی داخل کرتا ہے۔ اس طرح منطق کے کل نو اجزاء قرار پاتے ہیں۔ امونیوس کے طریقِ کار کی پیروی ابن سینا اور اکثر مناطقۂ عرب نے بھی کی۔ (۳۸)

اسی طرح ارسطوی منطق میں شکل رابع اور قیاس شرطی داخل نہیں ہے۔ کیونکہ ارسطو نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ پوری تفصیل آگے آئے گی۔

نوٹ: ڈاکٹر احمد امین اور ڈاکٹر زکی نجیب دونوں صاحبان نے قصۃ الفلسفۃ الیونانیہ (طبع مصر ۱۹۲۵ء) (جو دونوں کی مشترکہ تصنیف ہے) کے ص۲۱۹ پر مقدمہ ابن خلدون کے حوالہ سے ارسطوی منطق کی دو قسمیں منطق الصورہ اور منطق المادہ قرار دیا ہے۔ اور آگے لکھتے ہیں ”وقد عنی ارسطو بمنطق الصورۃ فقط، اما منطق المادۃ فلم یبحث و یبوب الا فی العصور الحدیثۃ“ ارسطو نے صرف منطق الصورۃ کی طرف توجہ دی اور منطق المادۃ پر بحث اور اس کی تبویب دورِ حاضر میں ہوئی اس سے پہلے نہیں۔ اور بحث کے خاتمہ پر لکھتے ہیں ”وکل ما یؤخذ علیہ ہو ما ذکرنا انہ اہمل منطق المادۃ تقریباً مع انہ احق بالنظر“ یعنی ارسطو پر سب سے زبردست گرفت جو کی جاتی ہے۔ وہ یہی ہے جس کو ہم ذکر کر آئے ہیں۔ کہ اس نے منطق المادۃ کو تقریباً بیکار چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہی سب سے زیادہ قابل توجہ تھی۔

حالانکہ ابن خلدون کی جس عبارت سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے ارسطو کی کتاب اور اس کے آٹھ اجزاء کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے آخر کے پانچ کو منطق المادہ قرار دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ابن تیمیہ (۷۲۸-۶۶۱ھ) نے الرد علی المنطقیین ص۲۷ (طبع بمبئی ۱۹۴۹ء) پر، ابن ابی اصیبعہ (۶۶۸-۶۰۰ھ) نے طبقات الاطباء ج ۱ ص۹۴ پر، جمال الدین قفطی (۶۴۶ھ) نے اخبار الحکماء ص۲۶ (طبع مصر ۱۳۲۶ھ) پر قاضی صاعد بن

احمد اندلسی (م ۴۶۲ھ) نے طبقات الامم ص ۳۹ (طبع مصر) پر اور ابن ندیم (م ۳۸۵ھ) نے الفہرست ص ۳۴۸ (طبع مصر ۱۳۴۸ھ) پر ارسطو کی منطقی تصنیفات کے بیان میں ان آٹھوں اجزاء کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں سے آخر کے پانچ منطق المادہ کہے گئے ہیں۔

تعجب تو یہ ہے کہ پروفیسر احمد امین بھی ضحی الاسلام میں ان تمام اجزاء کا تذکرہ ارسطو کی منطق کے ضمن میں کرتے ہیں۔

ثاؤفرسطس ارسطو نے اپنے مدرسے کی ذمہ داری ثاؤفرسطس کے اوپر جس وقت ڈالی تھی اس وقت اس کی مرتب کردہ منطق کا درس یہاں ہوتا تھا — ثاؤفرسطس نے ارسطو کی دلی تمنا کو پورا کر لینے کی مکمل طور پر کوشش کی اور ذاتی طور پر اس نے کام بھی کیا۔ بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے بعض کا ترجمہ بھی ہوا۔ کتاب قاطیغوریاس کی تفسیر کی نسبت اگر اس کی طرف درست ہو تو یہ منطق ارسطو کے اس جز کی پہلی شرح ہوگی جو اس دارالعلوم میں لکھی گئی۔ (۳۹) لیکن اس کا قطعاً پتہ نہیں چلتا کہ کسی نے اس میدان میں آگے قدم بڑھا کر اس دور میں منطق ارسطو کی توسیع کا پروگرام بنایا ہو یا کسی قدر جدت طرازی کا ثبوت دیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے معلم کے اس خاص فن "منطق" پر کوئی توجہ نہیں دی۔ جبھی تو کسی نے اس سلسلہ میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دیا۔ مزید تفصیل دوسرے دور میں آئے گی۔

رواقیین رواقیین! رواق کی طرف منسوب ہیں جس میں انھیں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مذہب فکر کے بانی زینو (Zeno ۳۳۲-۳۶۴، ۲۶۰ ق م) نے ڈالی اس کی وفات کے بعد "کلینتھیس" ۲۳۲ ق م تک اس کا صدر رہا۔ پھر ۲۰۴ ق م تک عظیم مفکر "کرایسی پوس" نے اس کی تمام ذمہ داریاں سنبھالیں۔ پھر یکے بعد دیگرے بہتوں کو اس کی ریاست ملی۔ اور ان سربرآوردہ فلسفیوں کی قیادت میں یہ مدرسہ ۱۵۰ ق م تک اثینا کے اندر کسی نہ کسی انداز میں منطق کی خدمت کرتا رہا۔ پھر اسے روم منتقل کر دیا گیا۔ اس مدرسہ کے زعماء کے نظریات تاریخ میں محفوظ نہیں ہیں۔ ہاں سرسری طور پر رواقیین کے منطقی نظریات کا پتہ کم و بیش چلتا ہے۔ اس لئے ان کی ذاتی رائے سے تعرض

نہیں کیا جائے گا، اس مکتبۂ فکر کے بانی زینو اور اس کے ذہین و مجتہد شاگرد کرسیپوس نے منطق ارسطو پر استدراک لکھا۔ چنانچہ زینو کے بارے میں ہے۔ "اجتھد فی علم المنطق وزاد بہ اشیاء کثیرۃ" (۴۰) کہ اس نے علم منطق میں درجۂ اجتہاد حاصل کر لیا۔ اور بہت سی چیزیں زیادہ کیں، اور کرسیپوس کے بارے میں ہے۔" انہ غیر اشیاء کثیرۃ من تعالیم سلفائہ وزاد علی ما ألفوہ فی کتبھم الکثیرۃ العدد اشیاء أخر غیرھا" (۴۰) کہ کرسیپوس نے متقدمین کی تعلیمات میں بہت سی چیزیں بدل دیں۔ اور انھوں نے اپنی بے شمار کتابوں میں جو چیزیں رکھ چھوڑی تھیں ان پر بہت سی دوسری چیزوں کا اضافہ کیا۔ اور ان دونوں نے ارسطا طالیس کی منطق کو مبحث علم کے مطالب اور شرطی اور انفصالی استدلال کے نظریہ سے مکمل کیا (۴۱) بعضوں نے اس چیز کو شبہ کی نظر سے دیکھا ہے کہ ارسطو نے صرف قیاس حملی پر اکتفاء کیا اور قیاس شرطی سے تعرض نہیں کیا۔ لیکن اس نسبت کی واقعیت میں اس وقت کوئی اشتباہ نہیں رہ جاتا۔ جب ہم رواقیین کی ان خدمات پر نظر ڈالتے ہیں جو انھوں نے منطق کے سلسلے میں انجام دئے۔ ظاہر بات ہے اگر ارسطو سے قیاس شرطی مختلف نہ ہوا ہوتا تو رواقیین کو اسے بطور تتمۂ منطق پیش کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

رواقی مکتب فکر نے جس طرح منطق کی تجدید کی، اس کو وسعت دی اور متنوع خصوصیات کا حامل بنایا۔ اسی طرح اس کو اپنے خاص انداز میں مرتب بھی کیا۔ چنانچہ انھوں نے منطق کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ ایک حصے کو ڈایالکٹک (مناظرہ) اور دوسرے کو ریطوریقا (خطابت) کہتے تھے۔ (۴۱) اس مکتب فکر کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ متقدمین کے تمام فلسفیانہ اور منطقیانہ اسالیب کا جائزہ لیا جائے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے گرچہ کوئی خاص منطق ایجاد نہیں کی۔ تاہم جس کی (ارسطو کی) منطق کو اپنے یہاں رواج دیا اس کو بعینہٖ قبول نہیں کر لیا۔ بلکہ اس کو اپنے خاص نظریات کے مطابق کر لینے کے بعد اپنے نصاب تعلیم میں داخل کیا۔

رواقیین کا منطقی نظریہ رواقیین نے افلاطون کے اس مذہب کا انکار کر دیا کہ نفس کے اندر

انسان کی پیدائش ہی کے وقت فطری طور پر ایسا مُثل پایا جاتا ہے۔ جو حقیقت مطلقہ سے بحث کرتا ہے۔ اس کا اکتساب عالم خارجی سے نہیں ہوا۔ ان کا خیال ہے کہ بوقت ولادت بچہ کا نفس ہر قسم کے آثار اور ہر قسم کی صورتوں سے بالکل صاف اور خالی ہوتا ہے۔ پھر اس کے حواس پر اشیاء خارجیہ سے پیدا ہونے والے آثار کی آمد شروع ہوتی ہے۔ اور ان کی صورتیں آئینۂ ذہن پر منعکس اور مرتسم ہونے لگتی ہیں۔

اس وجہ سے عقل آثار حسیہ کو قبول کرنے والی اور ان سے منفعل ہونے والی ثابت ہوئی۔ رواقیین کا خیال ہے کہ سرچشمۂ معرفت عالم خارجی ہے جو ہم تک اسباب علم کا فیضان کرتا ہے جس سے پانچ حواس ہمیں حاصل ہوتے ہیں۔ اور اس چیز کا نام علم اور معرفت ہے۔ اس کے برخلاف افلاطون کا نظریہ ہے کہ تنہا عقل ہی مصدر معرفت ہے۔ اس لئے کہ معرفت عقل ہی میں چھپ کر برآمد ہوتی ہے۔ حواس حصول معرفت کا ذریعہ نہیں، کیونکہ یہ اوہام و لغزشات تک پہنچاتے ہیں۔ رواقیین نے افلاطون کے اس نظریہ کو بھی رد کر دیا کہ مدرکات کلیہ یا بالفاظ دیگر اجناس کے اسماء جیسے انسان، گھوڑا، درخت وغیرہ۔ طبیعی حقائق کی صورتیں ہیں جو بالفعل موجود ہیں۔ لیکن ہمارے ذہن کی گرفت سے خارج ہیں۔ غرض یہ ادراکات کلیہ ہماری عقلوں میں صرف افکار کا درجہ رکھتی ہیں، ہمارا واسطہ حیات کی جن جزئیات سے پڑتا ہے ہم ان سے ان افکار کو الگ کر لیتے ہیں۔ پھر تمام اشباہ کو ایک جنس میں جمع کر دیتے ہیں اور اسے مشترک کا نام دیدیتے ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں ہمارے نفوس کے ماوراء اسم مشترک کا کوئی مدلول نہیں ہوتا۔

رواقیین کے خیال کے مطابق جب تمام معرفتوں کا صدور اشیاء محسوسہ ہی سے ہوتا ہے تو ہمارے ذہن میں چھپے ہوئے آثار اور اشیاء خارجیہ کے درمیان مطابقت کا نام حقیقت ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ یہی حقیقت ہمارے ذہن میں موجود شئی کی صورت اور نفس شئی کے درمیان مطابقت پیدا کرتی ہے۔

لیکن یہ چیز کیسے جانی جا سکتی ہے کہ ہمارے ذہن میں جو افکار ہیں وہ خارج میں پائی جانے والی اشیاء کی صحیح صورتیں ہیں۔ یہ کیسے معلوم ہوا کہ ذہن میں مثلاً درخت کی جو صورت ہے وہ اپنے مسمّٰی پر منطبق ہوتی ہے؟ اور یہ افکار و خیالات کی بازیگری اور احلام کا اختراع کیوں نہیں ہیں؟

اس کے جواب میں رواقیین کہتے ہیں کہ ہاں ضرور ایسی چیز موجود ہے۔ لیکن وہ ان کلی ادراکات میں نہیں پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ کلی ادراکات تو محض ذہنی امور ہیں۔ اور اسی امر نے ان ادراکات کی تخلیق کی ہے۔ اور حواس سے برآمد شدہ چیزوں سے ان کی ترکیب کی ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ہم زید، عمرو بکر کو دیکھ کر اپنے نفس میں ایک صورت کی تخلیق کرتے ہیں۔ اور اس تخلیق کا نام انسان رکھ دیتے ہیں۔ تو یہ کسی بھی طرح درست نہیں ہے کہ جس صورت کی ہم نے تخلیق کی اسے اپنے نفس کا مقیاس قرار دے لیں۔ جس کے ذریعہ صحیح کو باطل سے چھانٹ لیا جاتے اس وجہ سے آثار محسوسہ جن کے مقیاس ہونے کا ہم کو دعویٰ ہے۔ بہی حق ہوں گے۔ اس بیان سے جب اتنی بات واضح ہو گئی کہ مقیاس حقیقیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دائرۂ احساس ہی میں رہے۔ اس سے متجاوز نہ ہو تو مقیاس حقیقیہ فکر نہیں ہو سکتا بلکہ شعور ہو گا۔

رواقیین کا خیال ہے کہ اشیاء حقیقیہ یا تو ہمارے اندر قوی اور واضح شعور پیدا کرتی ہیں یا اپنے حقیقی ہونے کا اعتقاد ہمارے اندر پیدا کرتی ہیں۔ اور ذہن کے اندر شئ حقیقی کی جانب سے پیدا شدہ جو صورت ہوتی ہے اس میں یہ قوت اور وضوح اس بات کا ضامن ہوتے ہیں کہ ان ذہنی صحیح صورتوں کو ممتاز کر دیں جو حقائق خارجیہ کی تمثیل ان صورتوں سے پیش کرتی ہیں۔ جن کو احلام نے گھڑا ہے اور خیال نے جس کی ترتیب کی ہے۔

اس طریقے سے جب شئ حقیقی ہمارے دلوں میں گھر کر جاتی ہے اور جھٹک کر نکال پھینکنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تو اس وقت دل میں یہ پختہ یقین اور اعتقاد ہوتا ہے کہ شئ معین خارج میں بالفعل موجود ہے پس یہی شئ، حقیقت مؤکدہ، اور تنہا یہ اعتقاد مقیاس

حقیقت ہے۔ (۴۲)

ابیقوریین

ابیقوری طریق فکر کی بنیاد چوتھی صدی ق م کے خاتمہ پر ایتھنا میں ابیقور (متولد ۳۴۲ ق م ملبسا کوسی نے رواقیت کے ایک یا دو برس پہلے ڈالی تھی۔ اسی لئے اس کے نام کی طرف نسبت کرکے اس مذہب فکر کو ابیقوریت اور اس طرز پر غور و فکر کرنے والوں کو ابیقوریین کہا جانے لگا۔ ابیقور نے اس نئے طرز فکر کی تاسیس اس غرض سے کی تھی کہ فلاسفہ سابقین کے نظریات کا تتبع کرکے مخفی حقائق تک رسائی حاصل کی جائے گی۔ لیکن صرف ابیقور نے جو کچھ کلام کیا وہی لے دے کر اس مکتبۂ فکر کا کل سرمایہ ہے۔ کیونکہ اس کے اتباع میں کسی نے بھی منطق پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس لئے نہ تو ابیقور کی آرزوئیں بر آئیں اور نہ اس کے پیش کردہ مجمل نظریات ہی شرمندۂ تشریح ہو سکے۔

ابیقور کا منطقی نظریہ

ابیقور کا خیال تھا کہ حواس ظاہرہ کی بہ نسبت حواس باطنہ میں احساس کرنے اور اثرات کو قبول کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ جسم انسان کو جب کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے۔ تو وہ وقتی طور پر اس سے رنج محسوس کرتا ہے اور مصیبت کے زائل ہو جانے کے بعد اگر اس الم کا احساس کرنا چاہے تو یہ بدنِ آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن عقلی اور فکری پریشانی کے بعد بھی مصائب کا تصور کرتے ہی انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے ذہن میں اس درد اور کلفت کی معنوی صورت مرتسم ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ ماضی اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل میں پیش آنے والے حادثات کا ادراک کر لیتا ہے۔ (۴۳)

ہزار اجمال کے باوجود اس نے اس نظریہ کو بڑی سادگی اور وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ گویا ہم خود اس کا ادراک کر رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب فلاسفہ کے خیالات اس بارے میں مختلف ہو گئے کہ حقائق کو پہچاننے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کرنا زیادہ اچھا ہے۔ تو اس موقعہ پر ابیقور نے اپنی رائے ایسے انداز میں پیش کی کہ اس کا ڈانڈا منطقی برہان

کے ساتھ آکر مل گیا۔

اس نے کہا کہ حقائق کی معرفت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ حواس ہے۔ اور ہم اس سے مستغنی ہو کر حقائق اشیاء کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ حواس کے سوا کوئی آلہ ہی ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے صحیح اور فاسد میں امتیاز کر سکیں۔ اس کی خاص رائے یہ تھی کہ ذہن ابتدائی مراحل میں اشیاء کے تصورات سے بالکل پاک، ایک صاف شفاف تختی کے مانند ہوتا ہے۔ پھر جسمانی اعضاء جوں جوں مضبوط ہوتے جاتے ہیں۔ اسی مقدار میں معرفت کے دروازے بھی حواس کے ذریعہ کھلتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس لائق ہو جاتا ہے کہ غائب اشیاء کے بارے میں غور و فکر کر سکے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ فکر ہمیشہ درست ہی ہو گا۔ بلکہ اس میں اس قدر غلطی کا احتمال ہوتا ہے کہ بہت سی غائب چیزوں کو حاضر اور بسا اوقات بہت سی غیر موجودہ اشیاء کو متصور سمجھ لیا جائے اور حواس کا معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف حاضر چیزوں کو بوقت موجودگی ہی ادراک کر پاتے ہیں۔ اسی لئے اشیاء کے وجود کے سلسلے میں ان سے کبھی غلطی نہیں ہوتی۔

انہیں وجود کے پیش نظر یہ بات خلافِ عقل شمار کی جاتی ہے کہ کوئی اپنے فکر کے صدق و کذب کو براہین کے معیار پر پرکھ لے اور یہ فی الواقع غلط ہوں۔ پھر بھی اپنے حواس سے کام نہ لے اور اس پر محض اس وجہ سے ڈٹا رہے، کہ اس نے ایک کسوٹی پر اپنے نظریہ کو پرکھ لیا ہے۔ جس سے اس کی رائے غلط معلوم نہیں ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ فی الواقع غلط ہے۔ (۴۴)

یہ ہے منطق کے بارے میں ابیقور کا نظریہ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ براہین منطقیہ کی افادیت کا تو قائل ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ ان سے غلطی کا صدور ناممکن ہو بلکہ اس کے خیال کے مطابق منطق کو برتنے کے باوجود غلطی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک حواس سب سے معتبر ذرائع معلومات ہیں۔ غالباً انہیں نظریات کی جانب

اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنی موت کے وقت کہا تھا۔

وسع ماازوقه من ملذه الآلام فانی اتسلی واتصبر حین اتذکر البراہین التی زینت بها علما الفلسفة۔	عالم نزع کی پریشانیوں کے باوجود میں اس وقت سکون اور راحت محسوس کرتا ہوں جب ان "براہین" کو یاد کرتا ہوں جن سے میں نے علم فلسفہ کو مزین کردیا ہے۔

اس سے ابیقور کی خدمات منطق پر مکمل طور سے روشنی پڑ سکتی ہے کہ اس نے فلسفہ کے لئے کچھ براہین وضع کر رکھے تھے۔ جن کو وہ مرتے دم تک اپنی تسلی کا سامان سمجھتا رہا۔

خصوصیت دور اول کی چند چیزیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ جن کو مد نظر رکھ کر منطق کی ابتدائی نشو و نما اور ماحول اور نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے گا۔ جس دور میں منطق کا پتہ ہمیں معتبر ذرائع سے لگا ہے۔ اس میں فلسفہ پورے عروج پر تھا۔ ہر طرف اس کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ ہر وہ شخص جس نے معمولی طور سے فلسفیانہ مسائل پر نگاہ ڈالی ہو اور اساتذہ کی خدمت میں رہ کر تعلیم کی تکمیل نہ کی ہو۔ اس کے لئے اس زمانے میں مناسب نہ تھا کہ وہ اس علم میں کلام کرے اور اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے جگہ جگہ رسوا ہو، ایسے وقت، کچھ ایسے پراگندہ خیالات ذہنی کاوشوں کے نتیجے میں ظاہر ہوئے جو آگے چل کر دراصل ایک متعلم فکر اور علوم عقلیہ کے لئے ایسا معیار بننے والے تھے جو غور و خوض کی صحت اور سقم کو پہچاننے میں مشعل کا کام دے سکیں اور صحیح طریقے پر تدبر کرنے کا ملکہ ذہن کے اندر پیدا کر دیں۔

ابتداء میں یہ محض چند اصول اور مبادی پر مشتمل تھے۔ جن کا پتہ صحیح طور پر کسی ایک شخص نے اصطلاحی صورت میں نہیں لگایا۔ بلکہ اس راہ میں اہل یونان نے دوسرے ممالک کی بھی مکمل مدد حاصل کی۔ حتی کہ پہلے دور میں زیادہ سے زیادہ کامیابی اس حد تک ہو سکی کہ کچھ اصول مرتب کر کے قلم بند کر لئے گئے اور علی الاقل اس لائق بنا دیا گیا

کہ تھوڑی سی وقت نظری کے بعد اس کو ایک علم کی حیثیت دی جا سکے۔ چنانچہ اس دور کے آخری فلسفی افلاطون کی جدت طرازیوں کے بعد اس کے شاگرد ارسطو نے ایک علم کی بنیاد ڈالدی۔ چونکہ افلاطون دوسروں کے افکار و خیالات سے استفادہ کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتا تھا۔ اس لئے ناقص مگر پہلی کامیابی اسی کو حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ارسطو نے اس کی تکمیل کی اور زینو اور ابیقور نے اس کی تہذیب اور تنقیح کی۔ گویا یہ ایجاد و اختراع اور تخلیق و ابتکار کا دور تھا۔

(باقی)

حوالہ جات و حواشی

(۲۵) الرد علی المنطقیین ص۳۸ طبع بمبئی ۱۹۴۹ء
(۲۶) ملل و نحل ج ۲ ص۲۳
(۲۷) طبقات الامم ص۳۶،۳۷ و اخبار الحکماء ص۲۲
(۲۸) تقویم البلدان ص۳۸۳
(۲۹) طبقات الامم ص۲۵
(۳۰) ملل و نحل ج ۲ ص۴
(۳۱) مفتاح الفلسفہ ص۴۹ از آس والڈ کلپے مترجم مرزا محمد ہادی
(۳۲) الجانب الالٰہی من التفکیر الاسلامی ص۱۰۹ طبع مصر ۱۹۴۵ء
(۳۳) تاریخ الفلسفہ ص۲۸
(۳۴) ایضاً ص۳۰
(۳۵) تاریخ الفلاسفہ ص۱۰۳
(۳۶) مفتاح الفلسفہ ص۴۹

(۳۷) اسکندرافرودیسی ۱۹۸ء سے ۲۱۱ء تک ائینا میں مشائین کے سردار اور امیر کی حیثیت سے رہا تفصیل آگے آئے گی۔

(۳۸) مقدمہ ابن خلدون ص ۱۲۳۹، ۱۲۴۰

(۳۹) الفہرست ص ۲۵۳

(۴۰) زبدۃ الصحائف فی اصول المعارف از نعمت اللہ نوفل طرابلسی ص ۲۷ طبع بمبئی ۱۳۲۲ھ

(۴۱) مفتاح الفلسفہ ص ۵

(۴۲) قصۃ الفلسفہ الیونانیہ ص ۲۸۳ تا ۲۸۵ طبع مصر ۱۹۵۳ء

(۴۳) تاریخ الفلاسفہ ص ۱۴۱

(۴۴) ایضاً ص ۱۴۹، ۱۵۰

تبصرے

مشاہدات و تاثرات: از ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ بانی ویمنس کالج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ضخامت ۲۲۶ صفحات، تقطیع متوسط۔ کتابت و طباعت متوسط، قیمت مجلد -/۱۵ پتہ: فیمل ایجوکیشن ایسوسی ایشن، علی گڈھ۔

۱۸۹۱ء میں شیخ محمد عبداللہ مرحوم سرسید کا نام اور ان کی شہرت سن کر علی گڑھ آئے، یہاں تعلیم پائی اور جب تک سرسید زندہ رہے ان کی صحبت سے استفادہ کیا، پھر تعلیم ختم کرنے کے بعد علی گڑھ کو ہی وطن بنالیا اور علی گڑھ تحریک سے برابر وابستہ رہے، اس بنا پر سرسید کے عہد سے لے کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وائس چانسلری تک محمڈن کالج اور پھر مسلم یونیورسٹی پر تغیر و تبدل اور انقلاب کے جتنے دور آئے مرحوم نے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس سلسلہ میں جو گفتگوئیں اندرون و بیرون خانہ ہوئیں انھیں اپنے کانوں سے سنا تھا ارباب علم و ادب کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ مرحوم نے ۱۹۴۰ء سے اپنے یہ مشاہدات و تاثرات قلمبند کرانے شروع کر دئے تھے، جن کو اُن کی صاحبزادی محترمہ ممتاز جہاں سابق پرنسپل زنانہ کالج مسلم یونیورسٹی نے اب طبع کرا کے وقفِ عام کر دیا ہے، چوں کہ یہ مشاہدات و تاثرات ایک سوچی سمجھی تصنیف کی شکل میں مرتب نہیں کئے گئے اس بنا پر اس کتاب میں وہ ترتیب تو نہیں ہے جو ہونی چاہئے تھی، واقعات اور اُن سے متعلق تاثرات آگے پیچھے ہو گئے ہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب عہد متعلقہ سے متعلق ایک نہایت اہم اور بڑی قابلِ قدر تاریخی دستاویز ہے اس میں سرسید کی لائف اور علی گڑھ تحریک سے متعلق اشخاص و افراد، محمڈن کالج کے یورپین اور ہندوستانی اساتذہ اور طلبہ اور اُس زمانہ کی علی گڑھ سوسائٹی کے بارہ میں کثرت سے وہ امور و واقعات ملیں گے

جو کہیں اور نہیں ملتے اور اگر ملتے بھی ہیں تو بہ رنگ شنیدہ، اس لئے اُن میں واقعیت کم ہے اور افسانویت زیادہ مثلاً سرسید کی کانگرس سے نہ صرف علیحدگی بلکہ اُس کی مخالفت کے وجوہ و اسباب خود سرسید کی زبانی، سرسید کا اپنے بیٹے جسٹس محمود سے سخت اختلاف اور اُس کے وجوہ، محمود کا اپنے نامور والد کے ساتھ انتہائی نالائقی کا معاملہ، سرسید کی حسرتناک موت یہ سب وہ واقعات ہیں جن کا تذکرہ اس صفائی کے ساتھ کہیں اور نہیں ملے گا، اسی طرح نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، ڈاکٹر ضیاء الدین، مولانا شبلی وغیرہم کے حالات میں بعض بالکل نئی باتیں ہیں جو پہلی مرتبہ اس کتاب کے ذریعہ علم میں آتی ہیں، اسی دور میں تحریکِ خلافت، کانگرس کی جدوجہد آزادی۔ ملک کی تقسیم اور اُس کے نتیجہ میں نہایت ہولناک فسادات اور مہاتما گاندھی کے قتل کے واقعات بھی پیش آئے جن کے دور رس اثرات مسلم یونیورسٹی پر بھی پڑے، شیخ صاحب نے یہ تمام واقعات بڑی وضاحت، صفائی اور جرأت و دلیری سے لکھے اور اُن سے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے ہیں علی گڑھ تحریک سے وابستہ حضرات میں شیخ صاحب تنہا شخص تھے جن کے نزدیک لڑکوں کی تعلیم کی طرح لڑکیوں کی تعلیم بھی ضروری تھی۔ اس سلسلہ میں سرسید اور اُن کے رفقا کے کیا خیالات و افکار تھے؟ شیخ صاحب نے ہزار مخالفتوں کے باوجود کس پامردی۔ استقلال اور ایثار و خلوص سے اپنی رفیقۂ حیات کے تعاون و اشتراک سے اس کارِ خیر کا آغاز کیا جو ترقی کرتے کرتے آج ایک عظیم الشان زنانہ کالج کی شکل میں موجود ہے اور جس نے بے خبر ملک میں تعلیم نسواں (خصوصاً مسلمان خواتین) کو فروغ دینے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، شیخ صاحب نے یہ پوری داستان لکھی ہے جو قومی کارکنوں کے لئے عبرت انگیز بھی ہے اور سبق آموز بھی، علاوہ ازیں اپنے ملک اور ملت کے بہت سے موجودہ سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل سے متعلق اپنے افکار و آراء اخلاقی و خاندانی حالات و سوانح بھی بیان کرتے گئے ہیں اگرچہ جو کچھ لکھا ہے اُس کے ہر جزء سے سب کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ تاریخی اور واقعاتی لحاظ سے یہ کتاب نہایت اہم اور قابلِ قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ کتاب کی طباعت معیاری نہیں ہے۔ ہمارے ادارہ کے کارکن مولوی محمد ظفر احمد خان کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے اُن سے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا

ہوا کہ طباعت کے بعد ترمیم و تنسیخ اور تکمیل میں تاخیر کے باعث بہت سے دوسرے اجزا بھی خراب ہو گئے تھے جن کی متفرق کاتبوں سے کتابت کرانے اور متفرق پریسوں میں طبع کرانے کی وجہ سے طباعت کا معیار باقی نہیں رہا اور ایسوسی ایشن کو مالی بار بھی زیادہ اٹھانا پڑا۔

یادِ یارِ مہرباں : از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی، تقطیع متوسط، ضخامت ۲۰۹ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت ۔/۲۱، پتہ :۔ گلستان پبلشنگ ہاؤس دہلی ۷۔

یہ کتاب خواجہ صاحب کے اُن مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے جو وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان کے بعض مشاہیر جن سے ان کی صاحب سلامت اور جان پہچان تھی اور بعض اپنے خاص دوست احباب اور بزرگ، ان کی یاد میں لکھتے رہے تھے، اول الذکر طبقہ میں سر تیج بہادر سپرو، آصف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، پنڈت نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، راجہ جی اور ڈاکٹر تاراچند اور دوسرے اور تیسرے طبقہ میں صرف ایک ایک یعنی صدیقی اور مولانا حامد حسن قادری شامل ہیں۔ یہ مضامین جس کو ہم خاکہ نگاری کہتے ہیں فنی اعتبار سے اُس کے تحت آتے ہیں یا نہیں، بہرحال یہ ایک ایسے صاحب قلب و نظر کے مشاہدات و تاثرات ہیں جن کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور قوت مشاہدہ بھی تیز اور دور رس، اس لئے یہ سب مضامین تاریخی، سوانحی اور ادبی حیثیت سے بڑے معلومات افزا اور بصیرت افروز ہیں، پھر زبان و بیان کا کیا کہنا! خواجہ صاحب کا قلم گوہر رقم موج خرامِ یار کی طرح قدم قدم پر گل کترتا چلتا ہے، اس بنا پر انشائے لطیف کے اعتبار سے بھی یہ کتاب اُردو کے ادبِ عالیہ میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

لکھنؤ کی لسانی خدمات : از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۷۶ صفحات، طباعت و کتابت بہتر، قیمت ۔/۱۲، پتہ :۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو شعر و شاعری میں ۔ جو مرتبہ و مقام دلی کا ہے وہ لکھنؤ کا نہیں ہے۔ لکھنؤ میں شاعروں کی بہتات کے باوجود ایک شاعر بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جو تغزل میں میر، درد، غالب ذوق اور مومن کا ہم پلہ ہو، اگرچہ بعض دوسرے اصنافِ سخن مثلاً مرثیہ، قصیدہ گوئی اور ریختہ میں لکھنؤ نے بڑی ترقی کی، لیکن شاعری میں ان اصناف کی وہ اہمیت نہیں ہے جو غزل کی ہے، با ایں ہمہ اس میں شبہ نہیں

کہ لسانی اعتبار سے جو کام لکھنؤ میں ہوا وہ دلی میں نہ ہو سکا۔ اس کتاب میں لکھنؤ کی ان خدمات کا ہی جائزہ لیا گیا ہے۔ چنانچہ لائق مصنف نے پہلے مختصراً اردو زبان کی تاریخ، اُس کے ارتقاء کے مختلف مراکز اور ادوار پر بطور تمہید کلام کرنے کے بعد لکھنؤ کے اُن اٹھائیس ارباب قلم کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے اُردو زبان کے لسانی مباحث پر چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ موصوف نے ان حضرات کے حالات و سوانح تو مختصر لکھے ہیں لیکن کتابوں کا تعارف مفصّل کرایا ہے۔ اس کے بعد ایک باب تبصرہ کا ہے جس میں لسانیات اور اُس سے متعلقہ مضامین و مباحث کا اجمالی تعارف اور ان موضوعات پر جن حضرات نے کام کیا یا اب بھی کر رہے ہیں اُن سب کا تذکرہ اور اُن پر ہلکا پھلکا تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتاب جو اپنے موضوع پر منفرد اور پہلی کتاب ہے بڑی محنت، تحقیق اور کاوش سے مرتب کی گئی ہے اس میں بیسیوں ایسی کتابوں اور اُن کے مصنفین کا تذکرہ ہے جن کو زمانہ نے طاقِ نسیان کی نذر کر دیا۔ اور اب کوئی اُن کے نام بھی نہیں جانتا۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بڑی قابلِ قدر ہے اور تاریخِ ادب اردو کا کوئی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ آخر کے چند صفحات کتاب کے مآخذ اور اشاریہ کے لئے مخصوص ہیں۔ زبان سلیس و شگفتہ اور اسلوب نگارش ماقل و دل کا مصداق ہے۔ ارباب ذوق کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

سنہ ۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔ تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم الفقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول ، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید) دلپذیر ترتیب ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم ، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب سرور کونین ۔

سنہ ۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط ، امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

سنہ ۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ، اسلامی کتب خانے ، عرب دنیا ، تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔ نیل سے فرات تک ۔

سنہ ۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم ، تاریخ ردہ ، سرکشی ضلع بجنور ، علماء ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

سنہ ۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات ، لادینی دور کا تاریخی پس منظر ، ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ، رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

سنہ ۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ، تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات ، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

سنہ ۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ، خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ، انتخاب الترغیب والترہیب ، اخبار التنزیل ، عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. 231 Phone 262810 January 1976

Subs. Rs. 15-00 Per Copi Rs.1-50

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

فروری ۷۶ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سیاسیہ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

بُرہان

شمارہ نمبر ۲	بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۹۶ھ مطابق فروری ۱۹۷۶ء	جلد نمبر ۷۶

فہرست مضامین

نظرات

بڑی خوشی کی بات ہے کہ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے ابھی اپنے اواخر جنوری کے جلسہ میں قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا یکصد و سیزدہ سالہ جشن مارچ ۱۹۸۰ء کے اواخر میں عالمی پیمانہ پر منایا جائے، اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا کے ہر گوشہ سے اور برصغیر انڈو پاک کے ڈھائی تین لاکھ افراد اس میں شریک ہونگے، چنانچہ اسی کے مطابق تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں اور مولانا حامد الانصاری غازی کی سرکردگی میں یکم فروری سے باضابطہ ایک دفتر قائم کر دیا گیا ہے، دارالعلوم دیوبند کی جامع اور محققانہ تاریخ جو چند برس سے بڑے اہتمام سے لکھی جارہی تھی وہ اب قریب الختم ہے، جشن کے موقع پر یہ کتاب بھی کئی جلدوں میں اردو، عربی اور انگریزی میں شائع ہوگی۔ ہم سب کو دعا کرنی چاہئے کہ یہ جشن بہمہ وجوہ کامیاب اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے فلاح و خیر کا موجب ہو۔

امیر خسروؒ تقریبات جن کا غلغلہ ایک عرصہ سے برپا تھا اس کا آغاز وگیان بھون نئی دہلی میں ۲۳ جنوری کو صدر جمہوریہ کے خطبہ سے ہوا اور ۲۵ جنوری تک بین الاقوامی سیمنار کی صورت میں جاری رہیں، اس موقع پر امیر خسروؒ تقریبات نیشنل کمیٹی کی طرف سے دو کتابیں شائع کی گئیں جو امیر خسروؒ کی حیات اور ان کے کارناموں پر مختلف ارباب قلم کے مقالات پر مشتمل اور انگریزی اور اردو میں الگ الگ تھیں ان کے علاوہ امیر خسروؒ سے متعلق چند چھوٹے چھوٹے

رسالے بھی شائع کئے گئے جو بجائے خود مفید ہیں اور امیرؔ کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن اس سے قطع نظر انتظامی ابتری اور پراگندگی کا جو منظر یہاں نظر آیا وہ بے حد افسوسناک اور شرمناک ہے۔ جن لوگوں سے مقالات لکھوائے گئے تھے ان میں متعدد حضرات ہیں (جن میں ایک راقم الحروف بھی ہے) جن کو مقالہ کے شائع ہونے کی اطلاع تک نہیں دی گئی، کتاب اور مقالہ کا آف پرنٹ بھیجنا تو دور کی بات ہے، ہندوستانی مندوبین و مدعوئین کے لئے نہ کہیں قیام کا انتظام تھا نہ طعام کا۔ اور نہ کسی قسم کی سواری کا۔ ایک سادہ دعوت نامہ ۲۰ر جنوری کو یہاں سے روانہ کیا گیا، جب کہ کانفرس ۲۳ر کی صبح سے شروع ہو رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود دہلی اور نئی دہلی میں دعوت نامہ بعض لوگوں کو اتنی تاخیر سے ملا کہ وہ پہلے دن کے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے۔ جن حضرات کو بیرون دہلی دور دراز کے مقامات سے آنا تھا اس سے اُن کی تکالیف کا اندازہ ہو سکتا ہے، پھر نہ سیمینار کا کوئی مطبوعہ پروگرام تھا اور نہ جیسا کہ اس قسم کی کانفرنسوں اور سیمناروں میں عام طور پر ہوتا ہے۔ کوئی پارٹی، کوئی استقبالیہ اور نہ کوئی کلچرل پروگرام۔ اس کے علاوہ مندوبین و مدعوئین کے ساتھ ادب و احترام کا وہ معاملہ نہیں کیا گیا جو کرنا چاہئے تھا۔ اس بنا پر ہر شخص وہاں پر سخت شاکی اور بیزار نظر آتا تھا۔ غرض کہ اس کانفرنس اور سیمنار کو ہرگز کامیاب نہیں کیا جا سکتا۔ ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ قرار واقعی اس کی تحقیق کرائے کہ یہی علمی اور ادبی کانفرنسیں جب یونیورسٹیوں میں، ارباب یونیورسٹی کے زیر اہتمام و انتظام ہوتی ہیں تو نہایت شاندار اور کامیاب ہوتی ہیں، لیکن جب ان کانفرنسوں کا در و بست اور ان کا اہتمام و انتظام سرکاری لوگوں اور گورنمنٹ کے عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو شرمناک حد تک ناکامیاب رہتی ہیں۔

افسوس ہے، مولانا عبدالباری ندوی کا گذشتہ مہینہ ایک طویل علالت کے بعد ۸۲ برس کی عمر میں ان کے وطن لکھنؤ میں انتقال ہوگیا، مولانا کے نہایت ذہین اور طباع ہونے کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی اصل تعلیم قدیم طریقہ کے مطابق عربی اور فارسی کی تھی، اور انگریزی غالباً ہائی اسکول تک پڑھی تھی، لیکن اپنے ذاتی مطالعہ اور شوق سے انھوں نے انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ اولاً فلسفۂ یورپ اور ثانیاً سائنس کا مطالعہ کرسکیں۔ فلسفہ سے انھیں خاص مناسبت تھی۔ چنانچہ اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ برکلے، برگساں، اور ڈیوڈ ہیوم پر انھوں نے کتابیں لکھیں اور ان کی بعض کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا، اور نہ صرف یہ بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے فلسفہ کے لکچرر اور پھر اس کے ریڈر مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں سیرت النبیؐ مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی کی جلد سوئم کے قدیم ایڈیشن میں مرحوم نے معجزات پر جو ایک باب لکھا تھا وہ زبان و بیان اور استدلال و استنتاج کے اعتبار سے ایک نہایت اہم مقالہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

طبع سلیم اگر رہنما نہ ہو تو فرطِ ذہانت اور فلسفہ کے ساتھ انہماک و توغل بسا اوقات گمراہی کا سبب ہو جاتے ہیں، چنانچہ مرحوم کے ساتھ یہی ہوا، زندقہ و الحاد کا شکار ہوگئے، ایک مدت کے بعد جب مولانا تھانوی سے بیعت ہوئے تو فلسفہ کا ردِ عمل اس شکل میں ہوا کہ مذہب کا رہبانی تصور غالب آگیا، غرض کہ وہ ہر زمانہ میں ع

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

کا مصداق رہے۔ عملاً بڑے صالح، نیک، متقی اور پرہیزگار، زاہد و عابد شب زندہ دار اور اخلاق اعتبار سے بڑے شگفتہ طبع، بذلہ سنج و ملنسار تھے۔ مولانا شبلیؒ کی تعلیم و تربیت نے اکابر علماء و فضلاء اور نامور اربابِ قلم کی جو عظیم نسل پیدا کی تھی مولانا غالباً اس کی آخری یادگار تھے، ان کی آخری تصنیف جو بڑی معرکۃ الآرا ہے۔ "مذہب و سائنس"

ہے ۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں اور اور خطاؤں کو معاف فرمادے اور انھیں مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے ، آمین ۔

ناگزیر مصروفیتوں کے باعث اس مرتبہ غزوات و سرایا کی سترہویں قسط حوالۂ قلم نہیں ہو سکی ، جس کا افسوس ہے ۔

حدیث کا درائتی معیار

(داخلی فہم حدیث)

۷

ایمان بالملائکۃ

مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

ملائکہ پر ایمان کا مقصد | ملائکہ (فرشتے) پر ایمان لانے کا مقصد یہ ہے کہ نظامِ وجود میں ان کی صحیح حیثیت نظروں کے سامنے رہے تاکہ اللہ سے خالص رشتہ قائم کرنے میں اس راہ سے شرک کی آمیزش نہ ہو اور انسان فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں ان کے تعاون سے محروم نہ رہے ۔ اصلاً یہ کوئی مستقل عنوان نہیں ہے بلکہ ایمان باللہ ہی کا تتمہ اور ضمیمہ ہے لیکن چونکہ ہمیشہ ملائکہ کی حیثیت اور ان کے کام کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور لوگ شرک میں مبتلا ہوئے اس لئے مستقل عنوان کی ضرورت پیش آئی ۔

ملائکہ سے مراد | ملائکہ ۔ مَلَک اور مِلاک کی جمع ہے جس کے لغوی معنی فرستادہ، اور قاصد کے ہیں۔ کلام عرب میں ہے :

اَلکِنی الیہ ای ارسلنی الیہ [1] بھیجا مجھ کو اس کی طرف ۔

---

[1] فخر الدین رازی تفسیر کبیر ج ۱ المسئلۃ الثانیۃ فی بیان حقیقۃ الملائکۃ ۔

لیکن یہاں اللہ کی وہ نورانی مخلوق مراد ہے جو باطنی طور پر کائنات کا انتظام چلانے پر مامور ہے اور مختلف کاموں میں اس کی حیثیت سفیر و قاصد کی ہے بالخصوص اصلاح و تزکیہ کے پروگرام میں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان سفارت کے فرائض اسی کے سپرد تھے۔

ملائکہ کے سپرد مختلف کام | قرآن حکیم میں فرشتوں کی حقیقت سے بحث نہیں کی گئی ان پر جس قدر ایمان مطلوب ہے اس کے لئے حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پھر فرشتوں کا تعلق خالص نورانیت سے ہے جس کی کنہ تک رسائی میں مادی کثافت مانع ہے اس بناء پر نظام وجود میں ان کی حیثیت اور ان کے کام کی نوعیت بیان کرنے پر اکتفاء کیا گیا جس سے مطلوبہ ایمان کی ضرورت پوری ہو جاتی اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم میں ہے:

۱۔ ملائکہ کے ذریعہ اللہ کے حکم کا نفاذ ہوتا ہے:

اذ یوحی ربك الی الملائکۃ انی معکم فثبتوا الذین امنوا (الانفال ۲۶)

یاد کرو، جب آپ کا رب فرشتوں کو حکم کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

۲۔ وہ اللہ کے حکم و مرضی کو مخلوق تک پہنچانے میں بطور سفیر و قاصد کام کرتے ہیں:

اللہ یصطفی من الملائکۃ رُسُلاً ومن الناس۔ (الحج ع ۱۰)

اللہ ہی فرشتوں اور انسانوں سے رسول (قاصد) منتخب کرتا ہے۔

۳۔ کائنات میں مختلف کاموں کی تدبیر و تنظیم ان کے سپرد ہے:

فالمدبرات امرًا۔ (النازعات ع ۱)

پھر ان فرشتوں کی قسم جو کام کی تدبیر کرنے والے ہیں۔

۴۔ انسان کے اعمال کی نگرانی و نگہبانی ان کے سپرد ہے:

وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ۔ (الانفطار ع ۱)

بیشک تمہارے اوپر نگہبان مقرر ہیں جو معزز ہیں لکھنے والے ہیں جو تم کرتے ہو وہ اس کو جانتے ہیں۔

۵۔ انسان کی حفاظت ونگرانی کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں:

لہ معقبات من بین یدیہ و من خلفہ یحفظونہ من امر اللہ (الرعد ع ۲)	انسان کے آگے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں جو اللہ کے حکم کے مطابق اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

۶۔ نیک کام کرنے والوں پر اللہ کی رحمت و بشارت فرشتوں کے ذریعہ نازل ہوتی ہے:

تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون۔ (فصلت ع ۴)	ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اترتے ہیں کہ نہ خوف کھاؤ نہ غم کرو اور اس جنت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

۷۔ بدکاروں پر ان کے ذریعہ اللہ کی لعنت اور اس کے عذاب کا نزول ہوتا ہے:

اولئک جزاءھم ان علیہم لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین۔ (البقرہ ع ۱۹)	ان لوگوں کی یہ سزا ہے کہ ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور انسانوں کی لعنت ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس ان کی قوم کے عذاب کے لئے فرشتے آئے تھے:

قالوا یلوط انا رسل ربک (ہود، ع ۷)	انھوں نے کہا اے لوط ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔

۸۔ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان سفارت کا کام ان کے سپرد ہے:

او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء (الزخرف ع ۵)	یا اپنا سفیر اللہ بھیجتا ہے اور اس کی اجازت سے جو اللہ چاہتا وہ وحی کرتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے:

فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ (البقرہ ۱۲)	جبریل (فرشتہ) نے قرآن اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر اُتارا۔

کائنات میں نورانی و مادّی دو قسم کی قوتیں

یہ اور ان کے علاوہ بہت سی آیتیں ہیں جن میں ملائکہ سے متعلق مختلف فرائض کا ذکر ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی طرح کائنات میں بھی دو قسم کی قوتیں کارفرما ہیں۔

۱۔ نورانی اور

۲۔ مادّی

مادّی کی نمائندگی مادّی اشیاء کرتی ہیں اور نورانی کی نمائندگی ملائکہ کرتے ہیں۔ پھر دونوں کے مجموعہ سے علل واسباب کا وہ سلسلہ وجود میں آتا ہے جس پر کائناتی نظام قائم ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مادّی علل واسباب پائے جانے کے باوجود شئے وجود میں نہیں آتی جس کو بخت واتفاق کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے حالانکہ کائنات میں علل واسباب کا اصول تسلیم کرنے کے بعد بخت واتفاق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ دراصل نورانی سبب کے نہ پائے جانے کا نتیجہ ہوتا ہے جس کو لاعلمی کی بنا پر بخت واتفاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مادّی اشیاء کے طبائع وخواص سے انکار نہیں، لیکن ان کے مؤثر ہونے کے لئے نورانی اسباب کا تعاون ضروری ہے۔ اور یہ تعاون بھی بالذّات کوئی حیثیت نہیں رکھتا جب تک اللہ کی مرضی ومشیت اس کے ساتھ نہ شامل ہو جس کے بغیر موانع کے انسداد کی کوئی شکل نہیں ہے۔ اس طرح فرشتوں کی تدبیر وتنظیم کے باوجود ہر شئے کا آخری سرا اللہ کے ہاتھ ہے اور شئے کے وجود میں آنے نہ آنے کی آخری تدبیر اسی کا حکم ہے:

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ — اللہ آسمان سے زمین تک ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ (السجدہ ع ۱)

اصل اللہ کی مرضی و مشیت اور حکم ہے

غرض علل واسباب کے مجموعہ میں نہ تنہا مادّی اشیاء کے طبائع وخواص مؤثر ہیں اور نہ نورانی مخلوق کا تعاون بالذّات مؤثر ہے بلکہ اصل اللہ کی مرضی ومشیت اور حکم ہے:

مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَہٗ وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (فاطر ع ۱)

اللہ لوگوں کے لئے جو رحمت کھول دے اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جو روک لے اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں وہی غالب اور حکمت والا ہے۔

انسانوں اور فرشتوں کی تدبیریں اللہ کی تدبیر کے منافی نہیں کہ یہ بھی اسی کے حکم و مشیت سے ہیں اور انھیں پر کائناتی نظام قائم اور علل و اسباب کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن ان تدبیروں کے پائے جانے کے باوجود اللہ کی حیثیت عضو معطل کی نہیں بلکہ اس کی شان یہ ہے:

یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (الرحمٰن ع ۲)

اس سے آسمان و زمین کے سب مانگتے ہیں وہ ہر دن ایک کام میں ہے۔

مرضی و مشیت اور حکم کی پہلے اطلاع غالباً ملاء اعلیٰ کو ہوتی ہے کائناتی نظام کے بہت سے گوشوں اور فیصلوں کی فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی جن کیلئے وہ وقت اللہ کے حکم و فیصلہ کے منتظر رہتے اور ان کے آجانے پر اپنی تدبیریں کرتے ہیں۔ حکم و فیصلہ کی پہلے اطلاع غالباً ملاء اعلیٰ (مجلس اعلیٰ) کو ہوتی ہے۔ جس کا ذکر قرآن حکیم میں ہے:

مَا کَانَ لِیَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓی اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ۝ اِنْ یُّوْحٰٓی اِلَیَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔ (ص ع ۵)

مجھے ملاء اعلیٰ کی کچھ خبر نہ تھی جب وہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے میرے پاس وحی صرف اس لئے آتی ہے کہ میں صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

دوسری جگہ ہے:

لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ۔ (الصفٰت ع ۱)

شیاطین ملاء اعلیٰ کی جانب کان بھی نہیں لگا سکتے اور ہر طرف سے دھکے دیے دیئے جاتے ہیں۔

ملاء اعلیٰ سے یہ مراد ہیں :

افاضل الملائکۃ ومقربوا الحضرۃ[1] بلند مرتبہ فرشتے اور مقربین بارگاہ۔

موقع کی مناسبت سے چند حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعلقہ آیتوں کی معنوی دلالت سے جو کچھ فرمایا اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ موقع کی مناسبت سے چند حدیثیں یہ ہیں۔ مثلاً :-

فرشتے نورانی مخلوق ہیں :

خلقت الملائکۃ من نور[2] فرشتے نور سے پیدا کئے گئے۔

فرشتے انسان کی شکل میں آ سکتے ہیں :

تیمثل لی الملک احیانا رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول فرشتہ کبھی میرے لئے انسان کی شکل اختیار کرتا ہے پھر وہ مجھ سے کلام کرتا اور اس کی گفتگو میں یاد کر لیتا ہوں۔

رأیت اللیلۃ رجلین اتیانی فقال الذی یوقد النار مالک خازن النار وانا جبرئیل وھذا میکائیل[3] میں نے رات دو آدمیوں کو دیکھا انھوں نے کہا جو آگ روشن کر رہا ہے وہ "مالک" دوزخ کا خازن ہے میں جبرئیل اور یہ میکائیل ہے۔

حکم وفیصلہ کے وقت ملائکہ کی کیفیت اللہ کے حکم وفیصلہ کے وقت فرشتوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے :

اذا قضی اللہ تعالیٰ الامر فی السماء ضربت الملائکۃ باجنحتہا خضعانا لقولہ کانہ جب اللہ آسمان میں کوئی حکم وفیصلہ کرتا ہے تو فرشتے اس کی طرف ہمہ تن گوش ہونے کے لئے اپنے بازوؤں کو پھڑ پھڑاتے

---

[1] ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغہ باب ذکر الملأ الاعلیٰ [2] مسلم کتاب الزہد باب فی احادیث متفرقہ۔

[3] بخاری ج ا کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ۔

صلصلة علی صفوان فاذا فزّع	ہیں اور اس سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے
عن قلوبھم قالوا ماذا قال ربّکم	جیسی زنجیر کو چکنے پتھر پر مارنے یا کھینچنے
قالوا الحق وھو العلی الکبیر ۵۴	سے پیدا ہوتی ہے پھر جب گھبراہٹ دور ہو جاتی

تو کہتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا جواب ملتا ہے کہ "حق بات" وہی بلند وبڑا ہے

دوسری جگہ ہے:

اذا قضی امرًا سبح حملة العرش	جب اللہ کوئی حکم و فیصلہ فرماتا ہے تو عرش
ثم یسبح اھل السماء الذین یلونھم	کے اٹھانے والے "سبحان اللہ" کہتے ہیں
حتی یبلغ التسبیح اھل ھذہ	پھر اُس آسمان والے سبحان اللہ کہتے ہیں جو
الدنیا ثم قال الذین یلون	ان سے قریب ہوتے ہیں یہاں تک کہ تسبیح
حملة العرش لحملة العرش ماذا	اس دنیا والوں تک پہنچتی ہے پھر وہ فرشتے
قال ربکم فیخبرونھم ماذا	جو عرش اٹھانیوالوں کے قریب ہوتے ہیں
قال فیستخبر بعض اھل السمٰوٰت	پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا
بعضا حتی یبلغ الخبر اھل ھذہ	پھر ایک دوسرے کو خبر دیتے ہیں یہاں تک
السماء ۵۵	کہ یہ خبر اس آسمان والوں تک پہنچتی ہے۔

اس حکم و فیصلہ اور گفتگو کا تعلق نورانی دنیا سے ہے جس کو قریب الفہم بنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ تعبیر اختیار کی، اصل حقیقت تک رسائی میں مادی دنیا کی مادی کثافت مانع ہے۔

حکم و فیصلہ کی بعض مثالیں — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریب الفہم بنانے کے لئے حکم و فیصلہ کی بعض مثالیں بھی بیان کی ہیں تشریعی امور میں، مثلاً:

---

۵۴ بخاری ج ۲ کتاب التفسیر سورہ سبا۔ ۵۵ مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۱۸ مطبوعہ مطبع میمنۃ مصر۔

قال فیم یختصم الملأ الاعلیٰ قلت فی الکفارات قال وما هن قلت مشی الاقدام الی الجماعات والجلوس فی المساجد بعد الصلوٰة واسباغ الوضوء حین الکریهات قال ثم فیم قال قلت فی الدرجات قال وماهن قلت اطعام الطعام ولین الکلام والصلوٰة والناس نیام [1]

ارشاد ہوا کس بات میں ملاء اعلیٰ گفتگو کر رہے ہیں میں نے کہا کفارات میں ارشاد ہوا وہ کیا ہیں میں نے کہا جماعت کی طرف جانا مسجدوں میں نماز کے بعد بیٹھنا ناگواریوں کے وقت وضو پورا کرنا ارشاد ہوا پھر کس میں گفتگو کر رہے ہیں میں نے کہا درجات میں ارشاد ہوا وہ کیا ہیں، میں نے کہا کھانا کھلانا گفتگو میں نرمی کرنا اور ایسے وقت نماز پڑھنا کہ لوگ سو رہے ہوں۔

تکوینی امور میں مثلاً:

ان اللہ اذا احب عبداً دعا جبرئیل علیه السلام فقال انی احب فلانا فاحبه قال فیحبه جبرئیل ثم ینادی جبرئیل فی السماء فیقول ان اللہ یحب فلانا فاحبوه فیحبه اهل السماء قال ثم یوضع له القبول فی الارض واذا ابغض اللہ عبداً دعا جبرئیل فیقول انی ابغض فلانا فابغضه قال فیبغضه جبرئیل ثم ینادی

اللہ جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرئیلؑ کو بلا کر کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، جبرئیلؑ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر وہ آسمان میں منادی کر دیتے ہیں کہ اللہ فلاں بندہ سے محبت کرتا ہے تم سب اس سے محبت کرو۔ آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر اس کی مقبولیت زمین میں پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ کسی بندہ کو ناپسند کرتا ہے تو جبرئیلؑ کو بلا کر کہتے ہیں

[1] مسند احمد بن حنبلؒ ج ۴ ص ۶۶ مطبع میمنیہ مصر۔

فی اھل السماء ان اللہ یبغض	کہ میں فلاں بندہ کو ناپسند کرتا ہوں تم
فلانا فابغضوہ قال فیبغضونہ	بھی اس کو ناپسند کرو جبرئیلؑ اس کو ناپسند
ثم توضع لہ البغضاء فی الارض[1]	کرنے لگتے ہیں پھر وہ آسمان میں منادی

کر دیتے ہیں کہ اللہ فلاں بندہ کو ناپسند کرتا ہے تم بھی اس کو ناپسند کرو۔ آسمان والے اس کو ناپسند کرنے لگتے ہیں پھر اس کے لئے ناپسندیدگی زمین میں پھیل جاتی ہے۔

شاہ ولی اللہ ملاء اعلیٰ میں حکم و فیصلہ سے متعلق کہتے ہیں:

ان ھنالک ینزل القضاء و	اس جگہ حکم و فیصلے نازل ہوتے اور وہ امور
یتعین الامر المشار الیہ بقولہ	متعین ہوتے ہیں جن کی طرف اشارہ
تعالیٰ "فیھا یفرق کل امر حکیم"	قرآن کی اس آیت "فیھا یفرق الخ" (اس
وان ھنالک یتقرر الشرائع بوجہ	مبارک رات میں حکمت پر مبنی امور تصفیہ
من الوجوہ[2]	پاتے ہیں) میں ہے اور ایک طرح سے اسی

جگہ شرائع کا تقرر ہوتا ہے۔

نورانی سبب کی طرف بعض اشارات ملائکہ کس کس طرح شے کے وجود میں نورانی سبب کا مقام حاصل کرتے ہیں؟ اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی کیونکہ اس کا زیادہ تعلق تکوینی امور سے ہے جن سے عدم واقفیت کائناتی نظام چلانے کے لئے ناگزیر ہے۔ قرآن و حدیث میں تعبیرات ایسی ہیں جن سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے مثلاً

۱۔ تائید غیبی

قرآن حکیم میں ہے:

---

[1] مسلم ج ۲ کتاب البر والصلۃ والادب باب اذا احب اللہ عبداً الخ

[2] ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغہ باب ذکر الملاء الاعلیٰ۔

ایدناہ بروح القدس	ہم نے عیسیٰؑ کی روح القدس کے
(البقرہ ع ۱۱)	ذریعہ مدد کی۔

"روح القدس" سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں، یا شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک کسی معاملہ میں افضل ترین ملائکہ کے اجماع کو تائید روح القدس سے تعبیر کیا جاتا ہے (غالباً اس اجماع کے سربراہ حضرت جبریلؑ ہیں)۔

ویسمّی اجماعھم المستمر	ان کے دوامی اجماع کو تائید روح القدس
بتائید روح القدس۔ [۱]	کا نام دیا جاتا ہے۔

اسی قسم کی تائید سے انبیاء علیہم السلام فیضیاب ہوتے تھے۔ جس کے ذریعہ بہت سی وہ خلاف عادت باتیں انبیاء سے ظاہر ہوتی تھیں۔ جن کو "معجزات" کہا جاتا ہے:

وتتم ھنالک برکات لم تعھد	اس جگہ بہت سی خلاف عادت برکتیں
فی العادۃ فسمی بالمعجزات [۲]	ظاہر ہوتی ہیں جن کا نام "معجزات" ہے

طائف کے واقعہ میں رسول اللہ سے پہاڑوں پر مامور فرشتہ نے کہا تھا:

ان شئت ان اطبق علیھم	اگر آپ چاہیں تو ان پر دو پہاڑیوں کو
الاخشبین	ملا دوں۔

رسول اللہ نے جواب میں فرمایا:

بل ارجوان یخرج اللہ عزوجل	(نہیں، بلکہ امید کرتا ہوں کہ اللہ ان کی
من اصلابھم من یعبد اللہ	نسل سے ایسے لوگ پیدا کر دے جو خالص
عزوجل وحدہ لایشرک بہ	اللہ کی عبادت کریں اور کسی کو اس کے
شیئاً [۳]	ساتھ شریک نہ کریں۔

[۱] ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغہ باب ذکر الملاء الاعلیٰ۔

[۲] بخاری ج ۱ کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکۃ۔

رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن فرمایا:

هذا جبرئيل اخذ براس فرسه عليه اداة الحرب [۱]	یہ جبرئیل ؑ ہیں جو گھوڑے کا سر پکڑے ہیں جس پر جنگ کا سامان ہے۔

۲۔ نصرت الٰہی۔

اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ [۲]	کیا تمہیں کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد کے لیے تین ہزار فرشتے اُتارے۔
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا [۳]	ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور وہ لشکر جس کو تم نے نہیں دیکھا۔

۳۔ فرشتوں کا تصرف

امالة الملك فايعاد بالخير و تصديق بالحق [۴]	فرشتہ کا تصرف امور خیر کی طرف رغبت دلانا اور حق کی تصدیق ہے۔

۴۔ فرشتوں کا بازو جھکانا۔

ان الملائكة تضع اجنحتها رضا لطالب العلم [۵]	فرشتے اپنے بازو طالب علم کی رضامندی کے لئے جھکا دیتے ہیں۔

۵۔ فرشتوں کی دعاء و بددعاء۔

ما من يوم يصبح العباد فيه الا وملكان ينزلان فيقول احدهما اللهم اعط منفقا خلفا ويقول الآخر اللهم اعط	ہر دن دو فرشتے اترتے ہیں جن میں سے ایک کہتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ روکنے والے کو ضیاع و حرمان سے

۱ـ بخاری ج ۲ کتاب المغازی باب شہود الملائکۃ بدرا ۲ـ آل عمران ع ۱۳ ۳ـ الاحزاب ع ۲
۴ـ ترمذی و مشکوٰۃ باب الوسوسۃ ۵ـ احمد و ابوداؤد و مشکوٰۃ کتاب العلم

مسکا تلفا [1] دوچار کر۔

شاہ ولی اللہؒ کے بیان سے مزید وضاحت	قرآن و حدیث میں اس قسم کی بہت سی باتیں فرشتوں کی طرف منسوب ہیں جن سے نورانی سبب کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ شاہ

ولی اللہ رحؒ نے بعض فرشتوں کے کچھ کام بتائے ہیں جن سے مزید وضاحت ہوتی ہے۔ مثلاً ملاء اعلیٰ کے ذکر میں ہے:

تتلقیٰ من ربہا استحسان النظام	اپنے رب سے وہ نظام صالح کا استحسان اور
الصالح واستہجان خلافہ [2]	غیر صالح کا استہجان حاصل کرتے ہیں۔

استحسان (مستحسن و اچھا سمجھنا) و استہجان (غیر مستحسن و بُرا سمجھنا) صرف زبانی نہیں بلکہ نظامِ عالم سے متعلق اللہ کی "پالیسی" حاصل کرکے اس کے مناسب تدبیریں کرتے اور دوسرے فرشتوں سے متعلق امور ان کے سپرد کرتے ہیں، پھر یہ فرشتے اس قسم کے کام انجام دیتے ہیں،

ویؤثرون فی بعض الاشیاء	یہ فرشتے بعض طبعی چیزوں کی حرکت دوگنی
الطبیعة فی تضاعیف حرکاتها	کرنے یا بدل جانے میں اثر کرتے ہیں جیسے
وتحولاتها کما اذا دحرج حجر	کوئی پتھر لڑھکتا ہے تو کسی معزز فرشتہ کے
فاثر فیہ ملک کریم عند ذلک فمشی	اثر سے اس کی حرکت عادت و معمول سے
فی الارض اکثر مما یتصور فی العادة	زیادہ تیز ہوجاتی ہے یا شکاری دریا میں
وربما القی الصیاد شبکتہ فی النھر	جال ڈالتا ہے تو فرشتے بعض مچھلیوں کے
فجاءت افواج من الملائکة	دل میں ڈالتے ہیں کہ اس میں آجاؤ اور
تلہم فی قلب ھذہ السمکة ان	بعض کے دل ڈالتے ہیں کہ نہ آؤ بعض کے
تقتحم وھذہ ان تھرب و	لئے رسّی کو سمیٹ دیتے اور بعض کے لئے
تقبض حبلاً وتبسط اخریٰ وھی	کشادہ کر دیتے ہیں۔ ان مچھلیوں کو یہ پتہ

---

[1] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب الانفاق و کراہیۃ الامساک [2] شاہ ولی اللہ حجۃ البالغہ باب فی ذکر الملاء الاعلیٰ

لا تعلم لم تفعل ذٰلك ولكن	کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں
تتبع ما الهمت ورتبما تقاتلت	وہ تو صرف الہام کے تابع ہوتی ہیں اسی
فئتان فجاءت الملائكة تزين	طرح دو فوجیں آپس میں جنگ کرتی ہیں تو
قلوب هذه الشجاعة والثبات	ایک کے دل میں بہادری ثابت قدمی اور
باحاديث وخيالات يقتضيها	غالب آنے کی تدبیروں کا القاء کرتے
المقام وتلهم حيل الغلبة و	ہیں اور ہتھیار وغیرہ میں مدد کرتے ہیں،
وتؤيد في الرمى واشباهه و	دوسری فوج کے دل میں ان باتوں کا
في قلوب تلك اضداد هذه	القاء کرتے ہیں جو پہلی کے خلاف ہوتی
الخصال ليقضى الله امرًا	ہیں تاکہ اللہ کے فیصلہ کی بات پوری ہوکر
كان مفعولا ورتبما كان الترشح	رہے۔ کبھی فرشتے انسان کو راحت و آرام
ايلام نفس انسانية او تنعيمها	یا رنج و تکلیف پہونچانے پر متعین ہوتے
فسعت الملائكة كل سعى وذهبت	ہیں جس میں وہ پوری سرگرمی دکھاتے اور
كل مذهب ممكن [1]	اور ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

ملائکہ اللہ کی مرضی و مشیت کے مکمل تابع ہیں مختلف کاموں میں نورانی سبب کی شکل اختیار کرنے کے باوجود فرشتوں کی حیثیت بس مشین کے پرزوں کو حرکت دینے والی قوت سے زیادہ نہیں ہے جس میں وہ اللہ کی مرضی و مشیّت کے حکم کے مکمل تابع ہیں خلاف ورزی و نافرمانی یا خود رائی و خود سری کا مادہ ہی ان میں نہیں ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

بل عباد مكرمون لايسبقونه	بلکہ اللہ کے وہ معزز بندہ ہیں جو بات میں اس پر
بالقول وهم بامره يعملون [2]	سبقت نہیں کرتے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں

---

[1] شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ باب ذکر الملاء الاعلیٰ [2] الانبیاء ۲

لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون (التحریم ۶)

اللہ ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے اس میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے۔

فرشتوں کی مذکورہ حیثیت متعین ہونے کے بعد اللہ کے ساتھ ان کی شرکت یا حکم و مشیت میں دخل اندازی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ان سے عبودیت و نیازمندی کا رشتہ قائم کیا جائے۔ پھر کائناتی نظام چلانے میں انسان کے ساتھ فرشتوں کی حیثیت معاون و مددگار کی ہے نہ کہ حاکم و فرمانروا کی، جیسا کہ خلافتِ آدم کے واقعہ میں آدم کے آگے سجدہ کرا کے پہلے ہی اس حقیقت کو ظاہر کر دیا گیا تھا۔ اس سے وہ ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں جن میں دنیا کی قومیں مبتلا تھیں اور کسی نہ کسی انداز میں ان کی پرستش کرتی تھیں۔ (باقی)

اسلام کا قانونِ وراثت

مولانا سید جلال الدین عمری

موجودہ دور میں اسلام کے جن سماجی اور معاشرتی مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ ان میں اس کا "قانونِ وراثت" بھی ہے۔ اسلام ایک خاص انداز سے خاندان کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے اپنا ایک تفصیلی نظام وضع کیا اور۔ قانونِ وراثت اسی کا ایک جزو ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے خاندان کی ساخت، افرادِ خاندان کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور ان کی نفسیات کو سمجھنا ہوگا اس کے بغیر اسلام کے "قانونِ وراثت" کی معنویت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

خاندان انسانی سماج کا سب سے قدیم اور بہت ہی اہم ادارہ ہے۔ اس کی شکلیں تو زمانہ اور حالات کے لحاظ سے بدلتی رہی ہیں۔ لیکن اس کا وجود ہمیشہ باقی رہا ہے خاندان سے انسان کی بعض بالکل ابتدائی اور بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ خاندان کا کوئی ایسا بدل آج تک وجود میں نہیں آیا جو ان ضرورتوں کو اس سے بہتر طریقہ سے پورا کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندان سے انسان کی وابستگی بھی مسلسل جاری ہے۔ وہ ماضی میں بھی اس سے اپنا تعلق توڑ نہیں سکا۔ اور شاید مستقبل میں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکے گا۔

خاندان سے انسان کے تعلق کی وجہ محض یہی نہیں ہے کہ وہ اس کا محتاج ہے۔

بلکہ اس تعلق کی نوعیت جذباتی بھی ہے ۔ وہ اس کی ایک سماجی ضرورت بھی ہے ۔ اور اس کی فطرت کا تقاضا بھی ۔ انسان کو اپنے خاندان سے بے پناہ محبت ہوتی ہے اور وہ اس سے غیر معمولی قُرب محسوس کرتا ہے ۔ غیروں کے درمیان اس کو اجنبیت کا جو احساس ہوتا ہے ۔ خاندان والوں میں پہونچ کر اس کا یہ احساس ختم ہوجاتا ہے ۔ ان کی موجودگی اس کی خوشی میں اضافہ کا سبب بنتی ہے اور ان کی جدائی اس کو دل گیر اور مغموم بنا دیتی ہے ۔ خاندان سے اس کو اتنی شدید وابستگی ہوتی ہے کہ اس سے اس کو بڑے سے بڑا صدمہ اور تکلیف بھی پہونچ جائے تو بالعموم اس سے وہ اپنا تعلق توڑنا پسند نہیں کرتا ۔

افرادِ خاندان کے درمیان ایک طرح کا " معاہدہ " ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں کام آئیں گے اور ان کے معاون اور مددگار ہوں گے ۔ ان کے بڑے ان کے چھوٹوں کی پرورش اور دیکھ بھال کریں گے ۔ اور ان کے چھوٹے ان کے بڑوں کی تعظیم اور خدمت بجا لائیں گے ۔ خاندان کے نفع و نقصان کو اس کا ہر فرد اپنا نفع و نقصان سمجھے گا اور خاندان کو فائدہ پہنچانے اور اسے نقصان سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا ۔ یہ معاہدہ گو الفاظ کی شکل میں موجود نہیں ہوتا لیکن خاندان کا ہر فرد اس سے واقف ہوتا ہے ۔ اور اس کی پابندی کو ضروری سمجھتا ہے ۔ جب کبھی اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے ۔ تو اس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے ۔ اور اس پر تنقید کی جاتی ہے

خاندان سے اپنے فطری تعلق کی بنا پر انسان افرادِ خاندان کی خدمت کرتے ہوئے اور ان پر اپنی دولت صرف کرتے ہوئے ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنی ذات پر خاندان والوں کو ترجیح دیتا ہے ۔ اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھتا ہے ۔ اس کے پیچھے کوئی خارجی دباؤ نہیں ہوتا ۔ بلکہ خاندان سے تعلق اور اس سے محبت اس کو اس پر مجبور کرتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی معاشی

سماجی اور سیاسی جدوجہد کے پیچھے اس کا ذاتی مفاد پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کی ضروریات پوری کرے اس کے لئے غذا، لباس، مکان اور آسائش و آرام کا سامان فراہم کرے۔ اسے سماجی لحاظ سے اوپر اٹھائے۔ اور اس کو خوشحال اور ترقی یافتہ دیکھے۔ یہ جذبہ نہ ہو تو اس کی دوڑ دھوپ کا ایک بڑا محرّک ختم ہو جائے گا۔ اور اس کی کوششیں مدھم پڑ جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندان کی فلاح و بہبود اس کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ وہ دونوں کو بالعموم ایک سمجھتا ہے۔ اور ان میں بہت کم فرق کرتا ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ خاندان کے تمام افراد سے انسان کا یکساں تعلق نہیں ہوتا۔ جو افراد اس سے فطری طور پر بہت ہی قریب ہوتے ہیں اور عملاً جن کا تعاون اس کو سب سے زیادہ حاصل ہوتا ہے ان سے اس کا تعلق بھی غیر معمولی ہوتا ہے اس کے برعکس جو افراد اس سے جس قدر دور ہوں اس کا تعلق بھی ان سے اتنا ہی کم ہوتا ہے۔ اپنے اسی تعلق کی بنیاد پر وہ خاندان کے افراد کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ دور کے افراد کے مقابلہ میں قریب کے افراد سے اس کو محبّت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور وہ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک بھی کرتا ہے۔

انسان کے ان ہی فطری جذبات پر اسلام نے خاندانی نظام کی بنیاد رکھی ہے، اس نے اہلِ خاندان کے ساتھ حسنِ سلوک کی بے حد تعریف کی۔ اور اس کو ایک بڑی اخلاقی خوبی قرار دیا کہ انسان اپنے گھر والوں کے دُکھ درد میں کام آئے۔ اور ان کی ضروریات پوری کرے۔ جس شخص میں یہ وصف نہ ہو اور جو اپنے قریب ترین افراد کو بھول جائے۔ اس کی شدید مذمّت کی۔ اور اس کو سخت گناہ گار ٹھہرایا۔

کسی بھی نظام کو وجود میں لانے کے لئے محض اخلاقی تعلیم کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ قانون کی قوّت بھی درکار ہوتی ہے۔ تاکہ اس کی خلاف ورزی سے روکا جا سکے۔

اس میں شک نہیں کہ خاندان کا تعاون انسان کی فطرت میں داخل ہے ۔ اور وہ قانون کی سختی کے بغیر بھی بالعموم اس پر عمل کرتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اوقات وہ اپنے اس فطری داعیہ پر عمل نہیں کرپاتا بلکہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت کر بیٹھتا ہے ۔ اسی وجہ سے اسلام نے ترغیب و تشویق ہی سے نہیں بلکہ قانون کے زور سے بھی انسان کو اس بات کا پابند بنایا کہ وہ اپنے خاندان والوں کا تعاون کرے ۔ اور ان کی ضروریات کی تکمیل کا بوجھ اٹھائے ۔ والدین اور اولاد کا تعلق اس کی ایک واضح مثال ہے ۔ یہ تعلق بالکل فطری ہے ۔ اور انسان بغیر کسی خارجی دباؤ کے اولاد کی پرورش اور خدمت اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ ان قریب ترین افراد کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اسلام نے اخلاقی ہدایات کے ساتھ قانون کے ذریعہ بھی والدین اور اولاد کے حقوق محفوظ کردئے ہیں تاکہ نہ تو والدین کو اولاد نقصان پہنچا سکے اور نہ اولاد کو والدین کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے[1]

ٹھیک یہی نوعیت وراثت کی ہے ۔ وراثت انسان کی فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے ۔ اسلام نے اس فطری تقاضے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی آزادی نہیں دی بلکہ اپنے ماننے والوں کو قانون کے ذریعہ اس کا پابند بنا دیا۔ یہاں ہم پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وراثت انسانی فطرت کا کوئی مطالبہ ہے یا نہیں ۔ پھر اس

---

[1] ۔ بعض لوگ اس بات کا انکار کرسکتے ہیں کہ خاندان انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ موجودہ مغربی سماج نے اس کا جواب دے دیا ہے ۔ مغرب کا انسان اپنی کج فکری اور غلط روی کے باعث خاندان کے شیرازہ کو منتشر کر کے جس طرح سکون اور چین سے محروم ہوچکا ہے ۔ اس کے بعد خاندان کی ضرورت سے انکار کرنا آسان نہیں ہے ۔

کے بعد وراثت سے متعلق اسلام کی تعلیمات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے اور مشاہدہ اس کی تائید کرتا ہے کہ انسان اپنے کنبہ اور خاندان ہی کو اپنا جائز وارث تصور کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں جس طرح اپنے مال و دولت میں غیروں کا حق تسلیم نہیں کرتا اسی طرح وہ اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی دولت ان افراد کے ہاتھوں میں چلی جائے جن کو وہ اجنبی اور غیر تصور کرتا ہے۔ انسان کے اندر ملکیت کا بہت شدید احساس پایا جاتا ہے۔ اس احساس کو نہ تو نکالا جا سکا ہے۔ اور نہ کسی طرح نکالا جا سکتا ہے۔ یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ جو چیز اس کی ملکیت میں ہے اور جس دولت اور سرمایہ کو اس نے محنت اور مشقت سے حاصل کیا ہے اور جس کا وہ جائز حقدار ہے اس پر زندگی بھر اس کا قبضہ رہے۔ اور اس کے بعد یہ ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جو زندگی میں سب سے زیادہ اُس سے قریب تھے اور جن کو وہ اپنا عزیز اور رشتہ دار تصور کرتا تھا اس کے بغیر اس کے احساسِ ملکیت کی تسکین نہیں ہوتی۔ اس تصوّر ہی سے اس کو سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ کہ جن چیزوں کا آج وہ مالک ہے کل وہ غیروں کے قبضہ میں چلی جائیں گی۔

پھر یہ بھی انسان کی خواہش ہوتی ہے اور اس خواہش کو غلط بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی زندگی میں وہ جن افراد سے قریب رہا اور جو اس کے قریب رہے، جن سے وہ محبت کرتا تھا اور جو اس سے محبت کرتے تھے جن کا معاشی بوجھ وہ اٹھائے ہوئے تھے۔ اور جو اس کی معاشی تگ و دو میں مدد کر رہے تھے، جن کے دُکھ درد کو وہ اپنا دکھ درد سمجھتا تھا اور جو اس کے دُکھ درد میں شریک تھے، اس کے مرنے کے بعد وہ دوسروں کے محتاج اور دست نگر نہ ہو جائیں اور اس کی دولت و سرمایہ ان کی آسائش و راحت پر اس طرح صرف ہو جس طرح اس کی زندگی میں صرف ہوتا رہا۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس نے ان کی ترقی اور کامیابی کے لئے جو کوششیں شروع کی ہیں وہ اس کے اس دُنیا سے اُٹھتے ہی ختم نہ ہو جائیں۔ اس کا کاروبار بند نہ ہو جائے۔ اس کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔ ان کی ترقی کے امکانات مسدود نہ ہو جائیں

وراس نے ان کے لئے جس مکان کی تعمیر کا آغاز کیا ہے وہ ادھورا نہ رہ جائے ۔ اس
لئے اس کی دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس کے بعد بھی اس کے یہ کام جاری رہیں
س سے اس کی ایک فطری خواہش کی تکمیل ہوگی ۔ اور وہ اس اطمینان کے ساتھ دنیا
سے جائے گا کہ اس کی دولت اس کے جائز مستحقین ہی کے فلاح و بہبود پر صرف ہوگی ۔
انسان کے عزیزوں کی فلاح و بہبود کا کام کسی ادارہ کے ذریعہ بھی انجام دیا جاسکتا ہے
لیکن اگر وہ خود اس کے لئے کسی کا انتخاب کرے ــــ اور اسی کو فی الواقع اس کا
ق ملنا بھی چاہئے ــــ تو وہ اپنے عزیز و اقارب ہی کا انتخاب کرے گا ۔ ان کے ہوتے
ہوئے وہ کسی دوسرے شخص یا ادارہ کو جب تک کہ کوئی بڑی رکاوٹ نہ ہو، ترجیح نہیں
ے سکتا ۔ اس کے کئی اسباب ہیں ۔ ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے عزیزوں ہی کو اپنی دولت
ا جائز حق دار سمجھتا ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے خویش و اقارب پر جو اعتماد
ہوتا ہے وہ دوسروں پر نہیں ہوتا ۔ اس لئے وہ اپنی دولت کو اُن کے حوالہ کرتے ہوئے
اطمینان محسوس کرتا ہے ۔ تیسری وجہ خالص نفسیاتی ہے ۔ جو کام اس کے عزیزوں
اور قرابت داروں کے ذریعہ انجام پائے ۔ اس کو وہ اپنا ہی کام تصور کرتا ہے ۔
لیکن اگر یہی کام دوسرے انجام دیں تو وہ اس کو اپنا کام نہیں سمجھتا ۔ بلکہ غیر متعلق
لوگوں کا کام سمجھتا ہے ۔ اس کے ادھورے کاموں کو اس کی اولاد اور اس کے
بھائی بند جاری رکھیں تو یہ اس کے نزدیک اس کے اپنے ہی کاموں کا تسلسل ہوتا ہے
لیکن اگر یہی کام دوسرے افراد انجام دیں تو اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے
اپنے ہی کاموں کا تسلسل ٹوٹ گیا اور غیروں کے ہاتھوں میں چلا گیا ۔ وراثت کی بنیاد
انسان کا یہی فطری احساس ہے ۔

وراثت کے تصور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی نوعیت بالکل ایسی ہے ۔
جیسے کسی کو راہ چلتے کوئی خزانہ ہاتھ آجائے ۔ یا لاٹری میں کوئی چیز مل جائے ۔ اس کا

تعلق آدمی کی محنت اور صلاحیت سے نہیں ہوتا بلکہ بُخت و اتفاق سے ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک مالدار شخص کی اولاد لازماً مالدار ہوگی اور ایک غریب شخص کا بچہ غریب ہی ہوگا۔ حالانکہ غریب یا مال دار گھرانے میں پیدا ہونا محض ایک اتفاقی واقعہ ہے۔ کسی کا اختیاری عمل نہیں ہے۔

یہ اعتراض مختلف پہلوؤں سے صحیح نہیں ہے

(۱)۔ اگر وراثت محض اس لئے قابلِ اعتراض ہے کہ وہ بُخت و اتفاق سے ملتی ہے تو فی نفسہ یہ بات بھی قابلِ اعتراض ہونی چاہئے۔ کہ کوئی بچہ دولت مند گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے بے شمار سہولتوں کا مستحق ہو جائے۔ اور ایک مفلس خاندان کا بچہ ان سب سے محروم رہے جب کہ کسی بچہ کا غریب یا امیر گھرانے میں پیدا ہونا محض اتفاق ہی ہے۔

(۲)۔ وراثت کے بارے میں یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ وہ بُخت و اتفاق ہی سے حاصل ہونے والی دولت ہے۔ ایک شخص کی دولت میں بالعموم اس کے بیوی بچوں، ماں باپ اور اہلِ خانہ کی کوششوں اور تعاون کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ تعاون کبھی روپیہ پیسہ، دوڑ دھوپ اور محنت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور کبھی محبت اور ہمدردی، ہمت افزائی اور غم گساری کی شکل میں ہوتا ہے۔ آدمی کو اپنے عزیزوں سے چاہے ٹھوس مادّی تعاون حاصل نہ بھی ہو لیکن یہ اخلاقی تعاون ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کم نہیں ہے بلکہ آدمی کی ترقی کے لئے یہ بہت ضروری ہے اس کے بغیر وہ آسانی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

(۳)۔ وراثت کا تعلق صرف مال و دولت ہی سے نہیں بلکہ اور بھی بہت سی چیزوں سے ہے۔ ہر بچّہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ اور خاندان والوں کی شکل و صورت، رنگ روپ اور قد و قامت بھی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور ان کی ذہانت

اور کند ذہنی، ان کے اخلاق و عادات، ان کی قوتیں اور صلاحیتیں، ان کی کمزوریاں اور خوبیاں بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جس طرح یہ ایک طبعی حقیقت ہے کہ ایک ذہین اور باصلاحیت آدمی کی اولاد ذہین اور باصلاحیت ہوتی ہے۔ تندرست و توانا آدمی کے بچے تندرست و توانا پیدا ہوتے ہیں۔ مریض اور کمزور ماں باپ کی اولاد کمزور اور بیمار ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ ایک سماجی حقیقت ہے کہ دولت مند آدمی کے گھر پیدا ہونے والا دولت مند اور غریب شخص کا بچہ غریب ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز ناپسندیدہ ہے تو سب سے پہلے غربت اور امارت کو مٹا کر تمام انسانوں کے درمیان کامل مساوات پیدا کرنی ہوگی جو شاید عملاً ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص وراثت میں ملنے والی بے شمار خوبیوں کے ساتھ میدان میں آتا ہے۔ اور غیر معمولی کارنامے انجام دے جاتا ہے۔ جب تک اس کے کسی اقدام سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے اسے نہ تو ظلم کہا جاتا ہے اور نہ اس پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ اس لئے یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کو اس کے ماں باپ کی دولت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے جبکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

(۴)۔ وراثت میں ملنے والی دولت یا کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونا ہی انسان کی ترقی کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص مادی سہولتوں کے نہ ہونے کے باوجود اعلیٰ مدارج پر پہنچ گیا۔ اور دوسرا شخص تمام آسانیوں کے ہوتے ہوئے کبھی ترقی نہ کر سکا۔ اور زوال کا شکار ہوگیا۔ آدمی کی ترقی اور تنزلی یا بننے اور بگڑنے کا واحد سبب ماں باپ سے ملنے والا ورثہ ہی نہیں ہے بلکہ اس ورثہ سے زیادہ دوسرے عوامل اس میں کام کرتے ہیں۔

(۵)۔ وراثت قدرت کا ایک لچک دار قانون ہے۔ آدمی اپنے عزم و حوصلہ جدوجہد، محنت اور ماحول کے تعاون سے جس طرح اپنی کمزوریوں کو دور کر سکتا اور

فطری صلاحیتوں کو جِلا دے سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی خراب معاشی حالت کو بھی بدل سکتا ہے اور اپنی غفلت اور کوتاہی اور ماحول کے عدم تعاون سے جس طرح اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی بہترین معاشی حالت کو بھی بگاڑ سکتا ہے۔ یہ دراصل ریاست اور پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسان کو صحیح رُخ پر لگائے۔ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع فراہم کرے اور ایسے حالات پیدا کرے کہ وہ آسانی سے ترقی کر سکے۔

اِن اسباب کی بنیاد پر اسلام آدمی کے مال و دولت کا اس کے اہل خاندان کو جائز وارث تصور کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ہر شخص کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی تمام سہولتیں اور آسانیاں بھی فراہم کرتا ہے۔ ایک اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ داری قبول کرتی ہے کہ وہ انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرے گی۔ اور کسی بھی شخص کو اس حال میں نہیں چھوڑے گی کہ وہ کارخانہ اور جائیداد کا وارث نہ ہونے کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے اور ترقی کی راہیں اس پر بند ہو جائیں۔

اسلام کے آنے سے پہلے عرب میں وراثت کا رواج تھا اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا لیکن اس میں بڑی ناانصافیاں اور بے اعتدالیاں پائی جاتی تھیں۔ اسلام نے اِن سب کی اصلاح کی اور اس کو ایسی معتدل اور مبنی بر انصاف شکل عطا کی کہ وہ ہر دور میں اور ہر سوسائٹی کے لئے موزوں ترین قانون بن گیا۔ اور اس میں ابدیت کی شان پیدا ہو گئی۔ اس قانون کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے عرب جاہلیت کے تصورِ وراثت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اس میں کیا اصلاحات کیں۔ اس کے عدمِ توازن کو کس طرح توازن سے بدلا اور وقتی اثرات سے اس کو کیسے آزاد کر کے قیامت تک کے لئے ناقابل ترمیم و تنسیخ بنا دیا۔

دورِ جاہلیت میں وراثت کی حسب ذیل بنیادیں تھیں[1]

۱۔ حسب و نسب : انسان کے نسبی رشتہ دار اس کے وارث ہوتے تھے۔ لیکن نابالغ

---

[1] ۔۔ اس موضوع پر امام ابوبکر جصاص رح نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ احکام القرآن ۲/۹۲۔۹۳ ہم نے مزید

باقی حاشیہ صـ۹۳ پر

بچوں اور عورتوں کا وراثت میں کوئی حق نہیں تھا۔ چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ وراثت میں عمر کا خیال رکھا جاتا۔ جو سب سے بڑا ہوتا وہ سب سے زیادہ وراثت کا مستحق ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔

لا یعطون المیراث الا من قاتل ویعطونه الاکبر فالاکبر[۱]

وہ صرف لڑنے والوں کو میراث دیتے۔ وہ سب سے بڑے کو میراث دیتے اس کے بعد اس سے چھوٹے کا حق ہوتا۔

ابنِ زید کہتے ہیں۔

کان النساءُ لا یرثن فی الجاهلیة من الاباءِ وکان الکبیر یرث ولا یرث الصغیر[۲]

جاہلیت میں باپ کے مال میں عورت وارث نہیں ہوتی تھی۔ بڑا بچہ وارث ہوتا اور چھوٹا وارث نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ دوسری بنیاد تھی تبنیت : اس کا مطلب ہے کسی دوسرے شخص کے بچہ کو اپنا بچہ بنا لینا۔ عرب کے رواج کے مطابق یہ بہت بڑا اقدام تھا اس لئے کہ جس بچہ کو اپنایا جاتا (متبنّٰی) اس کو حقیقی اولاد کے حقوق حاصل ہو جاتے۔ وہ اسی شخص کی طرف منسوب ہوتا جس نے اُسے اپنا بچہ بنایا ہے۔ اور اس کے مال و جائیداد کا بھی وہ وارث ہوتا۔ اسی طرح متبنّٰی کا انتقال ہو جاتا تو اس کا حقیقی باپ اس کا وارث نہ ہوتا۔ بلکہ یہ مجازی باپ وارث ہوتا حضرت عائشہؓ دورِ جاہلیت کی اس رسم کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

بقیہ حاشیہ صـ۹۳ :۔

تفصیلات اور ضروری باتوں کے حوالے دوسرے مآخذ سے بھی فراہم کر دئے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا :۔

[۱]۔ ابن جریر : تفسیر جزو ۴ / ۱۷۱۔ یہی روایت ابن کثیر نے ابن ابی حاتم سے بھی نقل کی ہے۔ تفسیر ۱ / ۴۵۸

[۲]۔ ابن جریر : تفسیر ۴ / ۱۶۳

وکان من تبنّیٰ رجلاً فی الجاھلیۃ دعاہ الناس الیہ وورث میراثہ[1]

جاہلیت میں جو شخص کسی کو اپنا متبنیٰ بنا لیتا لوگ اُسے اسی کی طرف منسوب کرتے اور وہ اس کی میراث کا وارث ہوتا۔

اسلام سے پہلے ہی کا یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نے حضرت زید بن حارثہ رضؓ کو اپنا متبنیٰ بنایا تو کعبہ میں حجرِ اسود کے پاس انھیں لے گئے۔ اور وہاں جو لوگ موجود تھے ان کے درمیان اعلان فرمایا

اشھدوا ان زیداً ابنی یرثنی وارثہ

گواہ رہو کہ زید میرا بیٹا ہے۔ وہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔

چنانچہ اس کے بعد زید ابن حارثہ۔ رضی اللہ عنہ۔ کو زید بن محمد۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کہا جانے لگا[2]۔

اسی طرح اسود بن عبد یغوث نے مقداد بن عمرو۔ رضی اللہ عنہما۔ کو اپنا متبنیٰ بنایا تو وہ مقداد بن اسود بن گئے[3]۔

تیسری بُنیاد تھی "معاہدہ" اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ دو اجنبی اشخاص جن کے درمیان کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا تھا۔ باہم ایک معاہدہ کے ذریعے کچھ باتوں کے پابند ہو جاتے تھے۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہوتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی وراثت میں بھی حقدار ہوں گے۔ اس معاہدہ کا سوسائٹی میں اعلان ہو جاتا اور جس کا بھی انتقال ہوتا اس کے خاندان کے لوگ اس معاہدہ کا احترام کرتے۔ معاہدہ اسی قسم کا ہوتا تھا۔

دمی دمک وھدمی ھدمک وترثنی وارثک وتطلب بی واطلب بک[4]

میرا خون تمہارا خون ہوگا۔ میری قبر وہیں ہوگی جہاں تمہاری قبر ہوگی۔ تم میرے وارث ہوگے اور میں تمہارا وارث ہوں گا۔ تم میرے خون (دیت) کا مطالبہ کروگے اور مجھے تمہارے خون (دیت) کے مطالبہ کا حق ہوگا۔

---

[1] بخاری کتاب النکاح، باب الاکفاء فی الدین۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب من حرم بہ [2] ابن عبد البر: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ تذکرہ زید بن حارثہ ص۵۳ [3] حوالہ سابق۔ [4] باقی حاشیہ ص۹۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جاہلیت میں اس طرح کے معاہدہ کی بنیاد پر آدمی چھٹے حصہ (۱/۶) کا حقدار ہوتا تھا[۱]۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص (آزاد کردہ غلام) سے اس طرح کا معاہدہ کیا تو اس کے انتقال کے بعد اس کی وراثت میں آپ کو حصہ ملا[۲]۔

اسلام نے اپنی دعوت کے شروع میں عرب کے رسوم ورواج سے بالعموم تعرض نہیں کیا اور اپنی ساری قوت بگڑے ہوئے عقائد کو ٹھیک کرنے اور دین کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں صرف کیا۔ چنانچہ اسلام کے آنے کے بعد وراثت کے معاملہ میں بھی ایک عرصہ تک عرب کے طریقوں ہی پر عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہجرت کا مرحلہ پیش آیا۔ اور وہ لوگ جو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے طرح طرح کے ظلم وستم برداشت کر رہے تھے۔ اپنے خویش واقارب اور وطن کو چھوڑ کر مدینہ پہنچنے لگے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی آبادکاری کا تھا۔ اس کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکالا کہ مدینہ کی مسلم آبادی اور مہاجرین کے درمیان "مواخات" قائم کردی۔ اور وہ ایک دوسرے کے بھائی بنادئے گئے۔ یہ مواخات بڑے دوررس نتائج کی حامل تھی۔ اس کے نتیجہ میں وہ ایک دوسرے کے وارث بھی قرار پائے۔

محمد بن زید کہتے ہیں۔

کان النبی قد آخی بین المھاجرین والانصار — نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے شروع میں

(حاشیہ صفحہ ۹۴) [۱] جصاص ۹۱/۲، مختلف راویوں نے معاہدہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان میں تھوڑی سی کمی بیشی پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خاص الفاظ کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاہدہ کے شرائط بدلتے رہتے ہوں لیکن حق وراثت غالباً معاہدہ میں ضرور شامل ہوتا۔ اس لئے کہ جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں ان میں اس کا ذکر ہر جگہ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو، ابن جریر ۳۲/۵ حاشیہ صفحہ ۹۵ [۱] علی المتقی الہندی، کنز العمال ۸۲/۱۱ - [۲] حوالہ سابق - ابن جریر ۳۲/۵ ۵۳ - جصاص، احکام القرآن ۹۱/۲

اول ما کانت الصحبۃ وکانوا علی ذلک[1] — مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرادی تھی اور وہ اس بنیاد پر ایک دوسرے کے وارث ہوئے تھے۔

یہ پس منظر تھا جس میں اسلام کا قانونِ وراثت نازل ہوا۔ اس نے یکلخت جاہلیت کے تمام طریقوں کو منسوخ نہیں کیا بلکہ بتدریج ان میں اصلاح کی اور وراثت کے جو غلط اور غیر فطری طریقے تھے۔ ان کو ختم کر کے صحیح اور بالکل فطری ضابطے وضع کئے۔

جاہلیت میں عورتوں اور چھوٹے بچوں کو اس لئے وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا کہ وہ کمزور اور دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ ان کی منطق یہ تھی کہ وراثت کا حقدار وہی شخص ہو سکتا ہے جو دشمن کا مقابلہ کر سکے اور جنگ میں اس سے مالِ غنیمت چھین سکے۔ عورتوں اور بچوں کیلئے اپنی مدافعت بھی مشکل ہے۔ اور دوسروں کو ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے وہ وراثت کے حقدار نہیں ہوتے تھے۔ ابن جریر جاہلیت کے اس دستور کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ان اھل الجاھلیۃ کانوا لایقسمون میراث المیت لاحد من ورثتہ بعدہ ممن کان لا یلاقی العدو ولا یقاتل فی الحروب من صغار ولدہ ولا النساء منھم وکانوا یخصون بذلک المقاتلۃ دون الذریۃ[2]

اہل جاہلیت مرنے والے کے وارثوں میں سے بچوں کو جو دشمن کا سامنا نہیں کرتے اور جنگ میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ اور عورتوں کو اس کی میراث میں سے حصہ نہیں دیتے تھے بلکہ خاص طور پر لڑنے والوں کو میراث دیا کرتے تھے، بچوں کو اس سے محروم رکھتے تھے۔

اسلام کے آنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک عورت وراثت سے محروم رہی۔ اور بعض اوقات اس حکم کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت بھی کی گئی۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ سعد بن ربیع جنگِ احد میں شہید ہو گئے۔ تو انھوں نے جو مال چھوڑا تھا اسے اُن کے بھائی نے لے لیا۔ (اس لئے کہ ان کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی)، حضرت سعد بن ربیع کی بیوی ان کی دو بچیوں کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور عرض کیا حضورؐ! آپ کو معلوم ہے کہ سعد شہید ہو گئے۔ یہ اُن کی

---

[1] طبری: تفسیر ۲۱/۶۲ [2] طبری: تفسیر ۴/۱۸۱

بچیاں ہیں۔ انھوں نے جو کچھ مال چھوڑا تھا۔ اس پر ان کے چچا نے قبضہ کرلیا۔ ان کی شادی کے لئے پیسہ چاہئے۔ اس کے بغیر شادی نہیں ہوسکتی۔ (اب بتائیے میں کیا کروں؟) حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد احکام میراث نازل ہوئے اور لڑکیوں کا حصہ متعین ہوا[1]۔

اسی طرح اوس بن ثابتؓ کا انتقال ہوا تو ان کے پس ماندگان میں ان کی بیوی ایک کم سن لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان کی وراثت پر ان کے بھتیجوں نے قبضہ کرلیا۔ اور ان کے بیوی بچوں کو اس میں کوئی حصہ نہیں ملا۔ اوس ابن ثابتؓ کی بیوی نے ان کے بھتیجوں سے درخواست کی کہ وہ کم از کم ان لڑکیوں سے شادی کرلیں۔ لیکن چونکہ وہ خوبصورت نہیں تھیں اس لئے یہ دونوں اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو عرب کے دستور کے مطابق ان دونوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ میراث کے حقدار کیسے ہوسکتے ہیں۔ جو نہ تو گھوڑے پر سوار ہوسکتے ہیں نہ دشمن کا مقابلہ کرسکتے اور نہ کسی کا معاشی بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی کہ آدمی کے مال میں مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ جب تک تفصیلی احکام نہ آجائیں۔ وہ میراث میں سے کوئی چیز نہ لیں[2]۔

زمانۂ جاہلیت کا یہ طریقہ سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی تھا۔ یہ بات انسان کی عقل اور

---

[1] ترمذی: ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث البنات، ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الصلب ابوداؤد کی ایک روایت میں سعد بن ربیع کی لڑکیوں کو ثابت بن قیس کی لڑکیاں کہا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ خود امام ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ ایک راوی حدیث بشر بن مفضل کی چوک ہے اس لئے کہ جنگ احد میں حضرت سعد بن ربیع شہید ہوئے تھے۔ اور ثابت بن قیس کی شہادت جنگ یمامہ میں ہوئی تھی۔

[2] اس واقعہ کی ایک تو تفصیلات میں بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ بغوی: معالم التنزیل تفسیر سورۂ نساء آیت روح المعانی ۴/۲۱۰) دوسرے اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ کون شخص تھا جس (باقی حاشیہ ص ۹۸ پر)

اس کی فطرت کے بالکل خلاف ہے کہ وراثت کے حقدار صرف مرد ہوں اور عورتیں نہ ہوں۔ لڑکے وراثت میں حصہ پائیں اور لڑکیوں کو حصہ نہ ملے، کم زور محروم رہیں ۔ اور طاقت ور دوسرے کا بھی حق مار کھائیں ۔ حالانکہ عقل کا صریح تقاضا یہ ہے کہ جو کمزور ہو اس کو ہمدردی اور تعاون کا زیادہ مستحق سمجھا جائے ۔ اس کے حق کی زیادہ حفاظت کی جائے ۔ اور اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کو کسی حال میں روا نہ رکھا جائے ۔ حیرت ہوتی ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ اور خاندان کے سربراہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اتنے بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے اور اس کے خلاف کوئی ردِ عمل تو درکنار کوئی نفرت کا جذبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا[1]۔

اہلِ عرب کے نزدیک عورتوں اور بچوں کا وارث نہ ہونا اس قدر مسلم تھا کہ قرآن مجید میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷)

کی وراثت زیر بحث تھی ۔ اسی طرح کسی روایت میں کہا گیا ہے کہ مرنے والے کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا کسی روایت میں تین لڑکیوں کا ذکر ہے ۔ ابن جریر کی ایک روایت میں پانچ لڑکیاں بتائی گئی ہیں ۔ (۴/ ۱۶۱)۔ ابن جریر کی ایک اور روایت میں شکایت کرنے والی خاتون کا نام "ام کجلہ" کہا گیا ہے ۔ جس کی صرف ایک لڑکی تھی ۔ ان کے شوہر ثعلبہ کے انتقال کے بعد ان کے بھائی یعنی لڑکی کے چچا نے وراثت پر قبضہ کر لیا تھا ۔ (۴/۱۶۳) مرنے والے کے بھتیجوں کے نام کسی روایت میں قتادہ، عرفطہ اور کسی میں سوید، عرفطہ بتائے گئے ہیں ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ۔ ابن حجر: الاصابہ فی تمییز الصحابہ، تذکرہ اوس بن ثابت ۱/ ۸۰ ۔ نیز تذکرہ ام کجلہ ۴/ ۴۸۷، ۴۸۸

حاشیہ صفحہ ہذا:

[1] دورِ جاہلیت کے ایک شخص عامر بن جشم کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے اپنی لڑکی کو نہ صرف یہ کہ وراثت میں حصہ دیا بلکہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ۔ اور مساوات برتی ۔ (ابن حجر: فتح الباری ۱۲/ ۱۱) یہ واقعہ ہو یا اس نوعیت کا کوئی اور واقعہ ان کی حیثیت شاذ و نادر واقعات کی تھی ۔ یہ کوئی عمومی ردِ عمل نہیں تھا ۔

جب میراث کے احکام نازل ہوئے اور مردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے بھی حقوق بیان ہوئے تو بہت سے لوگوں کو تعجب ہوا کہ بیوی اور لڑکی بھی وارث ہوگی ۔ اور چھوٹا بچہ بھی بڑے آدمی کی طرح وراثت میں حصہ دار ہوگا ۔ حالانکہ ان میں سے کسی میں بھی دشمن کے مقابلے اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں[1]

قرآنِ مجید نے احکامِ میراث بیان کرنے اور قرابت داروں کے حقوق متعین کرنے سے پہلے ایک اصولی اعلان کیا ۔ یہ اعلان بہت اہم تھا ۔ اس نے دورِ جاہلیت کے بہت سے ضابطوں کو ختم کرکے رکھ دیا ۔ اس نے کہا :۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان و الاقربون ، وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر (النساء)	مردوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ۔

یہاں قرآن مجید نے عورتوں کے حق وراثت کا اتنے ہی اہتمام سے ذکر کیا ہے جتنے اہتمام سے مردوں کے حق کا ذکر کیا ہے ۔ خاص بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ والدین اور قرابت داروں کے مال میں مردوں اور عورتوں کا حق ہے بلکہ مردوں کے حق کو الگ سے بیان کیا اور عورتوں کے حق کا جداگانہ ذکر کیا تاکہ دونوں کی انفرادیت باقی رہے ۔ اور یہ معلوم ہو کہ مرنے والے کے مال میں جس طرح مردوں کا مستقل حق ہے اسی طرح عورتوں کا بھی مستقل حق ہے ۔ ان میں سے کسی کا حق بھی کسی دوسرے کے حق کے تابع نہیں ہے ۔ جو چیز جاہلی معاشرہ کا جزء بن چکی تھی اس کو ختم کرنے کے لئے دونوں کے حقوق کو دو مستقل دفعات میں بیان کرنا ضروری تھا ۔

اس کے ساتھ اس نے اس بات کی بھی وضاحت کردی کہ مال تھوڑا ہو یا بہت

---

[1] ابن جریر : تفسیر ۴/ ۱۷۱

کم قیمت ہو یا بیش قیمت اس میں دونوں کا حصّہ ہوگا ۔ ایسا نہیں ہوگا کہ جائیداد، مکان، کارخانہ، قیمتی ساز و سامان اور روپیہ پیسہ مرد کا ہو۔ اور کچھ بے قیمت چیزیں عورت کا حق سمجھی جائیں۔ بلکہ جو کچھ بھی مال ہے اور جس نوعیت کا بھی ہے۔ اس میں دونوں کا حق ہوگا۔ اور خدا کی ہدایت کے مطابق وہ ان کے درمیان تقسیم ہوگا۔ آخر میں فرمایا کہ عورت اور مرد کے حقوق خدا کی طرف سے متعین کر دئے گئے ہیں۔ جو بہر حال ان کو ملنے چاہئیں۔ ان میں سے کوئی فرد کسی کو نہ تو محروم کر سکتا ہے اور نہ اس کے حق پر قبضہ کر سکتا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید نے مردوں، عورتوں، لڑکوں اور لڑکیوں سب ہی کے حقوقِ وراثت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے۔

یوصیکم اللہ فی اولادکم ...... اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے معاملہ میں وصیت کرتا ہے

اللہ تعالیٰ جب کسی کام کی وصیت کرتا ہے تو اس کے معنی یہی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی انجام دہی کی نصیحت کرتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اس کام کا حکم دے رہا ہے اس کی بزور تاکید کر رہا ہے۔ اور اسکو پورا کرنے کا بندہ سے عہد و پیمان لے رہا ہے۔[1]

'اولاد' کے لفظ میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، امیر ہوں یا غریب، عالم ہوں یا جاہل، اس لئے کہ اولاد بہر حال اولاد ہے اور والدین سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ ان میں تفریق صحیح نہیں ہے۔ ابن جریر طبری

---

[1] 'وصیت' کے معنی امام راغب اصفہانی نے ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ ان یتقدم الی الغیر مایعمل فیہ مقترنا بوعظ (مفردات القرآن) یعنی نصیحت کے انداز میں کسی کو ایسی بات بتانا جس پر وہ عمل کرے۔ مجدالدین فیروز آبادی کہتے ہیں۔ اوصاہ ووصاہ توصیۃ، عھد الیہ ..... ویوصیکم اللہ ای یفرض علیکم (قاموس مادۃ وصی) 'اوصاہ' اور 'وصاہ' کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس سے عہد لیا اور اس کو اس کا پابند بنایا۔ 'یوصیکم اللہ' کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر فرض کرتا ہے۔

کہتے ہیں۔

سواء فیہ صغار ولدہ وکبارہ وإناثہم[1] — اس حکم میں مرنے والے کے بچے چھوٹے ہوں یا بڑے یا وہ لڑکیاں ہوں۔ سب برابر ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے اور اس کی پابندی کی تاکید کرتا ہے کہ تم اپنی اولاد کے درمیان کسی قسم کا فرق نہ کرو۔ اور ان میں سے ہر ایک کو اس کا حق ادا کرو۔ اولاد کے بارے میں والدین کو وصیّت کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان اپنے بچوں کے ساتھ بھی زیادتی کر سکتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس نے زیادتی کی بھی ہے۔ لیکن خدائے تعالیٰ کی ذات عدل و انصاف کا سرچشمہ ہے وہ انسان پر اس سے زیادہ مہربان ہے جتنا ماں باپ اپنے بچہ پر ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ماں باپ کو بھی اپنی اولاد کے ساتھ عدل و انصاف کا حکم دے اور ان کو ناانصافی سے منع کرے۔ یہی بات مشہور سیرت نگار سہیلی نے ان الفاظ میں کہی ہے۔

اضاف الاولاد الیہم مع انہ الذی اوصٰی بہم اشارۃ الی انہ ارحم بہم من آبائہم[2]

اللہ تعالیٰ نے اولاد کو ان کے (آباء) کی طرف منسوب کیا، لیکن اس کے ساتھ اس نے ان کے بارے میں انصاف کی ان کو وصیت کی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ ان کے آباء سے زیادہ ان پر مہربان ہے۔

(باقی)

---

[1] طبری: تفسیر ۴/۱۷۱

[2] ابن حجر: فتح الباری ۱۱/۲

علم منطق ـــــ ایک جائزہ

(۴)

ہندوستان

مولانا بدرالزماں نیپالی مرکزی دارالعلوم بنارس

ہندوستان کے بارے میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ یہاں کے علم و حکمت کو دیکھ کر اہل چین اسے ملک الحکمۃ کہا کرتے تھے، گویا اہلِ ہند نے عہدِ قدیم ہی میں منطق، فلسفہ، ہیئت، اور طب وغیرہ تمام علوم کے اندر اتنی مہارت پیدا کرلی تھی کہ اسے سرچشمۂ علم کہا جانے لگا تھا، تاریخی دور کی ابتدا ہی سے ہمیں یہاں علمی سرگرمیوں میں ایک مخصوص قسم کا چڑھاؤ محسوس ہو رہا ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ فلسفیانہ مجلس قائم ہوتی تھیں۔ طرح طرح کے استدلالات کئے جاتے تھے اور دماغی کاوشیں کی جاتی تھیں، مذہبی لوگوں میں جس وقت اپنے مسلک کی ترویج واشاعت کا جوش نقطۂ عروج پر پہنچ چکا ہو، ایسے وقت میں فلسفیانہ تحریکیں اپنے موقف کی توضیح و تشریح کو مکمل کئے بغیر بھلا کب چین لے سکتی ہیں۔ جب کہ فلسفی اور منطقی جیسے حساس، نباض اور وقت کے رُخ کو سمجھنے والے کم ہی ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم بدھ مت کے عروج و ارتقاء کے دور پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی دور میں علم منطق کو نہایت ہی مہذب طریقے پر ارسطوی منطق سے پہلے ہی پیش کیا جاچکا تھا۔

" سکندر مقدونی (۳۲۳ ق م) نے جس وقت ہندوستان پر حملہ کیا، اس وقت یہاں علوم فلسفہ اور منطق کو مرتب کرلیا گیا تھا، اس کی تفصیل کے لئے نہایت الارب ج ۱۵

صفحہ ۲۴۵ تا ۲۴۸ طبع مصر ۱۹۶۳ء قابلِ مطالعہ ہے۔ "سکندر" اور ہندوستانی بادشاہ "کنگ کانگ" کے درمیان جو گفتگو ہوئی اسے بڑی تفصیل کے ساتھ شہاب الدین نویری (۶۷۷ تا ۷۳۲ھ) نے مذکورہ کتاب میں "عبد الملک بن عبدون" کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اسی کا ایک جزو ہمارے مبحث سے متعلق ہے۔

انھوں نے نقل کیا ہے کہ جب "سکندر" (۳۲۳ ق م) نے ہندوستان کے سرحدی علاقوں کو راجہ بلہرا "فور" کے قتل کر دینے کے بعد مکمل طور پر زیرِ اثر کر لیا، تو سنا کہ ہندوستان کے آخری سرے پر ایک عظیم الشان بادشاہ "کنگ کانگ" نامی حکومت کر رہا ہے، اور وہ بذاتِ خود ایک بہت بڑا فلسفی اور دانش مند ہے تو اس کے پاس صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے قاصد بھیجا، اور سخت تہدیدی خط لکھا، جس کی وجہ سے راجہ نے اطاعت قبول کر لی، اور ایک ایسے فلسفی کا پتہ بتایا جس کا اس کے دربار میں کوئی ثانی نہیں تھا۔ سکندر نے اپنے حکماء اور فلاسفہ کو جو اس کے پاس ہر وقت موجود رہتے تھے راجہ کے پاس بھیجا۔ راجہ نے ایک مجلس منعقد کی، تاکہ انھیں یہ بتائے کہ ہمارے یہاں فلسفیانہ علوم کس حد تک ترقی پا چکے ہیں۔ اور وہ کتنے اصولیات و فروعیات پر مشتمل ہیں، پھر خطاب کرتے ہوئے اپنے فلسفیانہ علوم کو نہایت مرکز طریقہ پر چار قسموں میں بانٹ دیا۔

پہلا ریاضیات، دوسرا منطقیات، تیسرا الطبیعیات اور چوتھا الٰہیات۔ پھر ہر ایک کے انواع و اقسام پر مکمل تبصرہ کیا۔ علم منطق پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ علم منطق کی پانچ قسمیں ہیں ۱۔ شعر، ۲۔ خطابت، ۳۔ جدل، ۴۔ برہان، ۵۔ مغالطہ۔

یہ خبر جب سکندر کو پہنچی تو وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس قوم نے علم کے اوپر اتنی دسترس کیونکر حاصل کر رکھی ہے، وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس کے استاذ "ارسطو" (۳۲۲ ق م) جیسا مفکر، فلسفی اور منطقی کوئی نہیں، اور علوم عقلیہ سے استنباط میں اس سے زیادہ کوئی ماہر نہیں۔ لیکن اتنے مرتب شکل میں تمام علوم عقلیہ کو سمیٹ لینا اور ہر ایک کی قسم

دہ قسم کا پتہ چلالینا ضرور کسی زبردست قوتِ استخراج کی نشان دہی کرتا ہے، اس کی وجہ سے وہ سراپا تعجب بن گیا۔

بہرحال یہ اس وقت کی بات ہے جب اکثر قومیں علم منطق کا پتہ لگانے میں اپنی ساری ذہنی طاقتیں صرف کر رہی تھیں اور ان میں سے بعض کو اسی دور میں کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔

مندرجہ بالا اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں عہد قدیم ہی سے بہت سے فلسفیانہ اسکول اور مذاہبِ فکر موجود تھے۔ جن میں سے بعض کا فلسفہ محض مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا، اور بعض کو مذہب سے جدا تو نہیں کہہ سکتے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فرقہ مذہبی پہلو کے علاوہ خالص علمی اور فکری پہلو کو اپنے بحث میں شامل کرتا ہے۔

عہد قدیم میں ہندو فلسفیانہ اسکول چھ تھے جن کا تذکرہ رائے بہادر راو جہا اور اے وی احمد نے اس طرح کیا ہے:

۱۔ پہلا میمانسا (علم شریعت) جس کی بنیاد مہرشی "جیمنی" نے رکھی تھی۔
۲۔ پچھلا میمانسا یا ویدانت (علم توحید) جس کے بانی "بیاس جی" تھے۔
۳۔ نیائے (علم منطق) یا گوتم کا منطقی فرقہ۔
۴۔ ویشیشک، کناد کے علم ذرات (مفردات) کا اسکول (مکتبہ فکر)۔
۵۔ سانکھیا یا کپل کا دہریہ اسکول۔
۶۔ یوگ یا پتنجلی کا خدا پرست فرقہ۔

ان میں سے ہر ایک کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ تمام کے بارے میں کچھ لکھنا ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے، اس لئے ہم صرف "گوتم" اور "کناد" کے منطقی فرقوں کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

ہندوستان کے برہمنوں نے علم منطق پر بڑی زبردست قسم کی توجہ کی تھی جس کی وجہ سے ان کے یہاں بہت بڑے بڑے منطقیوں نے جنم لیا۔ اور انھوں نے بہت سی منطقی تصنیفات تیار

کر ڈالیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف طرز فکر کے بہت سے منطقی فرقے پیدا ہو گئے، لیکن تمام فرقوں کے نظریات "گوتم" کے بنائے ہوئے مذہب "نیائے" اور "کناد" کے بنائے ہوئے مذہب ویشیشک سے ماخوذ ہیں، اور یہ دونوں فرقے بعض چیزوں میں متحد ہیں۔ البتہ بعض میں ایک، دوسرے سے کچھ آگے نکل جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اصول میں "نیائے" کہنے سے دونوں ہی مراد ہوتے ہیں۔ کیونکہ "گوتم" کے "نیائے" میں "استدلال" کا رنگ غالب ہے اور "کناد" کے "ویشیشک" میں "مجردات" کا۔

ایشور (خدا) روح اور دنیا وغیرہ کے متعلق دونوں کے اصول ایک ہیں۔ "نیائے" میں بالخصوص "طرز استدلال" اور "دلیل" کی تحقیق کی گئی ہے لیکن "ویشیشک" میں اس سے دو قدم آگے بڑھ کر "ذروں" (مفردات) کا انکشاف کیا گیا ہے[۳]

"کناد" کا "ویشیشک" وہ ہے جس میں مجردات اور عناصر کی تحقیق ہو[۴]۔ اس کے فرقہ "ویشیشک" کی منطق میں ان حالتوں کا شمار چھ ہے جن کا ترجمہ "مقولات (پدارتھ)" کیا گیا ہے۔ یعنی مجردات (درویہ) صفت (گن) حرکت (کرم) کلیت، جنسیت اور اتحاد۔ لیکن بعض لوگوں نے زمانہ مابعد میں ساتویں حالت (پدارتھ) بھی مان لیا ہے۔ اور وہ نیستی یا مصیبت ہے[۵]

گوتم کا "نیائے" فلسفہ کے اس شعبہ کو کہتے ہیں جس میں کسی شئے کا حقیقی علم حاصل کرنے کے لئے استدلال کی صورتیں قائم کی گئی ہوں[۶]۔ اس کے فرقے "نیائے" کی تجنیس بمقابلہ کناد کے فرقے کے بہت زیادہ کامل اور قرین فہم ہے[۷]

"تجنیس" کے تقریری مراتب کو اس طرح تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ تقریر کے مراتب کی تقسیم اول، سولہ عنوانوں یا درجوں میں کی گئی ہے۔ (۱) دلیل (۲) وہ اشیاء جو معلوم اور ثابت کی جائیں (۳) شک (۴) علت (۵) مثال (۶) مشتبہ حقیقت (۷) ایک باقاعدہ تقریر یا قضیہ (۸) وہ تقریر جس سے بے ہودہ پن ثابت کیا جائے (۹) تعیین یا تحقیق (۱۰) مقدمہ (۱۱) مناظرہ (۱۲) اعتراض (۱۳) دلیل فاسد (۱۴) انحراف (۱۵) تذلیل (۱۶) تردید۔

پھر ان میں سے ہر ایک کی تقسیم در تقسیم کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:
اس تقسیم کی جو تقسیم کی گئی ہے وہ زیادہ تر معقول و بالترتیب ہے اور اوّل: یعنی دلیل کے چار اقسام ہیں (۱) بدیہہ (پرتیکش) (۲) قیاس (انومان) (۳) تقابل (اُپما) (۴) مقولہ یا شہادت (شبد) اور دلیل کے ان اقسام چہارگانہ میں سے پہلی قسم یعنی بدیہہ کی دلیل بزرگوں کے اقوال ہیں۔ معنوی امور کی دلیل وید ہیں۔ اور وید منجانب خدا مانے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے مقولات (فرمودات) ہمیشہ مستند اور صادق ہیں۔

دوسری قسم: یعنی قیاس تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک صغریٰ جس میں علت سے معلول معلوم ہوتا ہے، دوسرا کبریٰ جس میں معلول سے علت دریافت ہوتی ہے۔ اور تیسرا تماثل۔ اور ثانی جو اشیاء ثابت کی جاتی ہیں، وہ بارہ[۱۲] ہیں۔ ۱۔ روح (آتما) ۲۔ جسم (شریر) ۳۔ اس خمسہ و قوائے ذہنیہ (اندریاں) ۴۔ محسوسات ۵۔ قوت مدرکہ ۶۔ ارادہ ۷۔ سرعت ۸۔ خطا ۹۔ تناسخ ۱۰۔ اعمال کا ثمرہ، ۱۱۔ تکلیف، ۱۲۔ موکش یعنی نجات۔

روح پہلی شئے ہے جو قابلِ اثبات ہے۔ اس کی چودہ[۱۴] صفات ہیں۔

۱۔ تعداد ۲۔ مقدار ۳۔ کثرت ۴۔ وصل ۵۔ علم ادراک ۶۔ رنج ۷۔ راحت ۸۔ خواہش ۹۔ نفرت ۱۰۔ ارادہ ۱۱۔ لیاقت ۱۲۔ نالیاقتی ۱۳۔ قوت متخیلہ ۱۴۔ جسم، روح کے بعد دوسری ثابت ہونے والی شئے ہے اس کی بحث و تشریح زیادہ وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے۔ مگر بعض باتیں جو علم طبیعیات سے تعلق رکھتی ہیں اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس کے بعد آلات حس (حواس خمسہ و قوائے ذہنیہ) ہیں۔ ان کا مخرج (گوتمی فرقہ نے) سانکھیا فرقے کے مثل "معرفت" کو نہیں قرار دیا ہے۔ بلکہ اسی فرقے کے مثل آلات کو اندرونی چھٹے حس کے ساتھ شریک کر دیا ہے۔ لیکن پانچ آلاتِ حرکت کا فرق علیحدہ نہیں کیا گیا ہے۔ جن کے شمار سے سانکھیا فرقے نے حس کے گیارہ[۱۱] آلات قائم کئے ہیں۔ پھر محسوسات ہیں جن کو (گوتم کے فرقے نے) ان اصطلاحات میں شامل کیا ہے۔ جن میں "کناد" کے فرقے نے حالتوں کا شمار کیا ہے[۶]۔ گوتمی فرقے کے ان منطقی نظریات کو

سامنے رکھکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ " دنیائے شاستر " جس کا مصنف گوتم ہے۔ اور جس کی شرح کا بیان آگے آرہا ہے محض منطق نہیں ہے۔ بلکہ پریموؤں (وہ اشیاء جو ثابت کی جائیں) سے بحث کرنیوالا فلسفہ ہے۔ مغربی منطق (LOGIC) سے اسے کوئی نسبت نہیں ہے[9]۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ یہ منطق نہیں ہے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ مغربی منطق اور ہندوستانی منطق میں سے ہر ایک کیلئے الگ الگ مقام اور درجہ ہے۔ اور ہندوستانی منطق مغربی منطق کی رہینِ منت نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس منطق میں فلسفہ کی آمیزش واضح طور پر پائی جاتی ہے۔

ہم اس سے پہلے دکھا چکے ہیں کہ ہندوستانی منطق ارسطو کی منطق کے وجود میں آنے سے پہلے ہی مرتب شکل اختیار کر چکی تھی۔ یا کم از کم ہندوستانی منطق کا وجود ارسطو کی منطق سے پیچھے نہیں۔ بلکہ دونوں ایک ہی زمانے میں وجود پذیر ہوئیں۔ اس لئے ہندوستانی منطق کا مغربی منطق سے غیر متعلق ہونا متیقن ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود فکری قوتوں اور فطری طبیعتوں کی یکسانیت کی بناء پر عین ممکن ہے کہ بہت سی قوموں کی ذہنی اپج اکثر یا بعض مسائل میں باہم مشابہ ہو جائیں۔ چنانچہ وہ فرقہ جو اپنے منطقی مکتبۂ فکر کی بنیاد ایسے مسائل پر رکھتا ہے جو گوتم اور کناد دونوں فرقوں کے افکار کے اوپر نظر ڈالنے سے حاصل ہوئے ہیں، جب اس کے مسائل کا مقابلہ ارسطو کے منطقی مسائل سے کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرقہ تجنیس، ترکیب اور ترتیب پر توجہ کرنے اور ایک بے ڈھنگا اور بد اسلوب قضیہ، یا پانچ مراتب کا، جن میں سے دو بالکل بے کار ہیں۔ قائم کرنے میں ارسطو کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ اسی طرح فرقہ کناد کی منطق کے اندر جن چھ حالات کا ذکر ہو چکا ہے ان میں سے تین حالتیں ارسطو کے نزدیک حالتوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اس کے سوا ارسطو نے اور جو سات حالتیں قرار دی ہیں وہ متروک ہیں۔

جن مضامین پر ہندوؤں کے مذکور الصدر دونوں فرقوں نے بحث کی ہے اکثر ان میں سے وہی ہیں جن پر ارسطو نے بحث کی ہے۔ مثلاً حواس، عناصر، روح اور اس کی مختلف قوتیں، زمانہ، خدا وغیرہ۔ ہاں البتہ بیشتر مضامین جو ارسطو کے نزدیک اوّل درجہ کے ضروری ہیں

ہندوؤں سے رہ گئے ہیں اور وہ مشہور ترین تطابق جو ہندوؤں اور یونانیوں میں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ ہندوؤں کے کل فرقے حواس خمسہ پر ایک اندرونی حس (جسے وہ ارادہ کہتے ہیں) کا اضافہ کرتے ہیں۔ جو باقی پانچوں حواس پر قبضہ رکھتی ہے، یہ ارسطو کے اس حس سے مطابقت تام رکھتی ہے جس کو وہ "عام حس" یا "اندرونی حس" کہتا ہے مثلاً یہ ہندوؤں کے دو اہم فرقوں کا جائزہ ہے جو ہمارے اس دور میں بڑے پیمانے پر اپنا کام کر رہے تھے۔ یوں تو منطق کی بہت ساری شاخیں موجود تھیں۔ لیکن دراصل ان کے نظریات انھیں دونوں فرقوں کے نظریات ہوتے تھے۔ یا ان سے ماخوذ ہوتے تھے۔ اور معمولی ترمیم کے ساتھ ان سے مسائل کا استنباط کرلیا جاتا تھا۔ ان بہت سی شاخوں کے علاوہ بدھی اور جینی مکاتب فکر بھی تھے جن میں بہت زیادہ سرگرمی کے ساتھ منطق کی خدمت انجام دی جا رہی تھی۔ ہمارے اس دور کے اخیر یعنی چھٹی صدی عیسوی میں بودھ اور جین علماء نے "نیائے شاشتر" پر ایک نئے ڈھنگ سے غور و فکر شروع کر دیا تھا۔ اس کا ذکر دوسرے دور میں آ رہا ہے۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "نالندہ" اور "تکشلا" جیسے اہم مدرسوں کا ذکر کر دیا جائے۔ جہاں تمام علوم و فنون کے ساتھ منطق میں بھی فضیلت کی ڈگری دی جاتی تھی۔ اور اچھی قابلیت اور صلاحیت کا آدمی بنانے کے لئے منطق کی تعلیم دی جاتی تھی۔

جامعہ تکشلا کے بارے میں رائے بہادر ہیرا چندا وجھا نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں تکشلا کا جامعہ سب سے قدیم تھا، پتنجلی، چانکیہ اور جیوک جیسے نامور علماء یہیں کے طالب علم اور اتالیق تھے۔ سب سے عظیم الشان بھی یہی ادارہ تھا۔ اس میں داخلہ کے لئے ۱۶ سال کی عمر کی قید تھی۔ . . . . مختلف جاتکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کا نصاب تعلیم بہت وسیع تھا۔ اس میں کچھ مضمون یہ ہیں:۔ وید، اٹھارہ[۱۸] علوم (پتہ نہیں یہ کون سے علوم تھے) دیاکرن صناعی، فن حرب، ہاتھ کا علم، منتروں کا علم اور علم شفا[۱۱]

اس جگہ صراحت کے ساتھ یہ مذکور نہیں ہے کہ یہاں علم منطق کی تعلیم ہوتی تھی، پھر بھی پہلے سے

وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ منطق کی صرف رسمی تعلیم نہیں ہوتی رہی ہوگی۔ بلکہ اس میں کمال حاصل کئے بغیر دوسرے علوم وفنون میں دستار فضیلت ہی نہیں دی جاتی رہی ہوگی، کیونکہ اتنی عظیم الشان یونیورسٹی میں ایسے مشہور ومعروف علم کا نہ پڑھایا جانا ذرا کم ہی سمجھ میں آتا ہے، جب کہ اس سے چھوٹے مدارس میں منطق کی اعلیٰ تعلیم کا مکمل طور پر بندوبست رہتا تھا اور وہ ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب تعلیم میں داخل تھی۔

چنانچہ اوجھا صاحب نے اتسنگ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اتسنگ نے اپنی مشہور تصنیف میں قدیم نصاب کا مختصر ذکر کیا ہے، عام طور پر دستار فضیلت حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ویاکرن کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ پھر چند چیزوں کے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں " اس ورتی کو ختم کر لینے کے بعد طلبا نظم ونثر سیکھنے کی مشق شروع کرتے تھے، اور منطق ولغات میں مصروف ہوجاتے تھے۔"[۱۲]

یہاں منطق سے مراد علم منطق ہے۔ کیونکہ آگے لکھتے ہیں " نیائے دوار تارک شاستر (ناگارجن کی تصنیف کردہ منطق کی تمہید) کے مطالعہ نے انھیں صحیح استدلال اور جاتک مالا کے مطالعہ سے ادراک کی قوت پیدا ہوتی تھی۔ اتنا پڑھ چکنے کے بعد طلباء کو بحث ومناظرہ کی تعلیم دی جاتی تھی"[۱۲]...... آگے چل کر ہیوگ سانگ کا بیان نقل کرتے ہیں کہ ویاکرن کے فاضل ہوجانے کے بعد منتر ودیا، منطق اور جیوتش کا مطالعہ کرایا جاتا تھا۔[۱۲]

گویا ہندوستان میں منطق کے ہر ہر جزء کو بڑی پابندی کے ساتھ ذہن نشین کرایا جاتا تھا۔ شعر اور بحث ومناظرہ کو تو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ اس کے اندر کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور مخالف کو کس طرح زیر کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام چیزوں کے رموز واسرار پر واقفیت انھیں اساتذۂ فن سے حاصل ہوتی تھی۔ یہ ہندوستان کے ایسے فن رہے ہیں جن پر ایران ویونان نے برائے نام بھی توجہ نہیں دی۔ یونان کے اندر صرف شعر پر معمولی سی توجہ " اومیرس " اور " ابرخس " جیسے چوٹی کے شعراء نے اپنے کلام میں دی تھی۔ انھوں نے اپنے اشعار کو شعر منطقی کے قالب

میں ڈھال کر پیش کیا، جیسا کہ ابن القفطی (۶۴۶ھ) کا بیان ہے۔ وہ اومیرس کے ذکر میں لکھتے ہیں:
"کان من رجال یونان الذین عالوا الصناعۃ الشعریۃ من انواع المنطق واجادھا"[۱۴]
اومیرس یونان کے ان شعراء میں سے ہے جنہوں نے اپنے کلام میں منطق کی ایک قسم صنعت شعری کی طرف توجہ کی اور کامیاب رہا۔

اور ابرخس کے بارے میں رقم طراز ہیں "کان قد احکم النوع الشعری من الصناعۃ المنطقیۃ"[۱۴] کہ اس نے صنعت منطق کے نوع شعری کو مستحکم کیا۔ یونانی منطق کے ان اقسام پر عملی اقدام کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے درس وتدریس کا سہارا لیا گیا ہو۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں مندرجہ بالا تمام قسموں کو نصاب تعلیم میں داخل کرلیا گیا تھا تاکہ کسی بھی طرح ان کی جانب سے تساہل اور غفلت نہ برتی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں منطقیانہ شاعری اور جدل ومناظرہ کا بازار گرم رہتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے منطقی اور علمی سرمائے کا عظیم وجلیل حصہ شعر ہی کے اندر پوشیدہ ہے۔

چنانچہ رامائن اور مہا بھارت ایک زمانہ تک لوگوں کے دلوں کو مسحور کرتی رہی ہیں یہاں تک کہ خدائے سخن کالی داس، بھاس اور اشوگھوش وغیرہ نے اس میدان میں ہلچل مچا دیا۔ مشہور ہے کہ کالی داس تشبیہات کا بادشاہ ہے۔ بھاروی لطافت معنوی میں یکتائے روزگار اور ڈنڈی محاسن شاعری میں بے نظیر، لیکن ماگھ ان تینوں اوصاف میں جامع بے مثل ہے۔[۱۵]

علماء ہند نے عہد قدیم اور عہد وسطیٰ پر ایک دور میں منطق کو ایک لازمی جزء کی حیثیت سے نصاب تعلیم میں داخل کر رکھا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس فن میں مہارت حاصل کرنے والوں کو ڈگریاں بھی دی جاتی تھیں۔ چونکہ منطق کو عہد قدیم اور عہد وسطیٰ دونوں ہی میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اور اس کی ترقی کے اسباب فراہم کئے گئے اور بہت سی شرحیں لکھی گئیں (جن کا ذکر آگے آرہا ہے) اس لئے ہم نے یہاں یکجا طور پر اس کو بیان کردیا ہے تاکہ یہیں ذہن نشین ہو جائے اور آئندہ اعادہ کی ضرورت نہ پڑے۔

نالندہ کے دارالعلوم کی تاسیس ہمارے اس دور کے آخر میں عمل میں آچکی تھی، کیونکہ مشہور چینی سیاح " فاہیان " جو ۴۰۵ء اور ۴۱۱ء کے درمیان ہندوستان آیا تھا۔ نالندہ کا ذکر نہیں کرتا ہے۔ اور اس کے بعد ۶۳۰ء - ۶۴۵ء میں آنے والے چینی بدھی سیاح ہیونگ سانگ نے اس دارالعلوم کا بڑے طمطراق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور لمبی چوڑی تفصیل اس دارالعلوم کی بیان کی ہے۔ جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ نالندہ کا یہ دارالعلوم اسی درمیان میں راجہ شکرادیہ نے بنوایا ہوگا۔ ہیونگ سانگ کی آمد کے وقت یہ دارالعلوم اچھی طرح ترقی کرچکا تھا۔ کیونکہ اس کے بیانات کو دیکھ کر ایک بڑی یونیورسٹی کا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں دس ہزار طالب علم اور ڈیڑھ ہزار اتالیق رہتے تھے[۱۵]

اوجھا صاحب لکھتے ہیں کہ اس جامعہ میں بودھ ادبیات کے علاوہ وید، ریاضیات، نجوم، ویاکرن اور طب وغیرہ مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی[۱۶]۔ دوسرے دور میں یہاں کی منطق پر بحث آرہی ہے۔

خصوصیت | ہندوستان کے اس دور کی خصوصیت وہی ہے جو یونانی دور اول کی اس سے پہلے بیان کی جاچکی ہے۔ تقریباً ایک ہی چیز دورِ اول کے " الف " ب " اور " ج " ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ یعنی مشترک طور پر ہر جگہ کی طبیعتیں بلند پروازی کی طرف مائل تھیں۔ مجتہدانہ ذہنیت، اختراعی ذوق اور استخراجی رجحان اس دور کا خاص سرمایہ ہے۔

ہندوستان کے اندر دوسرے فرقوں کے مسائل میں تھوڑی ترمیم اور اضافہ کے ساتھ ایک الگ مکتبہ فکر تیار کرلیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں منطقی اصولوں کی کثرت کا یہی سبب ہے۔ اسی وجہ سے تمام فرقوں کے مسائل کا ماخذ گوتم اور کناد کے منطقی نظریات بتائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے اس دور کی یہ خوبی ہے کہ یہاں منطق محض علمی حیثیت سے نہیں پروان چڑھی، بلکہ اس کے ایجاد کا اصل مقصد مذہب کی تائید حاصل کرنا اور صحیح استدلال کے ذریعہ راہ نجات کو ٹھیک طریقے پر تلاش کرلینا تھا۔ یہاں کی منطق علمی اور مذہبی دونوں رنگوں میں رنگی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے تو

شاید مبالغہ نہ ہو کہ ہندوستان میں علمی منطق سے کہیں زیادہ مذہبی منطق پائی جاتی ہے۔ اس خصوصیت میں ہندوستان کا ثانی کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ اگرچہ یہ خوبی ایک حد تک ایرانی منطق میں پائی جاتی ہے پھر بھی میری رائے میں ایران، ہندوستان کی ہمسری اس جگہ نہیں کرسکتا۔

(ج) ایران

ملوک فرس کو چار طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: پہلا فیشدادی، دوسرا کیبنی، تیسرا اشکانی اور چوتھا ساسانی۔ پہلے طبقے کے ایک حکمراں "ضحاک" ہی کے دورِ حکومت میں علوم عقلیہ کو کافی ترقی ہو چکی تھی۔ اس نے پورے ملک کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء کو یکجا کر دیا کہ بغیر کسی ادنیٰ دشواری کے علوم کو پروان چڑھنے کا موقعہ ملے، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر علوم و فنون پر گڑ گئی۔ اس کے بعد تمام بادشاہوں نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں ارتقاء پسندی کا ثبوت دیا۔ حتیٰ کہ دوسرے طبقہ کے اندر "گتاسپ" کے زمانے میں "زرتشت" نبی کا ظہور ہوا اور انھوں نے اپنی عجیب کتاب پیش کی۔ تو معقولیین کی شان پر زبردست ٹھیس لگی، انھوں نے اب تک جتنے انہماک کے ساتھ گلشن علم کی آبیاری کی تھی اس سے کہیں زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت محسوس کی۔ ابن ندیم رقم طراز ہیں:

فلما ملك بستاسب السعت الكتابة فظهر زرادشت بن سبتمان صاحب شريعة المجوس واظهر كتابه العجيب بجميع اللغات اخذ الناس نفوسهم بتعلم الخط و الكتابة فزادوا ومهروا ۔ جب "گتاسپ" بادشاہ ہوا تو خطاطی کو بڑی وسعت حاصل ہوئی اور زرتشت بن سبتمان صاحب شریعت مجوس کا ظہور ہوا، اور انھوں نے اپنی عجیب کتاب تمام زبانوں کے اندر دکھائی، پھر کیا تھا، لوگ خط اور تحریر کی تحصیل میں سرگرم ہو گئے اور بہت زیادہ انہماک دکھایا اور مہارت حاصل کرلی۔

اور پھر آہستہ آہستہ ایک ایسے علم کے پتہ لگانے میں کامیاب ہو گئے جیسے وہ اور ان کے

آباء شعوری یا غیر شعوری طور پر استعمال کر رہے تھے، اتنی بات ضرور تھی کہ یہ علم یہاں اس طریقے پر نہیں پہنچایا گیا، جس طرح یونان اور ہندوستان میں جانا گیا۔ کیونکہ یہاں یونان و ہندوستان کی بہ نسبت زیادہ پہلے علمِ منطق کا پتہ لگایا جا چکا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز جتنے ہی قدیم زمانے میں وجود پذیر ہوئی ہو، اس مقدار میں اس کے اندر خامیاں اور نقائص ہوں گے۔ اور وہ فقط ایک نشانِ راہ کا کام دے سکے گی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اہلِ فارس کے غیر منظم اور پراگندہ اصولیاتِ منطق سے یونانیوں نے بہت فائدہ اٹھایا، اور علم منطق کی تعمیر میں خشت اول کا کام لیا۔ کیونکہ فارسیوں کی منطق نے جب دھیرے دھیرے ترقی کرکے ایسی صورت اختیار کرلی جس کو [illegible] کا ابتدائی علم حاصل ہو سکے، اور نقش اول کے طریقے پر آئینہ ذہن میں [illegible] تو یونان کے وفود فارس آنا شروع ہو گئے، چنانچہ فیثاغورس (۵۰۰ م تقریباً) اور دیمقراطیس (۳۵۰ م) نے یہاں کا سفر کیا اور قدیم فلسفہ حاصل کرکے وطن واپس گئے۔ ۱۸۶

دیمقراطیس کے بارے میں تو قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے یہیں سے علمِ منطق کی تحصیل شروع کی، اور اپنی قوتِ فکر و نظر اور جدت طرازیوں کو اس میں مدغم کر کے اسے دوسری شکل دے دی، یہ الگ بات ہے کہ ہم تک اس کی کوئی منطقی تصنیف نہ پہنچ سکی۔

اہل فارس کو علم منطق سے جو خاص شغف تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس علم کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے دو طرح کے خط ایجاد کر رکھے تھے، چنانچہ ابن ندیم (۳۸۵ھ) نے عبداللہ بن المقفع (۱۴۲ھ) سے نقل کیا ہے:

وقال ابن المقفع للفرس سبعة	ابن المقفع نے بتایا کہ فارسیوں کے یہاں سات قسم
انواع من الخطوط منها (فلانتو	کے خط ہیں ان میں سے (یہ ہے اور یہ ہے) اور ایک
فلانة) ولكتابة اخرى يقال لها	دوسرا خط ہے جسے "نیم کستج" کہتے ہیں۔ یہ اٹھائیس
"نیم کستج" وهى ثمانية وعشرون	حروف پر مشتمل ہوتا ہے، اس سے طب اور فلسفہ
حرفا یکتب بها الطب والفلسفة	لکھا جاتا ہو اور ان کا ایک اور خط بھی ہے جسے

..... ولهم كتابة اخرى يقال لها "راس سهريه" يكتب بها المنطق والفلسفة وهي اربعة وعشرون حرفا وفيها نقط ولم تقع الينا[۱۹]

"راس سہریہ" کہا جاتا ہے۔ اس سے منطق اور فلسفہ لکھا جاتا ہے، اس میں چوبیس[۱۹] حروف ہوتے ہیں اور اس میں نقطے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خط ہمارے زمانے تک نہ پہنچ سکا۔

غالباً یہ خط اسی وقت بھلا دیا گیا جب منطق و فلسفہ اور تمام علوم کی کتابیں دفن کردی گئی تھیں، کیونکہ انہیں ان کے نبیوں نے ڈرایا تھا کہ سکندر آئے گا اور تمہارے علم کو ضائع کردے گا، چنانچہ ابن ندیم لکھتے ہیں:

كانت ملوك فارس نسختها على عهد نبيهم زرادشت وجاماسب الى الم، واحرزتها هنالك بمدينة اصطخر، لما كان نبيهم زرادشت وجاماسب حذراهم من فعل الاسكندر وغلبته على بلادهم واهلاكه ما قدر اليه من كتبهم وعلمهم وتحويله اياه عنهم الى بلاده فدرس عند ذلك العلم بالعراق وتمزق، واختلف العلماء وقلت[۲۰]

شاہان فارس نے اپنے نبی زرتشت اور جاماسپ عالم کے دور میں کتابوں کو نقل کرایا اور اصطخر میں جمع کردیا، کیونکہ ان کے دونوں نبیوں زرتشت اور جاماسپ نے انہیں اسکندر والے حادثے سے اور اس سے ڈرایا تھا کہ وہ ان کے ملک پر غالب آجائے گا، خاصی مقدار میں ان کی کتابوں اور ان کے علم کو برباد کردے گا اور ان کے علم کو چھین کر اپنے ملک میں منتقل کرلے گا (جب اس کا فتنہ آیا) عراق سے علم کا نام و نشان مٹ گیا، اور علماء بہت تھوڑے سے بچے، اور آپس میں چشمکیں شروع ہوگئیں۔

ایک دوسری جگہ اس طرح رقمطراز ہیں " ثم احرق بعد فراغه من نسخ حاجته منها ما كان مكتوبا بالفارسية "[۲۱] یعنی سکندر نے اپنی ضرورت بھر کی چیزوں کو نقل کرالینے

کے بعد وہ سب کچھ جلا ڈالا جو فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا۔

قرین قیاس یہی بات ہے کہ علوم کو دفنا دینے کے بعد تھوڑا بہت علم کا رواج رہا ہوگا، منطق و فلسفہ سے لوگ شناسائی رکھتے رہے ہوں گے، لیکن اس حادثۂ عظمیٰ کے بعد ان کا سارا علمی اثاثہ لٹ گیا۔

بہر حال یہ خطہ جس وقت بھی پایا جاتا رہا ہو اس سے بہت پہلے منطق کا مکمل رواج ہو چکا تھا، لیکن ہمیں صحیح طریقے پر وہ وسائل میسر نہیں ہیں جس کی بنا پر تدوینِ منطق کا کوئی خاص وقت اور اس علم کا کوئی خاص مدونِ متعین طریقے پر پیش کیا جا سکے، لیکن قرآن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دور کیبی بادشاہ "گستاسپ" (جس کے زمانہ میں زرتشت ایک نبی کی حیثیت سے ظاہر ہوئے) کے عہد حکومت سے پہلے نہیں ہونا چاہئے۔

آج ہمیں یہ تفصیل بھی نہیں معلوم کہ کس قسم کی منطق یہاں پائی جاتی تھی، اس کی کتنی قسمیں تھیں، اور اس کے علماء کے نظریات اس سلسلے میں کیا تھے، ہاں اجمالی طور پر البتہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کی منطق کشفی حقائق پر مشتمل، متصوفانہ رنگ کا رنگا ہوا ایک مذہبی طرز کا علم تھا جس کا پتہ حکمۃ الاشراق اور الحکمۃ المشرقیہ میں غوطہ لگانے والا لگا سکتا ہے۔ اور یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں منطق کو جو ترقی ہو رہی تھی وہ اگر کچھ دنوں اور باقی رہتی تو ہندوستانی منطق کو کون کہنے جائے یونانی منطق بھی اس کے سامنے ہیچ رہ جاتی، کیونکہ اس فن کو بامِ عروج پر پہنچانے کے لئے ایک طرف مستقل خطوں کو رائج کر لیا گیا تھا اور دوسری طرف اسے بادشاہوں کی مکمل پشت پناہی بھی حاصل تھی، جب کہ دوسری جگہوں کی منطق کو یہ سہولیات اور اسباب تقدم فراہم نہیں تھے۔

اتنی چیز جان لینے کے بعد یہ معلوم کر لینا قدرے آسان ہے کہ اشراقیت جس کا بانی عام طور پر شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول (۵۸۷ھ) سمجھا جاتا ہے۔ دراصل ہمارے اس ہی دور میں قدیم حکماء فارس کے ذریعہ وجود میں آئی تھی۔ اس اشراقیت کی بنیاد نہ تو سہروردی (۵۸۷) نے

ڈالی جیسا کہ اس کے معتقدین "حکمۃ الاشراق" کے داخلی اور خارجی دلائل و قرائن سے ثابت کرتے ہیں ۔اور شیخ بو علی سینا (۴۲۸ھ) ہی ، اگرچہ ان کی "الحکمۃ المشرقیہ" اس سلسلے کی زبردست تصنیف ہے جس کو ایرانی و یونانی منطق و فلسفہ میں مکمل دسترس حاصل کر لینے کے بعد لکھا گیا ہے یہ تحقیق کی روسے ضائع ہو چکی ہے ۔لیکن اس کا منطقی حصہ اب بھی موجود ہے اور شائع ہو چکا ہے اور "الانصاف" ایک ضخیم تصنیف اور دونوں کتابوں کا اہم ترین محاکمہ ہے جس کے اندر ایرانی اور یونانی نظریات کا جائزہ لیکر فیصلہ کیا گیا ہے ۔ان دونوں ہی نے انھیں نظریات کو پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں جو قدیم حکماء ایران کے تھے، اور انھوں نے جو منطق پیش کیا ہے وہ یونانی اور ایرانی منطقی اسالیب کا مجموعہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں جگہ کی منطق پر پوری قدرت حاصل کر لینے کے بعد اسے تحریر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی مفصل بحث برہان جون ۱۹۶۰ء یا ستمبر ۱۹۶۰ء کے شماروں میں ملے گی ۔

میرا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اشراقیت ہمارے اس دور میں بھی موجود تھی جس سے ایرانی منطق کا استنباط ہوا ، اور اس کو مرتب شکل میں پیش کیا گیا ، لیکن اس کا ادنیٰ حصہ بھی ہم تک نہ پہنچ سکا ، کیونکہ سکندر مقدونی نے کچھ کو تو اپنے ملک بھجوا دیا تھا ، اور بقیہ کو نذر آتش کر دیا تھا ، اور ایک وجہ یہ بھی کہ اس حادثہ کے بعد لائق اہل علم نہ پیدا ہوئے جو اپنی قوت فکر اور کچھ بچی کھچی کتابوں سے ایک نئے طرز کی منطق مرتب کر ڈالتے ۔

خصوصیت | منطق کو کسی بھی قوم نے ابھی مرتب نہیں کیا تھا کہ یہاں کی منطق مرتب شکل اختیار کر چکی تھی۔ موجدین اور مخترعین نے ایران میں ایک ایسی منطق کے استخراج میں کامیابی حاصل کر لی تھی جو وہاں کے انکشافانہ ماحول کے مطابق تھی ۔اور ایسا لگتا ہے کہ یہاں اس دور کی منطق کو ایک حد تک مذہب سے ملنے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ لیکن اس کے باوصف ایرانی منطق میں وہ قوت نہیں تھی ۔جو دوسروں جگہوں کی منطق میں تھی ۔

حوالہ جات

ملہ اور شہرستانی نے ملل و نحل ج ۲ کے آخری صفحہ پر اجمال کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے ۔

٢ یہ مفصل طور پر رسائل ارسطوطالیس الی الاسکندر میں ملے گا جس کا ذکر شہرستانی نے ملل ونحل ج ۲ کے آخر میں اور ابن ندیم نے الفہرست صـ۱۷۱ میں کیا ہے۔

٣ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صـ۱۰۹ مصنف رائے بہادر اوجھا۔

٤ قرون وسطیٰ صـ۱۰۹

٥ قرون وسطیٰ صـ۱۰۶ اور قدیم ہندوستان کی تہذیب کا مقدمہ مترجم صـ ت

٦ قرونِ وسطیٰ صـ۱۰۴

٧ قدیم ہندوستان ... کا مقدمہ مترجم صـ لج

٨ ماخوذ از قرون وسطیٰ ... و قدیم ہندوستان ... کا مقدمہ مترجم

٩ قرون وسطیٰ ... صـ۱۰۴

١٠ قدیم ہندوستان ... کا مقدمہ مترجم صـ ب، بج

١١ قرون وسطیٰ ... صـ۱۷۶، ۱۷۷

١٢ " ... صـ۱۷۸

١٣ اخبار الحکماء صـ۴۹

١٤ " صـ۵۱

١٥ قرون وسطیٰ ... صـ۸۰

١٦ " ... صـ۱۷۵

١٧ الفہرست لابن ندیم صـ۱۹

١٨ تاریخ الفلاسفہ صـ۵۳، ۶۸

١٩ الفہرست صـ۲۱۲

٢٠ " صـ۳۳۳

شعرائے تاشقند

(از جناب ڈاکٹر کبیر احمد صاحب جائسی ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی (علیگ)

موجودہ جمہوریۂ ازبکستان کا علاقہ قدیم زمانے ہی سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے جس کی خاک نے بلا مبالغہ ہزاروں ادبا، شعرا، فقہا، صوفیا اور دوسرے علوم و فنون کے کاملین کو جنم دیا لیکن چونکہ قدیم زمانے میں موجودہ ازبکستان کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہ تھی بلکہ یہ وسط ایشیا کا ایک حصہ تھا اس لئے اس کے باکمال فرزندوں کے تذکرے دوسرے لوگوں کے تذکروں میں اس طرح گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ ان کا الگ سے کوئی تذکرہ مرتب کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گیا ہے۔ فارسی نظم و نثر کی بعض تاریخیں ایسی ضرور ہیں جن میں اس موضوع پر کچھ مواد جا بجا بکھرا مل جاتا ہے۔ ایسی ہی کتابوں میں مرحوم سعید نفیسی کی کتاب "تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی" بھی ہے جس کو انھوں نے تین ضخیم جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کی جلد اول کے سرسری مطالعہ کے بعد مجھے تاشقند کے شعرا کے سلسلے میں جو کچھ بھی مواد مل سکا ہے وہ آج کی گفتگو کا موضوع ہے۔ سطور ذیل میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ میرے مجوزہ کام کا پہلا قدم ہے جو مواد کے دستیاب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ہیئت بدلتا جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کی تلاش و جستجو کے بعد ازبکستان کے شعرا کا ایک جامع تذکرہ مرتب ہو جائے۔

<u>زین الدین محمود بن عبد الجلیل واصفی تاشقندی:</u> واصفی دسویں صدی ہجری کے مشہور و معروف فرد ہیں جن کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، ولادت تاشقند میں ہوئی اور وہیں انھوں نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کئے۔ ابھی آغاز جوانی ہی تھا کہ عازم ہرات ہوئے اور وہاں پہونچ کر مشہور زمانہ صوفی شاعر جامی سے مستفید ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمد شیبانی خان ہرات کا حاکم تھا اور مولانا

بنائی، محمد بدخشی، ریاضی، نوایی، امامی، ہلالی جیسے شعرا اس کے دربار سے منسلک تھے۔ واصفی کے ایک قول کے مطابق ۹۱۳ھ میں یہ تمام شعرا دربار میں جمع تھے اور کاتبی کے اشعار پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے اور اس کا ایک شعر جس میں تیغ اور آب کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے پڑھتے جاتے اور اس کی تعریف میں کہتے جاتے کہ ان الفاظ کا اس طرح سے ایک شعر میں کھپانا محالات میں سے ہے۔ واصفی بھی ان باتوں کو سن رہا تھا، اس نے پانچ بحروں اور مختلف قوافی میں پانچ غزلیں لکھیں اور ہر ہر شعر میں التزاماً تیغ و آب کے الفاظ نظم کئے، ان غزلیات کا نام اس نے تحفۂ متحیرہ رکھا تھا، صرف اسی ایک واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شعر کے میدان میں اس کا ذہن کتنا درّاک رہا ہوگا۔ بہر حال وہ کچھ ہی مدّت تک ہرات میں رہا پھر ۹۱۶ھ میں ماوراالنہر واپس آگیا۔ سعید نفیسی نے اس کی واپسی کی وجہ یہ لکھی ہے کہ وہ ایک متعصب سنّی مسلمان تھا، اور ہرات پر صفویوں کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا جو خود اپنے عقاید میں واصفی سے کم کٹر نہ تھے، اس لئے اس کو اپنی جان کا خوف لاحق ہوگیا اور وہ ہرات سے نکل کر ماوراء النہر چلا آیا۔ یہاں آکر وہ ازبک بادشاہوں کے دربار سے منسلک ہوگیا، جن کے ساتھ اس نے ماوراء النہر کے علاقے میں کئی سفر بھی کئے لیکن اس کا قیام زیادہ تر تاشقند ہی میں رہتا۔ واصفی نے ازبک بادشاہوں کی تعریف میں کافی قصاید لکھے ہیں جن میں صنایع شعری کا اس کثرت سے استعمال کیا گیا ہے کہ شاعری کی اصل روح دب کر رہ گئی ہے۔

واصفی کی سب سے مشہور تصنیف بدایع الوقایع[1] ہے اس کو ایک طرح کا روزنامچہ سمجھنا چاہئے، اس کتاب میں اس نے اپنے سفروں کی تمام سرگذشتیں، اپنے تمام مشاہدات اور وہ باتیں جو اس نے دوسروں سے سنی ہیں سب کی سب یکجا کر دی ہیں۔ یہ کتاب ۹۱۸ھ سے ۹۵۷ھ تک کی سرگذشت پر مشتمل ہے اس کتاب کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے

---

[1] اس کتاب کا نسخہ کتاب خانہ جامعہ ملیہ میں آگیا ہے جس کی روشنی میں واصفی کی نظم و نثر نگاری پر ایک مفصل مقالہ زیر ترتیب ہے۔

کہ اس میں واصفی کے بہت سے قصاید ہم کو یک جا مل جاتے ہیں جو اس نے ازبک بادشاہوں کی مدح میں لکھے ہیں۔

واصفی کی شاعری جتنی زیادہ تصنعات سے پُر ہے اس کی نثر نگاری اس کے برعکس اتنی ہی سادہ اور سہل ہے جس میں کہیں کہیں علاقائی الفاظ، فقرے اور جملے بھی مل جاتے ہیں یہ دلچسپ کتاب نہ صرف اس زمانے کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن سے ہم کو آشنا کرتی ہے بلکہ اس کی مدد سے وسط ایشیا کے مختلف علاقوں کا لسانی مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے جو یقیناً ایک دلچسپ اور نتیجہ خیز کام ہوگا۔

کچھ تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے ۹۳۱ھ میں انتقال کیا، لیکن یہ بات کسی طرح درست نہیں ہو سکتی کیوں کہ بدایع الوقایع میں ۲۲/ رمضان ۹۵۰ھ تک کے واقعات کا اندراج ہے اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا انتقال ۹۵۰ھ کے بعد کسی سنہ میں ہوا ہوگا۔ اس کے علاوہ جن تذکرہ نگاروں نے اس کی وفات کا سنہ ۱۹۳۱ھ قرار دیا ہے وہی لوگ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ کا دوسرا مشہور شاعر زیرکی جو واصفی کا غلام تھا ۹۸۲ھ میں فوت ہوا۔ یہ بات قرین قیاس نظر نہیں آتی کہ زیرکی اپنے آقا کے انتقال کے ۵۰ برس بعد تک زندہ رہا ہو۔ اس لئے اس کا سنہ وفات ۹۵۰ھ کے بعد قرار دینا مناسب ہے۔

واصفی کا میدان سخن قصاید و غزلیات تک محدود ہے، جس میں اس نے اپنے فنکارانہ جوہر دکھائے ہیں لیکن اس کی شاعری پر صنایع کا اتنا زیادہ غلبہ تھا کہ اس کی شاعری صرف صنعت گری کی مثال بن کر رہ گئی غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم کو عام فارسی شعرا کے تذکروں میں اس کے اشعار بآسانی دستیاب نہیں ہوتے،

<u>زیرکی تاشقندی</u>: واصفی کے تذکرہ میں عرض کیا جا چکا ہے کہ زیرکی ان کا غلام تھا، بعض قرائن ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرکی کو ۹۲۰ھ میں غلامی کی لعنت سے رہائی ملی اور وہ اسی سال تاشقند سے بخارا چلا گیا۔ بخارا پہنچ کر وہ حصولِ علم کی طرف متوجہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں

شہر کے دانشمندوں سے نہ صرف روشناس ہوگیا بلکہ ان سے بڑے شگفتہ تعلقات بھی قائم کر لئے ۔ ابھی اس کو بخارا آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ ایک نوجوان پر عاشق ہوگیا، یہ عشق یہاں تک بڑھا کہ زیرکی نے خود کو اسی نوجوان کے ہاتھ دو سال کے لئے فروخت کر دیا، بلکہ جب اپنے آقا کے گھر پہونچا اور اس کی خدمت میں مصروف ہوا تو اس کے آقا کو معلوم ہوا کہ اس کا غلام کس پایہ کا دانشمند اور شاعر ہے اس نے زیرکی کو اپنی غلامی سے آزاد کر دیا ۔ حصول آزادی کے بعد زیرکی بخارا سے بلخ چلا گیا جہاں وہ تیمور کے خاندان کی ایک یادگار میرزا ابراہیم بن سلیمان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ لیکن یہاں کی سیاسی حالت چند ہی دنوں میں بدل گئی اور ابراہیم بن سلیمان، عبداللہ خان سے مغلوب ہوا جس کے نتیجہ میں عبداللہ خاں بلخ کا حکمراں بن گیا ۔ اسی زمانہ میں زیرکی نے عبداللہ خاں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں اس کو پانچ سو خانی تنکے ملے ۔ زیرکی نے ۹۸۲ھ میں بلخ میں وفات پائی ۔

زیرکی کی شاعری مستی و سرشاری کی شاعری ہے اور اس کا ایک ایک شعر اس کی طبعی سرشاری کی یادگار ہے ۔

مولانا زادہ فکری تاشقندی | فکری کے بارے میں ہماری معلومات بڑی ہی تشنہ ہیں ۔ مولانا عبدالغفار نام کے ایک تاشقندی بزرگ تھے جن کا شمار ماوراء النہر کے دانشمندوں میں ہوتا اور اس علاقہ میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ۔ فکری انھیں کا لڑکا تھا لیکن باپ کی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا تھا اس کے باوجود دھیرے دھیرے اس نے ترقی کی یہاں تک کہ اس کا شمار بھی دسویں صدی ہجری کے ماوراء النہر کے دانش مندوں میں ہونے لگا ۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے زمانے کے بہت سے دانشمندوں پر برتری بھی حاصل کی ۔ جہاں تک اس کی شاعری کا تعلق ہے سعید نفیسی کے بیان کے مطابق وہ استادانہ غزل گوئی میں ماہر تھا، اس بیان سے اس کی شعری کاوشوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس کی تاریخ پیدائش و وفات کا علم نہ ہو سکا ۔ یہ چند سطریں صرف اس لئے لکھ دی گئی ہیں تاکہ اس کے بارے میں مزید تحقیق ہو سکے ۔

مولانا خوشی تاشقندی | خوشی کے جو چند سطری حالات ہم کو دستیاب ہوتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے زمانہ کا ایک اہم شخص رہا ہوگا۔ اس کا تو علم نہ ہو سکا کہ وہ تاشقند میں کب پیدا ہوا؟ لیکن چوں کہ وہ نوروز احمد خاں کے زمانے میں تاشقند کی وزارت پر فائز تھا اس لئے اس کو دسویں ہجری کے شعرا میں شمار کرنا چاہئیے۔ جب زمانے نے پلٹا کھایا اور وہ وزارت سے معزول ہو گیا تو اس نے خانہ نشینی اختیار کر لی اور اسی عالم میں اس نے دنیا سے کوچ کیا۔ وہ صرف غزل گو تھا اور اپنے زمانے میں اس نے اس صنعت میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، اس شاعر پر بھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے اگر ممکن ہو سکا تو اس کی شاعری اور دورِ وزارت پر کسی دوسری صحبت میں روشنی ڈالی جائے گی۔

مولانا شہرتی درغزی تاشقندی | مولانا شہرتی شاعر سے زیادہ صوفی کی حیثیت سے معروف ہیں چوں کہ ان کا سنہ وفات ۹۰۱ھ ہے اس لیے ان کا شمار گیارہویں صدی کے شعرا میں کرنا چاہئیے تاشقند کی ایک نواحی بستی جس کا نام درغز ہے شہرتی وہیں کے رہنے والے تھے۔ وہ جس بستی کے رہنے والے تھے وہ لوہاروں کی بستی تھی ممکن ہے کہ ان کا بھی اس پیشے سے کوئی تعلق رہا ہو۔ جوانی ہی میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر حج کے لئے بھی گئے جس سے ان کی مذہبیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شہرتی مولانا لطف اللہ جوینی کے مرید تھے جو ایک کاشانی عالم مولانا خواجگی کے مشہور خلفا میں تھے، شہرتی جب مولانا لطف اللہ کے مرید ہوئے تو ایک عرصہ تک زیارت شاذ کرتے رہے اور برابر اپنے پیر کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس کے علاوہ اپنے پیرزادہ مولانا محمد جو خواجہ کلاں کے نام سے مشہور تھے ان کی خدمت میں بھی باریاب ہوئے۔ خواجہ کلاں کی ہی خدمت میں ان کی شام زندگی نمودار ہوئی، شام زندگی کی تاریکی میں ان کو پھر اس دیار مقدس کی یاد [illegible] کی زیارت وہ ایام جوانی میں کر چکے تھے چنانچہ ۹۰۱ھ میں دوبارہ سفرِ حج پر روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ شام ہی پہونچے تھے کہ ان کا وقت آخر آگیا اور وہ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ شام سے ان کا جسد خاکی تاشقند لایا گیا اور ان کو شیخ حسین خوارزمی کے مزار کے

پاس ایک چھوٹے سے میدان میں دفن کر دیا گیا۔ اتنا سہی مذہبیت کے باوجود ان کا شمار اپنے زمانے کے بہترین غزل گویوں میں ہوتا ہے، ان کی پوری کی پوری شاعری ان کے حالِ دل کی ترجمان ہے جس میں جوش و گہرائی کے ساتھ ساتھ بلا کی حدت بھی ہے۔

خواجہ حامد تاشقندی | خواجہ حامد کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہو سکیں، جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان کی بنا پر بلا تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا شمار اپنے زمانے کے اہم ترین افراد میں تھا جن کی عالی دماغی، شیریں سخنی اور خوش رفتاری کا ذکر سعید نفیسی نے بھی کیا ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا سنہ ولادت و وفات کیا ہے۔ ان کی شاعری صرف غزلیات تک محدود ہے جس کو تذکرہ نگاروں نے استادانہ غزل کہا ہے یہ بڑی بندھی ٹکی اصطلاح ہے اس لئے جب تک ان کے کلام کے کچھ نمونے سامنے نہ ہوں ان کے اشعار کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔

عبداللہ بیگ تاشقندی | عبداللہ بیگ کے والد تاشقند کے رہنے والے تھے جو ہندوستان چلے آئے تھے۔ عبداللہ بیگ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا اور جوانی کے زمانے میں خانِ خاناں کے دربار سے منسلک ہو گیا بڑا ہی سریع الفہم اور پرجوش انسان تھا لیکن اس میں خرابی یہ تھی وہ مغرور اور خود پسند تھا، اسی لئے اپنے زمانے کے شعرا کی مخالفت کا شکار رہا اور اس کے زمانے کے لوگ اس کو طنزاً "دختر انوری" کہتے۔ وہ ۱۰۰۷ھ تک زندہ رہا، اسی سال برار میں اس کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہے۔ عبداللہ بیگ اپنے زمانے کے مشہور غزل اور رباعی گویوں میں شمار کیا جاتا ہے مجھے اس کی شاعری کے نمونے نہیں مل سکے، عہدِ اکبری کے تذکروں کی ورق گردانی کے بعد اگر اس کے سلسلے میں مزید مواد فراہم ہو گیا تو کسی دوسری صحبت میں آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

مولانا صابری تاشقندی | مولانا صابری اپنے زمانے کے مشہور دانشمندوں اور فقیہوں میں تھے، دوسرے فقہا کی تصانیف پر انھوں نے حواشی بھی لکھے تھے اس سے ان کی علمیت کا ہلکا سا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس مذہبیت کے باوجود اپنے زمانے کے ایک دوسرے عالم مولانا حلیمہ سے ان کا اختلاف ہو گیا یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ نوبت ہو گوئی تک پہنچی اس حمام میں سب

ہی ننگے ہو جاتے ہیں وہ بھی ننگے ہوتے بغیر نہ رہے جب یہ اختلاف اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو وہ تاشقند سے سمرقند چلے گئے جہاں ان کو قاضیٔ شہر مقرر کیا گیا۔ ان کی شاعری ہر صنفِ سخن پر محیط ہے مگر غزلیات کے میدان میں ان کی فنی چابک دستی زیادہ ظاہر ہوتی ہے اور ان کا شمار اپنے زمانے کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے سنہ ولادت و وفات کا پتہ نہیں چل سکا لیکن بعض قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دسویں صدی ہجری کے اواخر یا گیارہویں صدی ہجری کے اوایل کے شاعر تھے،

محمد ایوب تاشقندی | ایوب تاشقندی کا بھی شمار مذہبی افراد میں ہوتا ہے۔ رسیمان بازی میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور اس میدان میں عجیب و غریب کام انجام دیتے، لیکن یہ کام ان کو بھایا نہیں اس لئے اس سے دست کش ہو کر حصولِ علم کی طرف راغب ہوئے اور شاعری میں نقابی اندکانی کے شاگرد ہو گئے۔ ان کے چند سطری حالات جو ہم کو دستیاب ہو سکے ہیں ان کی زندگی کے کسی پہلو پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتے اور نہ ہی ان کی شاعری کے بارے میں کوئی اشارہ کرتے ہیں اسلئے ہم بھی انکا تذکرہ کرتے ہیں

مولانا زادہ عبدالغفار تاشقندی | ان کے نام میں مولانا زادہ کے اضافے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی مذہبی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ خود بھی ایک مدت تک منصب قضا پر فائز رہے لیکن جب اس منصب سے معزول ہو گئے تو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میدان میں بھی انھوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ ان کی غزل گوئی کو "غزل را خوب می سرودہ است" کہا گیا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلیں شگفتہ اور جاذب نظر ہوں گی اگر ایسا نہ ہوتا تو خوب کا لفظ نہ استعمال کیا جاتا۔

کمال الدین تاشقندی | بعض قراین کی بنیاد پر ان کو دسویں صدی ہجری کا شاعر کہا جا سکتا ہے ان کا شمار اپنے زمانے کے مشہور صوفیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں ہم کو صرف اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے ایک مثنوی شمع و پروانہ کے نام سے لکھی ہے، اس کے علاوہ سردست ان کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔

نجاتی تاشقندی | ان کے بابت بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ حصولِ تعلیم کے لئے بخارا گئے

تھے، وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے یا تاشقند واپس آ گئے تھے، کون تھے، کیا کرتے تھے، کس طرح کی زندگی بسر کی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے ان کی شاعری کے بارے میں ایک عام جملہ "غزل را خوب می گفتہ است" کہہ دیا گیا ہے اور بس۔ چوں کہ ان کے سوانح حیات پردۂ خفا میں ہیں اس لئے ہمارے لئے یہ عرض کرنا بھی دشوار ہے کہ یہ دسویں صدی کے بزرگ ہیں یا گیارہویں صدی کے۔ اس تذکرہ میں ان کا ذکر اس لئے کر دیا گیا ہے تاکہ کبھی آگے چل کر ان کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی جا سکیں۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے تشنہ ہے اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب اس بات کی کتنی سخت ضرورت ہو گئی ہے کہ آذربائیجان، تاجکستان، ازبکستان وغیرہ کے فارسی شعراء کے الگ الگ تذکرے مرتب کر دیئے جائیں اور ان کے بارے میں جو کچھ بھی مواد فراہم ہو سکے اس کو یک جا کر دیا جائے ورنہ اس وقت جو بھی مواد دستبرد زمانہ سے بچا ہوا ہے ممکن ہے کہ زمانے کے تند و تیز جھونکے اس کو بھی بحرِ فنا میں غرق کر دیں۔

تصحیح

برہان جنوری ۱۹۷۶ء

ص ۲۸ حوالہ ابن قیم کتاب الروح غلط ہے۔ صحیح حوالہ شاہ ولی اللہؒ الفوز الکبیر ص ۱۲ ہے۔

ص ۲۷ پر آخری سطر میں لفظ قرینہا کا حوالہ درج ہونے سے رہ گیا۔ اس کا حوالہ ابنِ قیم کتاب الروح ہے۔

تبصرے

مدارج سلوک: از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۷۸ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد پانچ روپیہ۔ پتہ:۔ مجلس معارف القرآن، دارالعلوم دیوبند۔

سلوک وطریقت کی غرض وغایت تقرب مع اللہ ہے، لیکن یہ صفت کب اور کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ یہی درحقیقت تصوف کا موضوع ہے، اس کتاب میں اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے اُن طریقوں کو بیان کیا گیا ہے جن سے یہ مقصد اور اُس کے ثمرات ونتائج حاصل ہوتے ہیں یہ طریقے چار ہیں

۱۔ تذکیۂ نفس یعنی نفس کو مذموم حیوانی اوصاف سے پاک کرنا۔

۲۔ تصفیۂ قلب: قلب کو غمِ دنیا اور اندیشۂ سود وزیاں سے آزاد کرنا۔

۳۔ تخلیۂ سر: یعنی سر جو ایک لطیفۂ ربّانی ہے اُس کو ماسوائے حق سے آزاد کرنا۔ اور

۴۔ تجلیۂ سر: روح کو انوار وتجلیاتِ حق سے منور کرنا۔ فاضل مصنف نے ان چاروں طریقوں کی تشریح وتوضیح بڑے دلچسپ اور موثر انداز میں کی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف سلاسلِ تصوف، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور قادریہ کے معمولات اور اُن کے اذکار واوراد کا ذکر کیا ہے، فاضل مصنف مرحوم کی عادت اور طرزِ تحریر کے مطابق جگہ جگہ صوفیائے کرام کے حد درجہ ولولہ انگیز اشعار نے کتاب کو پراز معلومات ہونے کے ساتھ بے حد وجد آفرین بھی بنا دیا ہے، اس کا مطالعہ ہم خرما وہم ثواب کا موجب ہوگا۔

توحید سے تثلیث تک: از جناب ایس۔ ایم شریف قریشی، تقطیع خورد، ضخامت

۵۶ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ایک روپیہ۔ پتہ:۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد۔ دہلی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُن چند جلیل القدر پیغمبروں میں سے ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید میں بار بار اور بڑے اہتمام سے کیا گیا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اُن کی تعلیم تمام تر توحید کی ہی تھی لیکن اس تعلیم پر تغیر و انقلاب کے کتنے اور کیسے دور آئے ہیں جن کے نتیجہ میں یہ تعلیم بالکل مسخ ہو گئی اور اُس کی جگہ اقانیم ثلاثہ کا عقیدہ پیدا ہوا؟ اس کتاب میں جو درحقیقت "ماٰخذ المسیحیت" کے نام سے ایک زیر تالیف کتاب کی تلخیص ہے، اسی موضوع پر گفتگو کی گئی ہے گویا یہ "مسیحیت" کی مختصر تاریخ ہے، مگر لائق مرتب نے جو کچھ لکھا ہے مستند حوالوں کی روشنی میں لکھا ہے، اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ لب و لہجہ اور زبان مناظرانہ نہیں، بلکہ سنجیدہ، متین اور مورخانہ ہے۔

حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ: از ڈاکٹر شیخ فرید۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۸۰ صفحات، کتابت وطباعت متوسط۔ قیمت 7/50۔ پتہ:۔ انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ، ۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۔۔۱

حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ (۹۶۳ھ تا ۱۰۳۱ھ) برہانپور اکابر اولیاء اللہ میں سے صاحب وجد و حال اور صاحب تصانیف شتی بزرگ تھے، لائق مصنف نے اس کتاب میں جو درحقیقت اُن کے مقالۂ ڈاکٹریٹ کا ایک حصہ ہے حضرت موصوف کے حالات و سوانح۔ احوال و مقامات، ارشادات و تعلیمات اور تصنیفات و تالیفات کا مبسوط تذکرہ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے بڑی تحقیق و تلاش اور ممکنۃ الحصول مطبوعہ و مخطوطہ ماٰخذ کی روشنی میں لکھا ہے، تاریخ و ادب کے اساتذہ اور طلبا کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

اُردو مصدر نامہ از مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف۔ تقطیع کلاں، ضخامت ۴۳۴ صفحات، طباعت وکتابت بہتر، قیمت غیر مجلد -/15۔

پتہ:۔ بکڈپو انجمن ترقی اردو، اُردو بازار، دہلی۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اگرچہ ایک عوامی زبان کی حیثیت سے اُردو روز بروز
کمزور ہوتی جارہی ہے لیکن علمی اور تحقیقی حیثیت سے وہ برابر شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور
اُس کے اس ذخیرہ میں حوصلہ افزا اضافہ مسلسل ہورہا ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی اسی زمرہ میں
شامل ہونے کے لائق ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں فارسی کی صفوۃ المصادر
کے انداز پر اردو کے مصادر جمع کئے گئے ہیں جو تعداد میں تیرہ سو کے لگ بھگ ہیں ہر مصدر
کی نسبت بسط و تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ اس کی اصل کیا تھی،
اس کے مشتقات کیا ہیں، یہ کن کن معانی میں مستعمل ہوتے ہیں، اپنے دعوی کے ثبوت
میں لائق مؤلف نے کثرت سے اساتذہ کے اشعار بھی بہ طور سند پیش کئے ہیں اور بعض جگہ اگر
کسی کی رائے سے اختلاف ہے تو اُس کا بھی اظہار کرتے گئے ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں بعض جگہ خود
موصوف غلط فہمی کا شکار ہوگئے اور جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں۔ مثلاً ص ۳۴ پر آنا
بمعنی چلنا۔ مصنف کو اس پر اعتراض ہے لیکن حق بات وہی ہے جو فرہنگ آصفیہ اور
نوراللغات میں ہے اور جس کی سند میں ظفر کا ایک شعر پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ص ۳۵ پر
مصنف کہتے ہیں کہ "آئی" بمعنی موت نہیں آتا۔ حالانکہ آتا ہے اور صحیح بات وہی ہے
جو فرہنگ آصفیہ کے مولف نے لکھی ہے اور میر کے شعر سے اُس کی سند پیش کی ہے۔
درحقیقت یہ اہلِ زبان کے وہ استعارات ہیں جو منطقی موشگافیوں سے بلند و بالا اور
آزاد ہیں اور انھیں پر بلاغت کا دارومدار ہے، پھر اسی صفحہ پر مصنف نے یہ تو ٹھیک
لکھا ہے کہ "آئی" "آنا" سے مشتق اور صفت مونث "آنے والی" کے معنی میں مستعمل
ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی لکھنا چاہیئے تھا کہ جب یہ لفظ ثانی کے ساتھ بولا جاتا ہے اُس
وقت لفظ آن" بمعنی لمحہ میں یائے نسبت کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے، علاوہ ازیں ص ۲۹
پر موضع کو بر وزن مجلس کہنا صحیح نہیں ہے۔ ضاد پر کسرہ نہیں فتحہ ہے۔ بہر حال اسی نوع
کے مسامحات سے قطع نظر کتاب بنفسہٖ بہت مفید ہے، بڑی محنت اور تلاش سے
لکھی گئی [illegible] عجیب

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔ تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید، طبع جدید زیر ترتیب، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس، روس انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب اور کوائف۔

سنہ ۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط، امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

سنہ ۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے، عرب دنیا، تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار۔ نیل سے فرات تک۔

سنہ ۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم، تاریخ ردہ، سرگزشت ضلع بجنور، علماء ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

سنہ ۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات، لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم، مرد مشتق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

سنہ ۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

سنہ ۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب، اخبار التنزیل، عربی شاعری میں قدیم ہندوستان

Regd. D. (D) 231 Phone 263818 February 19

Subs. Rs. 15-00 Per Copi Rs.1-50

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر بُرہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

9

جلد ۷۶ (۴)
اپریل ۱۹۷۶ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعاتِ ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہمِ قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرٹریہ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

جلد نمبر ۷۶ | بابت ماہ ربیع الآخر ۱۳۹۶ھ مطابق اپریل ۱۹۷۶ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

نظرات

صد حیف، ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی بھی گذشتہ ماہ ہم سے جدا ہو گئے، عمر پچاسی چھیاسی کے قریب ہوگی، ہماری گذشتہ نسل میں برصغیر انڈو پاک کی یونیورسٹیوں میں عربی اور فارسی کے جو نامور اور بلند پایہ اعلیٰ مغربی تعلیم یافتہ اساتذہ پیدا ہوئے ہیں ڈاکٹر صاحب مرحوم اُن میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے اور اس بزم کی آخری شمع بھی تھے، مرحوم نے ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ رام پور میں پائی تھی یہ مدرسہ اُس زمانہ میں منطق اور فلسفہ کے لئے مشہور تھا اور مولانا محمد طیب مکی اور مولانا فضل حق ایسے نامور فاضل روزگار اس مدرسہ کے علی الترتیب پرنسپل اور صدر المدرسین تھے، مرحوم نے دونوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا، لیکن ابھی فارغ نہیں ہوتے تھے کہ ایک مرتبہ مدرسہ کے بنگالی اور پٹھان طلبہ میں سخت فساد ہو گیا اور دو بنگالی طالب علم مارے گئے، ریاست نے فوراً مدرسہ کے بند کرنے اور طلبہ کو ہوسٹل چھوڑنے کا حکم دیا، ڈاکٹر صاحب نے خود بیان کیا تھا کہ اس حکم کے ماتحت وہ بھی رام پور چھوڑ کر مرادآباد آگئے تھے اور وہاں شاہی مسجد کے مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ لیکن جی نہ لگا اور چند مہینوں کے بعد اسے بھی چھوڑ کر وطن (بہار) آگئے، اب انھوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر انگریزی کے امتحانات دینے شروع کئے، عربی میں ایم۔اے کے بعد حکومت بہار کے وظیفہ پر کیمبرج گئے اور ڈاکٹر ہوئے، وطن واپس آکر کچھ دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد رہے، پھر جس زمانہ میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور انھوں نے اپنے والد سر آسوتوش مکرجی کے نام پر یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و ثقافت

کا ایک شعبہ کھولا تھا وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اس شعبہ کے سربراہ کی حیثیت سے لکھنؤ سے کلکتہ لے آئے، عربی اور فارسی کے مشترک شعبہ کے صدر اور پروفیسر بھی مقرر ہوتے اور آخر ۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء میں اس عہدہ سے سبکدوش ہوکر کلکتہ میں مستقلاً اقامت گزیں ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب عربی انگریزی اور اردو تینوں زبانوں کے بلند پایہ مصنف تھے، عربی میں ان کی کتاب "السیر الحثیث فی تدوین الحدیث" اور انگریزی میں "حدیث لٹریچر" اور عربی و فارسی میں طب" بڑی محققانہ اور معرکہ آرا کتابیں ہیں ان کے علاوہ انھوں نے "تاریخ بہراۃ" اور "فردوس الحکمۃ"، یہ دونوں کتابیں اڈٹ بھی کی تھیں "اسلام میں عورت کا مرتبہ" کے عنوان سے ایک طویل محققانہ مقالہ بھی لکھا تھا، اُن کا ارادہ مزید اضافہ کرکے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا تھا لیکن غالباً یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ مستشرقین میں بھی اُن کا بڑا اعتبار اور وقار تھا، طبعاً بڑے خلیق، شگفتہ طبع اور متواضع تھے، دینداری انھوں نے ورثہ میں پائی تھی، راقم الحروف سے انھیں ایسا تعلق خاطر تھا کہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں ہفتہ میں ایک مرتبہ میں اُن کے یہاں جاتا تھا اور ایک مرتبہ وہ اکثر متعلقین کے ساتھ تشریف لاتے تھے، اللہ تعالیٰ اُن کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے، اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے، ضرورت ہے کہ اُن پر ایک مستقل مقالہ شائع کیا جائے موقع ہوا تو یہ فرض جو برہان پر قرض ہے برہان انجام دے گا۔

گذشتہ ماہ مارچ کی تین تاریخ سے ۱۴ تک پاکستان میں بڑے طمطراق اور شان و شوکت سے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس وزارت امور مذہبی و اوقاف اور ہمدرد فاونڈیشن کے مشترکہ اہتمام و انتظام کے ماتحت منعقد ہوئی، اس کانفرنس کی یہ خصوصیت عجیب و غریب تھی کہ یہ کسی ایک شہر میں نہیں ہوئی، بلکہ متحرک رہی، چنانچہ وزیر اعظم مسٹر بھٹو

کی ایک طویل تقریب سے اس کا افتتاح اسلام آباد میں ۳ رمارچ کو ہوا۔ ۵ رمارچ سے لاہور میں ہوئی ۱۰ ارکو پشاور منتقل ہوگئی، دوسرے دن کراچی آگئی اور ۱۴ رکو اختتام پذیر ہوئی علمی اور مقالاتی پروگرام کے ساتھ سماجی اور سیر و سیاحت کا پروگرام بھی برابر چلتا رہا، پینتالیس (۴۵) اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی جن میں مستشرقین یعنی عیسائی اور یہود بھی شامل تھے اور کچھ مسلم وغیر مسلم خواتین بھی مندوب تھیں، ہندوستان سے اڈیٹر برہان کے علاوہ تین اور حضرات شریک ہوئے، کلکتہ یونیورسٹی کے ایک ہندو پروفیسر جو صدر شعبۂ اسلامی تاریخ و ثقافت ہیں وہ بھی مدعو تھے مگر نہ گئے امام حرم شیخ عبداللہ بن سبیل ہم مندوبین کی بارات کے دولھا تھے، جب وہ ہوٹل سے باہر آتے تھے تو لوگ دست بوسی کے شوق میں اُن پر پروانوں کی طرح گرتے تھے لاہور اور کراچی میں انھوں نے نماز جمعہ پڑھائی تو اخبارات کی رپورٹ کے مطابق پندرہ بیس لاکھ انسانوں کا مجمع تھا، شیخ جامع ازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی بلند و بالا شخصیت بھی امام حرم کے سامنے دب کے رہ گئی تھی، چنانچہ وہ کراچی پہونچنے کے دوسرے ہی دن قاہرہ واپس ہو گئے، راقم الحروف ۳ رمارچ کو روانہ ہوا تھا، ۲۹ رکی شب میں وطن واپس پہنچا، اس سفر کی پوری روئداد جو معلومات افزا بھی ہوگی اور فکر آمیز بھی قارئین برہان کو سنانے کا ارادہ ہے، مگر ابھی غزوات کا مقالہ ہی ختم نہیں ہوا، اڈیٹر کے قلم سے ایک ہی اشاعت میں دو دو مقالات برہان کے مقالہ نگاروں کے ساتھ ناانصافی تو نہیں!

---

۲۶ رمارچ کو دلی اڈمنسٹریشن نے ایک شاندار تقریب میں مختلف زبانوں کے چند ادیبوں اور فن کاروں کو از راہ قدردانی انعامات تقسیم

گئے ہیں، اس فہرست میں اڈیٹر برہان کا نام بھی شامل ہے، ہر چند کہ اپنا تصنیف و تالیف اور تحریر و کتابت کا کام جتنا اور جیسا کچھ بھی ہے خلوص اور دل کی لگن کے ساتھ ہے اور اس میں ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کو دخل نہیں تاہم قدردانی اور تحسین جس طرف سے اور جس شکل میں بھی ہو بہرحال شکریہ کی مستحق ہے۔ اس لئے راقم اڈمنسٹریشن کا شکر گذار ہے اور جن دوستوں نے مبارکباد کے پیغام بھیجے ہیں اُن کا بھی!

افسوس ہے سفر پاکستان اور سیرت کانفرنس کے لئے انگریزی میں "اسلام میں سماجی انصاف" کے زیر عنوان مقالہ لکھنے کے باعث جو پشاور کے سیشن میں پڑھا گیا غزوات کی قسط نہ مارچ میں آسکی اور نہ اس اشاعت میں شریک ہو سکی، خدا کو منظور ہوا تو مئی کے پرچہ میں اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

حدیث کا درائتی معیار

داخلی فہمِ حدیث

۹

(۳) وقت نبوّت

مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

وقت نبوت تخم نبوت کی تربیت و پرورش کے بعد جوہر انسانیت جب اس قابل ہوگیا کہ عالم بیداری میں برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر اخذ و استفادہ اور کسب فیض کرسکے تو نبوت و رسالت کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔

نبوت کی قابلیت کیوں کر پیدا ہوئی؟ یہ قابلیت اس طرح پیدا ہوئی کہ نورانی شعاعوں کے ذریعہ "زائد قوت" پہنچانے سے ایک طرف نورانی بنیاد کے قویٰ و خواص متوزہ ہو گئے اور دوسری طرف حیوانی بنیاد کے وہ شعلے بجھ گئے جو شیطان کی آماجگاہ تھے قویٰ و خواص کے منور ہو جانے ہی کی بنا پر غالباً قرآن حکیم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نور سے تعبیر کیا گیا۔

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین ۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور (رسول) اور ظاہر کرنے والی کتاب آئی۔

المائدہ رکوع ۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس "نور" میں اضافہ کی برابر دعاء فرماتے رہے۔

اللهم اجعل لی نوراً فی قلبی واجعل لی نوراً فی سمعی واجعل لی نوراً فی بصری واجعل لی نوراً عن یمینی ونوراً عن شمالی واجعل لی نوراً من بین یدی ونوراً من خلفی وزدنی نوراً وزدنی نوراً وزدنی نوراً ۱	اے اللہ میرے لئے میرے قلب میں نور ہو میرے کان اور میری آنکھ میں نور ہو میرے لئے میرے دائیں اور بائیں نور ہو میرے آگے اور میرے پیچھے نور ہو میرے نور میں اضافہ فرما میرے نور میں اضافہ فرما میرے نور میں اضافہ فرما۔

قاضی بیضاوی نے قویٰ وخواص کے منور ہونے کی ایک حد بھی بیان کی ہے۔

الا تری ان الانبیاء لما فاقت قوتهم واشتعلت قریحتهم بحیث یکاد زیتها یضیٔ ولو لم تمسسه نار ارسل الیهم الملائکة ۲	کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ جب انبیاء کی قوت فائق ہوگئی اور ان کی طبیعت اس درجہ روشن ہوگئی کہ گویا زیتون کا تیل آگ چھوئے بغیر خود بخود روشن ہے تو اللہ نے ان کے پاس فرشتے بھیجے۔

شعلے بجھ جانے کا ثبوت اوپر کی حدیث میں ہے کہ شیطان کے بارے میں رسول اللہ ؐ نے فرمایا فاسلم (وہ میرا مطیع ہوگیا) اور شاہ ولی اللہ کی اس تعبیر میں بھی ہے۔

اما شق الصدر وملؤه ایماناً فحقیقته غلبة انوار الملکیة وانطفاء لهب الطبیعة وخضوعها لما یفیض علیها من حظیرة القدس ۳	لیکن شق صدر (سینہ چاک کرنا) اور اس کو ایمان سے بھرنے کی حقیقت انوار ملکیہ کا غلبہ اور طبیعت بشریہ کا شعلہ بجھ جانا ہے نیز حظیرۃ القدس (نورانی دنیا) سے فیض قبول کرنے کی طرف طبیعت کا آمادہ اور متوجہ ہو جانا ہے

---

۱ بخاری الادب المفرد باب دعوات النبیؐ

۲ قاضی ناصر الدین البیضاوی بیضاوی رکوع ۴ تفسیر واذ قال ربک للملٰئکة الخ

۳ ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم

نبوت کی قابلیت میں بشریت ختم نہیں ہوتی

"شعلے" بجھ جانے کے باوجود حیوانی بنیاد ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے قویٰ وخواص باقی رہے اور متعلقہ اعمال وافعال صادر ہوتے رہے جیساکہ انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں بشری طبیعت وخصوصیات سے کسی کو انکار نہیں ہے حیوانی بنیاد کو نورانی شعاعوں کے ذریعہ اس تناسب سے متاثر کیا گیا کہ نورانی دنیا سے فیض حاصل کرنے کی رکاوٹ دور ہوجائے اور قبول فیض کے لئے راستہ ہموار ہوجائے۔ اگر نورانی شعاعوں کے ذریعہ اس بنیاد کے قویٰ وخواص جلادئے جاتے تو رسول اور نبی کی بشریت ختم ہو جاتی اور پھر ان کی زندگی دوسرے انسانوں کے لئے "نمونہ" نہ قرار پاتی، قاضی بیضاوی نے تناسب کے بعد کی کیفیت کو جسم انسانی کی ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے۔

ان العظم لما عجز عن قبول الغذاء	ہڈی اور گوشت کے درمیان تباعد (دوری) کی وجہ
من اللحم لما بینهما من التباعد جعل	سے جب ہڈی گوشت سے غذا حاصل کرنے میں عاجز
الباری تعالیٰ بحکمته بینهما الغضروف	ہوئی تو اللہ نے اپنی حکمت سے غضروف (چپنی ہڈی)
المناسب لهما لیاخذ من هذا ویعطی	پیدا کردی تاکہ وہ اس سے غذا حاصل کرکے اس کو دے
ذلك[1]	

غالباً اس تناسب کی کیفیت کو ملاحظہ کرتے اور مادی ونورانی دنیا کے فاصلہ کو مزید کم کرنے کے لئے ابتداء وحی کے وقت فرشتہ (جبریل) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دبانے اور بھینچنے کی روش اختیار کی جیساکہ حضرت عائشہ سے غار حراء کا واقعہ اس طرح مروی ہے:

فجاءه الملك فقال اقرأ فقال ما انا بقارئ	پھر آپ کے پاس فرشتہ آیا اور کہا اقرأ (پڑھئے) آپ
قال فاخذنی فغطنی حتی بلغ منی الجهد	نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں آپ کا ارشاد ہے
ثم ارسلنی فقال اقرأ فقلت ما انا بقارئ	کہ فرشتہ نے اس زور سے مجھ کو پکڑ کر دبایا کہ مجھکو مشقت
فاخذنی فغطنی الثانیة حتی بلغ منی الجهد	برداشت کرنی پڑی پھر اس نے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھئے

[1] قاضی ناصر الدین۔ بیضاوی م م تغیر واذ قال ربك الخ

ثم ارسلنی فقال اقرأ فقلت ما انا بقاری
فاخذنی فغطنی الثالثة حتی بلغ منی
الجهد ثم ارسلنی فقال اقرأ باسم ربك
الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ
وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان
مالم یعلم[1]

میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں پھر اس نے زور
سے بھینچا اور ویسی ہی مشقت اٹھانی پڑی اس طرح تین
مرتبہ ہوا اس کے بعد اس نے کہا " اقرأ باسم ربك
الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ
وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان
مالم یعلم۔

قابلیت کے بعد باضابطہ فیض رسانی شروع ہوگئی

مذکورہ قابلیت کے بعد نورانی دنیا سے فیض رسانی کا باضابطہ سلسلہ شروع کر دیا گیا جو بالعموم فرشتوں کے ذریعہ انجام پاتا تھا (جیسا کہ فرشتوں کے ذکر میں گذر چکا کہ وہ اللہ اور رسولوں کے درمیان سفارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے) لیکن فیض رسانی کی بعض خاص شکلیں بھی تھیں جیسا کہ ان آیتوں میں ہیں۔

ونادیناہ ان یا ابراھیم[2]　　اور ہم نے اس کو پکارا کہ اے ابراہیم

وکلم اللہ موسیٰ تکلیما[3]　　اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا بول کر

اوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ[4]　　وحی کی اپنے بندہ (محمد) کی طرف جو وحی کی

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی ایک شکل یہ بیان فرمائی

احیانا یاتینی مثل صلصلة الجرس وھو اشدہ علی[5]　　وحی کبھی میرے پاس مثل گھنٹہ کے آواز کے آتی ہے اور یہ میرے اوپر سخت ہوتی ہے۔

---

[1] بخاری ومسلم ومشکوٰۃ باب المبعث و بدء الوحی

[2] الصّفّت رکوع ۳

[3] النساء رکوع ۲۳

[4] النجم رکوع ۱

[5] بخاری ج ۱ باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قاضی بیضاوی کہتے ہیں

ومن منهم اعلیٰ مرتبة كلمه بلا واسطة كما كلم موسیٰ عليه السلام فی الميقات ومحمدا صلی الله عليه وسلم ليلة المعراج[1]

رسول اور نبی میں جو اعلیٰ مرتبہ کے تھے ان سے اللہ نے بلا واسطہ کلام کیا جیسے موسیٰ علیہ السلام سے میقات میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں کلام کیا۔

فیض رسانی کے وقت بعض کیفیات کی توجیہ

نورانی دنیا سے اخذ فیض کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن کیفیات سے دوچار ہونا پڑتا تھا ان میں بعض کا ذکر حدیثوں میں موجود ہے مثلاً چہرہ کا متغیر ہوجانا سردی کے زمانہ میں جبینِ اقدس پر پسینے کے قطروں کا نمودار ہونا اعصاب کا غیر معمولی بار محسوس کرنا اور استغراق کی کیفیت طاری ہونا وغیرہ۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔

ولقد رأيته ينزل عليه الوحی فی اليوم الشديد البرد فيفصم عنه وان جبينه ليتفصد عرقا[2]

سخت سردی میں جب آپ پر وحی آتی تو میں نے دیکھا کہ وحی کے بعد آپ کی پیشانی مبارک پسینہ پسینہ ہوجاتی تھی۔

حضرت یعلیٰ نے وحی کے وقت کی ایک کیفیت یہ بیان کی ہے۔

فاذا رسول الله محمر الوجه وهو يغط ثم سری عنه[3]

رسول اللہ کا چہرۂ مبارک سرخ تھا اور سانس دب رہی تھی پھر ایسی کیفیت دور کردی گئی۔

عبادہ بن صامت سے روایت ہے۔

اذا انزل عليه الوحی كرب لذلك وتربد وجهه[4]

جب آپ پر وحی نازل کی جاتی تو آپ اس کی شدت محسوس کرتے اور چہرۂ مبارک متغیر ہوجاتا۔

---

[1] قاضی ناصرالدین البیضاوی "بیضاوی رکوع ۴ تفسیر واذ قال ربك للملئكة الخ

[2] بخاری ج ۱ باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[3] بخاری ج ۱ کتاب المناسك باب غسل الخلوق ثلاث مرات [4] مسلم ومشکوۃ باب المبعث وبدء الوحی

ان کے علاوہ اور روایتیں بھی ہیں جن میں وحی کے وقت کی کیفیات کا ذکر ہے۔ یہ مختلف کیفیات دراصل حیوانی بنیاد کے قوی و خواص یا بشری طبیعت و خصوصیت کی موجودگی کا نتیجہ تھیں جن کو بہ وقت غذا و قوت پہنچتی رہتی تھی، نورانی شعاعوں کے ذریعہ "زائد قوت" پہونچانے کے باوجود یہ قوی و خواص باقی تھے اور ان کے ساتھ زبردست تصادم اس وقت ہوتا تھا جب آپؐ مقام نور (وحی) میں ڈوب کر اخذ فیض کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ مقام اس قدر لطیف ہے کہ اس کی نورانی لطافت معمولی مادی کثافت کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لامحالہ اس مقام کے مسافر کو مادی کثافتوں سے بلند ہونے کے لئے سخت قسم کی کشمکش سے دوچار ہونا پڑے گا جس کے آثار اعضاء و جوارح اور اعصاب پر لازمی طور سے ظاہر ہوں گے اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی بنا پر بعض بد دیانت مؤرخین نے ذات اقدسؐ پر اعتراض کیا ہے جس کا جواب پہلے دیا جا چکا۔

رسول اور نبی کا علم و ادراک اللہ کی طرف سے ہوتا تھا

نورانی دنیا سے یہ فیض علم و ادراک کی شکل میں حاصل ہوتا جو خالص اللہ کی طرف سے اور اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ہوتا تھا۔

رسول اور نبی کے علاوہ کسی اور کو یہ فیض (علم و ادراک) نہ اللہ کی طرف سے حاصل ہوتا اور نہ اس کی حفاظت و نگرانی رہتی تھی۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِىْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا[1]

ابراہیم نے کہا اے میرے باپ میرے پاس وہ علم آیا جو آپ کے پاس نہیں آیا آپ میری اتباع کیجئے میں سیدھے راستہ کی ہدایت کروں گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا[2]

اور ہم نے داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو علم دیا۔

---

[1] مریم رکوع ۳

[2] النمل رکوع ۲

وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان ولکن جعلنٰه نورا نھدی بہ من نشاء من عبادنا[1]

اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف قرآن کی وحی کی اپنے حکم سے نہ آپ کتاب جانتے تھے اور نہ ایمان (تفصیل جو وحی کے ذریعہ معلوم ہوئی) لیکن ہم نے اس کو روشنی بنایا کہ اس کے ذریعہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔

وعلمک مالم تکن تعلم[2]

اور اللہ نے آپ کو وہ سکھایا جو آپ نہ جانتے تھے

انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰک اللہ[3]

بے شک ہم نے آپ کی طرف سچی کتاب اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھلایا۔

متعلقہ حدیثیں | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہودیوں نے ایک مرتبہ پوچھا۔

فانہ لیس من نبی الا لہ ملک یاتیہ بالخیر فاخبرنا من صاحبک

ہر نبی کے لئے فرشتہ ہوتا ہے جو اس کے پاس خیر و بھلائی لاتا ہے۔ آپ اپنے صاحب (فرشتے) کے بارے میں بتایئے کہ وہ کون ہے؟

رسول اللہ نے جواب میں فرمایا۔

جبریل علیہ السلام[4]

وہ جبریل علیہ السلام ہیں

ایک موقع پر آپ نے فرمایا

علمت کم خزنۃ النار وحملۃ العرش[5]

میں نے جانا کہ دوزخ کے محافظ اور عرش کے اٹھانے والے کتنے فرشتے ہیں

---

[1] الزخرف رکوع ۵ [2] النساء رکوع ۱۷ [3] النساء رکوع ۱۶
[4] مسند احمد بن حنبل ج ۱ صفحہ ۲۷۴ عن ابن عباس
[5] ایضاً ج ۲ صفحہ ۲۱۲ عن عبداللہ بن عمرو بن العاص

ابو رفاعہ (صحابی) کہتے ہیں۔

وجعل یعلّمنی مما علّمہ اللہ[1] — اور آپ مجھ کو بتانے لگے اس علم سے جو اللہ نے آپ کو سکھایا

عمرو بن عبسہ جب اسلام قبول کرنے کے لئے آتے تو عرض کیا۔

اخبرنی عما علمک اللہ واجھلہ[2] — مجھے آپ وہ بتایئے جو اللہ نے آپ کو سکھایا اور میں اس کو نہیں جانتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ سے کہا

ما یمنعک ان تزورنا اکثر مما تزورنا قال فنزلت وما نتنزل الا بامر ربک[3] — جس قدر آپ میرے پاس آتے ہیں اس سے زیادہ آنے میں آپ کے لئے کون چیز مانع ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی "ہم اسی وقت اُترتے ہیں جب اللہ کا حکم ہوتا ہے"

حضرت عمرؓ کے تائیدی اقوال | ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے کاتب (سکرٹری) نے اُن کے فیصلہ کی پیشانی پر یہ الفاظ لکھ دئے۔

ھذا ما رأی اللہ ورأی عمرؓ — یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ کی اور عمر کی رائے ہے۔

اس پر حضرت عمرؓ نے منع کیا اور اللہ کی طرف نسبت کی جگہ یہ کہا

قل ھذا ما رأی عمر[4] — کہو کہ یہ وہ فیصلہ ہے جو حضرت عمر کی رائے ہے

اپنی رائے اور رسول و نبی کی رائے کا فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا

ایھا الناس ان الرای انما کان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ مصیبا — اے لوگو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے صائب و درست اس لئے ہوتی تھی کہ اللہ آپ کو دکھا

---

[1] مسلم کتاب الجمعہ باب حدیث التعلیم فی الخطبۃ

[2] مسلم صلوٰۃ المسافرین وقصرہا باب اسلام عمرو بن عبسۃ

[3] مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۳۱ عن ابن عباس

[4] ابن قیم اعلام الموقعین ج ۱ ما روی عن عمر فی الرای

ان اللہ کان یریہ وانما ھومنا الظن والتکلف[۱] — تھا ہماری رائے ظن اور تکلف ہے

اس علم وادراک کی حفاظت ونگرانی ہوتی تھی — اللہ کی حفاظت ونگرانی سے متعلق یہ آیتیں اور روایتیں ہیں۔

واصبر لحکم ربك فانك باعیننا[۲]	آپ اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے آپ ہمارے آنکھوں کے سامنے ہیں
ولولا ان ثبتناك لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلاً[۳]	اگر ہم آپ کو ثابت نہ رکھتے تو آپ ان کی طرف کچھ مائل ہو جاتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ نماز کے بعد فرمایا۔

ان الشیطان عرض لی فشد علیّ یقطع الصلوۃ علیّ فامکننی اللہ منه اردت ان اربطه الی ساریة من سوار المسجد الخ[۴]	شیطان آیا اور اس نے سختی کی کہ نماز کو قطع کردے اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی اور میں نے ارادہ کیا کہ مسجد کے ستونوں میں سے کسی ایک ستون میں اسے باندھ دوں

ایک روایت شیطان سے حفاظت ونگرانی کی اوپر گذر چکی

حضرت عائشہ سے روایت ہے

ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین احدھما الیسر من الاخر الا اختار الیسرھما مالم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منه[۵]	رسول اللہ کو جب کبھی ایسی دو باتوں کے درمیان اختیار دیا گیا کہ ان میں کی ایک دوسری سے زیادہ آسان ہے تو آپ نے ان میں سے آسان تر کو اختیار فرمایا جب کہ اس میں گناہ نہ ہوا اگر کوئی گناہ کا کام ہوا تو آپ سب سے زیادہ دور رہنے والے ثابت ہوئے۔

۱؎ ابن قیم اعلام الموقعین ج ۱ ماروی من ذم الرای ۲؎ الطور رکوع ۲ ۳؎ بنی اسرائیل رکوع ۸

۴؎ بخاری ج ۱ کتاب بدء الخلق باب صفت ابلیس وجنودہ ۵؎ مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب مباعدتہ صلعم للآثام الخ

یہ علم و ادراک اللہ کی معرفت اور اصلاح و تزکیہ کے پروگرام سے متعلق تھا۔

رسول اور نبی کو یہ علم و ادراک اللہ کی معرفت اور اصلاح و تزکیہ کے پروگرام سے متعلق تھا۔ قرآنِ حکیم میں ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰىنِ [1] — آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو حالانکہ اُس نے مجھے ہدایت دی۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ [2] — بلکہ انھوں نے اس کو جھٹلایا جس کے سمجھنے پر انھوں نے قابو نہ پایا حالانکہ ابھی اس کی حقیقت نہیں آئی۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ [3] — آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں نہ اُس کو پڑھتا اور نہ اُس کو بتاتا کیونکہ میں تو کافی عرصہ تک اس سے پہلے تم میں رہ چکا ہوں۔

یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ [4] — اللہ اس کے ذریعہ سلامتی کے راستہ کی اس شخص کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی رضا کی پیروی کرے اور ان کو اپنے حکم کے مطابق تاریکی سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ [5] — یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی اتباع کرو اور راستوں پر مت چلو وہ تمھیں اللہ کے راستہ سے بدر کر دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

[1] الانعام رکوع ۹۔

[2] یونس رکوع ۴۔

[3] یونس رکوع ۲۔

[4] المائدہ رکوع ۳۔

[5] الانعام رکوع ۱۹۔

متعلقہ حدیثیں | لا یؤمن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به

تم میں کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اپنی خواہش کو اس کے تابع نہ بنائے جس کو لے کر میں آیا ہوں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے۔

جاء ثلثة رهط الى ازواج النبی صلی الله علیه وسلم یسألون عن عبادة النبی صلی الله علیه وسلم فلما اخبروا کانهم تقالوها فقالوا این نحن من النبی صلعم وقد غفر الله ما تقدم من ذنبه وما تاخر فقال احدهم اما انا فاصلی اللیل ابدا وقال الآخر انا اصوم النهار ابدا ولا افطر وقال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبی صلعم الیهم فقال انتم الذی قلتم کذا وکذا اما والله انی لاخشاکم لله واتقاکم له لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی[2]

تین شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے پاس آپ کی عبادت کا حال دریافت کرنے کے لئے آئے جب ان سے تفصیل بیان کی گئی تو اپنے حق میں گویا اس کو کم سمجھا۔ انھوں نے کہا کہ کہاں ہم اور کہاں آپؐ۔ آپ کی تو اگلی پچھلی سب مغفرت ہو چکی ہے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ رات کو نماز ہی پڑھتا رہوں گا دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا کبھی افطار نہ کروں گا تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہوں گا۔ اسی اثنا میں رسول اللہ تشریف لے آئے اور فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں! غور سے سن لو۔ تم سب میں زیادہ میں اللہ سے ڈرنے والا اور متقی ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں میں رات کو نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہ ہوگا۔

---

[1] شرح السنۃ و مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ الفصل الثانی۔

[2] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ الفصل الاول۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا،

مابال رجال یبلغھم عنی امر ترخصت فیہ فکرھوہ ویتنزھون عنہ فواللہ لانا اعلمھم باللہ واشدھم لہ خشیۃ[1]	لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان کو میری طرف سے رخصت کا حکم پہنچتا ہے تو اس کو ناپسند کرتے اور اس سے پرہیز کرتے ہیں خدا کی قسم میں ان میں سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا اور اس سے ڈرنے والا ہوں۔

دوسری روایت میں ہے

ان اتقاکم واعلمکم باللہ انا[2]	بے شک تم میں سب سے زیادہ متقی اور اللہ کو سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں۔

ایک اور موقع پر فرمایا

لا تشددوا علی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوما شددوا علی انفسھم فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم[3]	اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ اللہ تمھارے اوپر سختی کرے گا جس قوم نے اپنے اوپر سختی کی اللہ نے بھی ان پر سختی کی نصاریٰ اور یہودیوں کے راہب اپنی اپنی عبادت گاہوں میں انھیں کے بقایا ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے کہ رہبانیت کو انھوں نے خود ایجاد کیا ہم نے ان کے لئے نہیں مقرر کیا۔

دو مثالوں کے ذریعہ وضاحت | اس علم وادراک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا۔

مثل ما بعثنی اللہ بہ من الھدیٰ والعلم کمثل الغیث الکثیر اصاب ارضا وکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء فانبتت الکلاء والعشب الکثیر وکانت	وہ علم و ہدایت جس کو اللہ نے میرے ساتھ بھیجا اس زوردار بارش کی ہے جو زمین میں ہوئی زمین کا ایک حصہ روئیدگی کے قابل تھا اس نے پانی کو قبول کیا اور ہر طرح سرسبز و شاداب ہوگئی دوسرا سخت حصہ

---

[1] مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب علمہ صلعم [2] بخاری ج ۱ کتاب الایمان باب قول النبی انا اعلمکم باللہ الخ

[3] ابوداؤد و مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

منها اجادب امسكت الماء فنفع الله بها الناس فشربوا وسقوا وزرعوا واصاب منها طائفة اخرى انما هی قيعان لا تمسك ماء ولا تنبت كلأ فذلك مثل من فقه في دين الله ونفعه بما بعثني الله به فعلم وعلّم ومثل من لم يرفع بذلك رأسا ولم يقبل هدى الله الذي ارسلت به[1]

روئیدگی کے قابل نہ تھا اُس نے پانی کو روک لیا اور اُس کے ذریعہ اللہ نے لوگوں کو نفع پہنچایا لوگوں نے پیا سیرابی حاصل کی اور کھیتی کی۔ ایک اور حصہ چٹیل میدان تھا جو نہ پانی کو روک سکتا اور نہ سبزہ اُگانے کی صلاحیت رکھتا ہے یہ ان لوگوں کی مثالیں ہیں جنھوں نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور جس کو اللہ نے میرے ساتھ بھیجا ہے اس سے نفع اُٹھایا سیکھا اور سکھایا۔ نیز ان لوگوں کی مثالیں ہیں جنھوں نے اس کی طرف سر نہیں اُٹھایا (توجہ نہ دی) اور اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کو لے کر میں بھیجا گیا ہوں۔

رسول اللہ نے اپنی ایک مثال دی جو ہر رسول و نبی کے لئے یکساں ہے۔

مثلي كمثل رجل استوقد نارا فلما اضاءت ما حولها جعل الفراش وهذه الدواب التي تقع في النار يقعن فيها وجعل يحجزهن ويغلبنه فيتقحمن فيها فانا آخذ بحجزكم عن النار وانتم تقحمون فيها[2]

میری مثال ویسی ہی ہے جیسے کسی نے آگ جلائی جب اس نے اپنے ارد گرد روشن کر دیا تو پتنگے اور آگ میں گرنے والے کیڑے مکوڑے اس میں گرنے لگے آگ جلانے والا ان کو روک رہا ہے اور وہ اس پر غالب آکر آگ میں گرتے جا رہے ہیں اس طرح میں تمھیں پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں اور تم دوزخ کی آگ میں گھستے جا رہے ہو۔

یہ دونوں مثالیں لوگوں کی نفسیاتی حالت کو سمجھنے اللہ کی معرفت اور اصلاح و تزکیہ کے پروگرام کی نوعیت سے واقف ہونے اور رسول و نبی کی حیثیت متعین کرنے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

---

[1] مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب بیان مثل ما بعث النبی صلعم [2] بخاری و مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

(باقی آئندہ)

"طبقات الحنفیہ اور اس کے مؤلفین"

ڈاکٹر سعد الرشید، شعبہ عربی، پٹنہ کالج، پٹنہ ۵

(۲)

میرے اس خیال کی تائید خدا بخش لائبریری کے کیٹلاگ کی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: یہ کتاب ملا طاشکبری زادہ کی تصنیف نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کی مؤلفات کی فہرست میں اس کتاب کا ذکر کہیں نہیں ملتا[1]۔ اس تحریر کے بعد یہ بھی جادۂ صواب سے الگ ہو گئے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: یہ کتاب عبد اللہ السویدی متوفی ۹۰۵ھ مجم کی تصنیف کردہ ہے۔ اور کتاب کا صحیح نام "طبقات السادۃ الحنفیہ" ہے، اس لئے کہ اس کتاب کی دوسری کاپی برلن لائبریری میں ۱۰۰۲۶ نمبر کے تحت محفوظ ہے اور اس کے مؤلف عبد اللہ السویدی ہیں اور کتاب کا نام "طبقات السادۃ الحنفیہ" ہے[2]۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ برلن کا نسخہ اور خدا بخش لائبریری کا نسخہ ایک ہی کتاب کی دو کاپیاں ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کے خطبہ کی عبارت ایک ہے اور برلن کا نسخہ ۲۲ طبقات پر مشتمل ہے اور ہر طبقہ کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے "ثم انتقل العلم الی طبقۃ" فلاں اور پہلا تذکرہ امام اعظم کے متعلق ہے اور آخری تذکرہ احمد بن کمال پاشا سے متعلق ہے۔

لیکن جہاں تک کتاب کے نام اور اس کے مؤلف کا مسئلہ ہے تو بلاشبہ یہ نسخہ بھی ابن الحنائی ہی کی کتاب کی ایک کاپی ہے نہ کہ عبد اللہ السویدی کی کوئی نئی تصنیف ہے۔ یہ سویدی کون ہیں؟

---

[1] انگلش کیٹلاگ خدا بخش لائبریری ۱۲/۹۸　[2] فہرست لائبریری برلن ۹/۳۹۴

ان کے بارے میں کسی طرح کی معلومات کوشش کے باوجود فراہم نہ ہوسکیں۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی وضاحت کردی جائے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ خدا بخش لائبریری کے کیٹلاگر نے خطبۂ کتاب کی بعض عبارتوں کو اس انداز سے نقل کیا ہے جس سے شک پیدا ہوتا ہے کہ پوری کتاب سات طبقات میں منقسم ہے، حالانکہ مؤلف کا مقصد اس کے کلام " فاعلم أن الفقهاء علی سبعة طباق، الطبقة الاولی طبقة المجتهدین فی الشرع الخ [تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فقہاء احناف کے سات طبقات یا درجات ہیں، پہلا طبقہ شریعت میں اجتہاد و استنباط کرنے والوں کا ہے الخ] سے صرف یہ بیان کرنا ہے کہ درجات و مراتب کے اعتبار سے فقہاء احناف کے سات طبقے ہیں جیسا کہ صاحب " الفوائد البهية "[1] اور صاحب " الجواهر المضية "[2] اور ان کے علاوہ دوسرے مؤلفین نے اپنی اپنی کتابوں میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے فقہاء احناف کو سات طبقات میں اور بعض نے چھ طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اور ابن الحنائی کی یہ کتاب اکیس طبقات میں تقسیم کی گئی ہے۔ مگر مؤلف نے اس تقسیم کی تصریح کہیں نہیں کی ہے۔ بلکہ پوری کتاب میں امام اعظم کے تذکرہ کے بعد ہر طبقہ کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے: " ثم انتقل الفقه الی طبقة " فلان۔ اور برلن کے نسخہ میں " الفقه " کی جگہ پر " العلم " کا لفظ ہے مؤلف کی اس عبارت کو ایک ایک ورق کرکے جب میں نے شمار کیا تو یہ عبارت بیس جگھوں پر مجھ کو ملی۔ اس طرح پوری کتاب امام اعظم کے طبقہ کے ساتھ اکیس طبقات پر مشتمل ہے جیسا کہ حاجی خلیفہ نے اپنی کتاب کشف الظنون میں ذکر کیا ہے۔ چونکہ مؤلف نے اس تقسیم کے متعلق خطبۂ کتاب میں صراحۃً کچھ نہیں لکھا ہے، اس لئے برلن لائبریری کے کیٹلاگر نے اس تقسیم کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، اور خدا بخش لائبریری کے کیٹلاگر یا تو غلط فہمی کا شکار ہوگئے یا پھر ان کو بھی اس تقسیم کے بارے میں علم نہ ہوسکا۔

---

[1] الفوائد البهية ص ۱۰۲ [2] الجواهر المضية ۲/ ۵۵۸

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ برلن لائبریری کے کیٹلاگر نے لکھا ہے کہ ان کا نسخہ بائیس طبقات پر مشتمل ہے تو اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ یا تو مخصوص عبارت کو شمار کرنے میں کیٹلاگر سے غلطی ہوئی ہے یا پھر کاتب نے کسی ایک جگہ پر اس عبارت کا اضافہ کر دیا ہے اور یہ بعید از قیاس نہیں ہے۔

ابن الحنائی کی کتاب کا ایک اور نسخہ کتب خانہ خدیویہ، مصر میں محفوظ ہے۔ اور اس کا نام "مختصر فی طبقات الحنفیۃ" ہے اس کے مجموعی اوراق ۲۰ ہیں اور مؤلف کا نام مذکور نہیں ہے فہرست کے مرتب نے کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرانے کی کوشش کی ہے:-

"ذکر فیہ مؤلفہ المشاھیر من الأئمۃ الذین نقلوا علم الشریعۃ فی کل طبقۃ ونشروھا بین الأئمۃ مع سلسلتھم علی طبقاتھم وأحوالھم علی درجاتھم، الأقدم فالأقدم"[۱]

یہ پوری عبارت خطبۂ کتاب سے نقل کی گئی ہے جیسا کہ پہلے اس عبارت کو کئی بار ہم نقل کر چکے ہیں اس لئے بلاشبہ یہ نسخہ بھی ابن الحنائی ہی کی کتاب کی ایک کاپی ہے

تین مزید نسخے دار الکتب المصریۃ میں محفوظ ہیں جن کا تذکرہ شمارہ ۲۶ میں ہم کریں گے

بودلین لائبریری، آکسفورڈ کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک یا دو کاپیاں وہاں بھی محفوظ ہیں[۲]۔

(۱۷) محمد بن احمد بن محمد بن قاضی خان نہروانی، ہندی، مکی، حنفی، قطب الدین بن علاء الدین، متوفی ۹۸۸ھ[۳]

---

[۱] فہرست کتب خانہ خدیویہ، مصر، ۱۴۴/۵۔

[۲] فہرست بودلین لائبریری ۶۰/۱، ۵۶۹/۲

[۳] حالات کے لئے دیکھئے: الاعلام ۲۳۴/۶۔ البدر الطالع ۵۷/۲، الھدیۃ ۲۵۵/۲ — ہدیۃ العارفین میں ان کا نام "محمد بن علاء الدین علی بن احمد" ہے۔

ان کی کتاب چار جلدوں میں ہے اور "طبقات الحنفیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب مؤلف کی دوسری کتابوں کے ساتھ نذر آتش ہوگئی۔ بعد انھوں نے کوشش کی کہ نئے سرے سے اس کی تالیف کی جائے۔

(الکشف ۲/۱۰۹۸، الہدیۃ ۲/۲۵۵، ایضاح المکنون ۲/۷۸)

(۱۸) محمود بن سلیمان کفوی، رومی، حنفی، متوفی سنہ ۹۹۰ھ[1]

ان کی کتاب "کتائب اعلام الأخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار" ہے

اس کتاب کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:-

"الحمد للہ الذی أرسل رسولہ بالہدیٰ ودین الحق" الخ بعد کفوی نے اس کتاب کی تالیف کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ایک رات شہر کے اصحاب علم حضرات سے فقہاء اور شیوخ اسلام کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، اور میں نے ان میں سے اکثر کو پایا کہ استاذ و شاگرد کے درمیان اور مقلد و مجتہد کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ان لوگوں کی اس ناگفتہ بہ حالت نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ اخیار، فقہاء، اور قضاۃ کے احوال کو قلمبند کرکے ان کے سامنے پیش کروں، اس لئے میں نے اپنے متقدمین اور متأخرین مشائخ کے حالات کو ان کے اسانید اور مصنفات کے ساتھ ان کے ادوار اور طبقات کی رعایت کرتے ہوئے کتابی شکل میں جمع کیا۔ اور فتاوی کی مشہور و معروف کتابوں کی مدد سے ان کے نادر اقوال بھی بیان کرنے کا اہتمام کیا، مزید براں ان سے متعلق دلچسپ واقعات بھی پیش کرنے کی کوشش کی۔[2]

اس کتاب کے بہت سے نسخے پائے جاتے ہیں۔ بظاہر بہت مفید اور کارآمد کتاب معلوم ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ایڈٹ کرکے اس کو شائع کیا جائے۔ اس کے مختلف مخطوطات کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

---

[1] الاعلام ۸/۴۹ الہدیۃ ۲/۴۱۳

[2] دیکھئے کشف الظنون ۲/۱۴۷۲ - ۱۴۷۳

(۱) پیرس لائبریری رقم ۲۰۹۷	(پیرس لائبریری کیٹلاگ ۱/۳۷۲)
(۲) نورعثمانیہ لائبریری نمبر ۳۰۴۸	(نورعثمانیہ لائبریری کیٹلاگ ص: ۱۷۵)
(۳) ویتن لائبریری نمبر ۱۱۸۷	(ویتن لائبریری کیٹلاگ ۲/۳۵۳)
(۴) برلن لائبریری نمبر ۱۰۰۲۷	(برلن لائبریری کیٹلاگ ۹/۴۴۰)
(۵) بہار لائبریری، کلکتہ نمبر ۲۵۵	(بہار لائبریری کیٹلاگ ص: ۲۸۹)
(۶) کتب خانہ خدیویہ مصر ۔ ۔ ۔ ۔	(فہرست کتب خانہ خدیویہ ۵/۱۱۷)

(۱۹) محمود بن سلیمان کوفی

ان کی کتاب "طبقات الکوفیۃ فی السادات الحنفیۃ" ہے۔

حوالے کی کسی کتاب میں اس کتاب کا نام یا اس کے مؤلف کا نام میری نظر سے نہیں گذرا۔ مدرسہ عالیہ، کلکتہ کی انگریزی فہرست مطبوعہ ۱۹۰۵ء کے صفحہ ۳۳ پر مجھ کو یہ تحریر ملی ہے کہ: "حسن چلپی متوفی ۸۶۳ھ کی تحریر کردہ حاشیۂ مطول کے ورق نمبر ۱۰۵ (الف) پر مؤلف کے حالات کو محمود بن سلیمان کوفی کی کتاب "طبقات الکوفیۃ فی السادات الحنفیۃ" سے نقل کیا گیا ہے۔

اس مؤلف کو یہاں ذکر کرنے کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کوفی کی وفات یقیناً ۸۶۳ھ کے بعد ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ان کی کتاب حسن چلپی متوفی ۸۶۳ھ کے حالات پر مشتمل ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "الکوفی" اور "الکوفیۃ" اور "الکفوی" اور "الکفویۃ" کی تحریف ہے اور یہ تحریف صرف واؤ کو فا پر مقدم کر دینے کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ اگر تحریف کو صحیح مان لیا جائے تو پھر اس سے مراد "کتائب أعلام الأخیار" ہوگی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

(۲۰) تقی الدین بن عبد القادر تمیمی، داری، مصری، حنفی، قاضی جیزۃ، متوفی ۱۰۱۰ھ۔[1]

---

[1] حالات کے لئے دیکھئے الاعلام ۲/۶۸ خلاصۃ الاثر: ۴۷۹، ہدیۃ العارفین ۱/۲۳۵

ان کی کتاب "الطبقات السنیۃ فی تراجم السادۃ الحنفیۃ" ہے۔

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ تقی الدین بن عبد القادر نے اس فن میں بہت عمدہ کتاب تصنیف کی ہے اور یہ کتاب اہل رائے (یعنی احناف) کے تذکروں میں تصنیف کی جانے والی تمام کتابوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں مصنف نے "الشقائق النعمانیۃ" میں ذکر کردہ فقہاء احناف کے علاوہ اپنے عصر تک کے فقہاء کو شامل کیا ہے۔ تمام افراد کی مجموعی تعداد ۲۵۲۳ ہے۔ کتاب کا نام "الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ" ہے۔ اس کی تکمیل ۹۹۵ھ میں مقام "فوہ" میں ہوئی، جب کہ تقی الدین وہاں کے عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ اس کتاب پر مولی سعد الدین معروف بہ خواجہ آفندی، مولی چوی زادہ، مولی زکریا، مولی عبد الغنی اور مولی احمد انصاری وغیرہ نے تقریظیں تحریر کی ہیں[1]۔

پھر دوبارہ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:۔

مؤلف نے کتاب کی ابتدا میں ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جو چند ابواب اور کئی فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں فن تاریخ سے متعلق بہت ہی مفید باتیں بتائی گئی ہیں جن سے کسی مورخ کا ناواقف رہنا بالکل درست نہیں ہے۔ سلطان مراد خان بن سلیم العثمانی کے نام سے اس کتاب کی تصدیر کی گئی ہے، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک پر اجمالی طور سے بہت مفید روشنی ڈالنے کے بعد امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مناقب و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد پوری کتاب حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہے۔ اور بعض تذکروں میں بکثرت اشعار کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ کتاب ادب کی چاشنی سے بالکل خالی نہ رہے۔ پھر کتاب کے آخر میں انساب والقاب کے اعتبار سے مشہور و معروف فقہاء کے حالات بیان کیے گئے ہیں[2]۔

اس کتاب کے مختلف نسخے حسب ذیل مقامات پر پائے جاتے ہیں۔

---

[1]، [2] کشف الظنون ۲/۱۰۹۸ - ۱۰۹۹۔

(۱) برلن لائبریری نمبر ۱۰۲۹ (برلن کٹیلاگ ۹/۴۴۱)
(۲) ویتن لائبریری نمبر ۱۱۹۸ (ویتن کٹیلاگ ۲/۳۵۶)
(۳) نور عثمانیہ لائبریری ۳۳۹۰-۳۳۹۱ دو نسخے (نور عثمانیہ کٹیلاگ ص: ۱۹۲)
نور عثمانیہ کی فہرست میں مؤلف کا نام شمس الدین بن عبدالقادر ذکر کیا گیا ہے ممکن ہے کہ شمس الدین مؤلف کا لقب ہو یا عرفی نام ہو۔

(۲۱) علی بن سلطان محمد القاری، ہروی متوفی ۱۰۱۴ھ۔[1]
ان کی کتاب "الأثمار الجنية فی أسماء الحنفية" ہے۔
اس کتاب کا ایک مخطوطہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں ۲۴۵۱ نمبر کے تحت محفوظ[2] ہے کتاب کا یہ نام متن کتاب میں کہیں نہیں ملتا۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر "حدائق الحنفیہ" درج ہے۔ لیکن یہ تحریر کاتب کتاب کے علاوہ کسی دوسرے آدمی کی ہے۔ بہرحال "الاثمار الجنیۃ" کا نام ملا علی قاری کی تالیفات کی فہرست میں اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ نسخہ ۱۷۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ ۱۰۹۰ھ میں اس کی کتابت کی گئی ہے۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے: -

الحمد للہ رب الأرض والسماء ذی الفضل والطول الخ

دوسرا نسخہ بہار لائبریری، کلکتہ میں ۲۵۶ نمبر کے تحت محفوظ ہے۔ سید صدر الدین بخاری کے حکم سے ۱۲۹۴ھ میں اس کی کتابت کی گئی ہے۔ کاتب کا نام عبدالرحیم ہے۔[3]

(۲۲) عیسیٰ بن محمد بن محمد مغربی، مالکی، جار اللہ، ابوالمہدی، متوفی ۱۰۸۰ھ۔[4]
ان کی کتاب "اسماء رواۃ الامام ابی حنیفۃ" ہے۔

---

[1] ہدیۃ العارفین ۱/۷۵۱، معجم المطبوعات: ۱۷۹۱، الأعلام ۵/۱۶۶، البدر الطالع ۱/۴۴۵
[2] انگلش کٹیلاگ خدا بخش لائبریری ۵/۱۰۰۔
[3] بہار لائبریری کٹیلاگ ۲/۲۹۔
[4] حالات کے لئے دیکھئے: الأعلام ۵/۲۹۴۔ خلاصۃ الاثر ۳/۲۴۰۔

کشف الظنون، ایضاح المکنون، الاعلام اور دوسری کتابوں میں اس کتاب کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ صرف برلن لائبریری کی فہرست کے مرتب نے ۱۰۰۳۱ نمبر کے ذیل میں طبقات الحنفیہ سے متعلق مختلف کتابوں کے ساتھ اس کتاب کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

(فہرست برلن ۹/۳۴۴م)

(۲۳) خلیل بن تاقیۃ جی صولاق محمد رومی، حنفی معروف بہ صولاق زادہ، متوفی ۱۰۰۲ھ[1]
ان کی کتاب "طبقات الحنفیۃ" ہے (ایضاح المکنون ۲/۷۸، الہدیۃ ۱/۳۵۴)

(۲۴) محمد کامی بن ابراہیم بن احمد بن سنان بن محمود ادرنوی، حنفی (۱۰۵۹-۱۱۳۶ھ)[2]
ان کی کتاب "مہام الفقہاء" فی طبقات الحنفیۃ ہے۔ اس کتاب میں صرف متاخر اور مشاہیر فقہاء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے اس کی ترتیب دی گئی ہے۔ پھر ہر حرف کے آخر میں ایک فصل قائم کی گئی ہے۔ جس میں فقہی کتابوں کے اسماء بیان کئے گئے ہیں۔ (ایضاح المکنون ۲/۶۰۸)
اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں محفوظ ہے۔ کتابت ۱۲۹۱ھ میں کی گئی ہے۔ اوراق ۱۱۶ ہیں۔ (فہرست الخدیویۃ ۵/۱۶۲)

(۲۵) عبدالحی بن محمد عبدالحلیم انصاری، لکھنوی، ہندی، ابوالحسنات (۱۲۶۴-۱۳۰۴ھ)[3]
ان کی تالیف "الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ" ہے۔
یہ کتاب کفوی کی "کتائب أعلام الأخیار" کی تلخیص ہے۔ مؤلف نے خطبۂ کتاب میں اس کی تصریح کی ہے پھر اس فن پر لکھی گئی دوسری کتابوں سے مفید اضافے کئے گئے ہیں۔ اور اپنے اضافات کو کفوی کی تلخیص سے ممتاز کرنے کے لئے مؤلف نے "قال الجامع" کی

---

[1] ہدیۃ العارفین ۱/۳۵۴، ایضاح المکنون ۲/۷۸۔
[2] الأعلام ۷/۲۳۶۔ ایضاح المکنون ۲/۶۰۸۔
[3] الأعلام ۷/۹۵۔ الفوائد البہیۃ: ۲۴۸۔ معجم المطبوعات: ۱۵۹۵

عبارت کو انتخاب کیا ہے۔

یہ کتاب احناف کے سیر و تراجم کے لئے بہت مفید ہے۔ خاص کر مؤلف کے اضافے سے کتاب کی اہمیت اور قدر و منزلت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ۱۲۹۳ھ میں یہ کتاب چھپ کر منظر عام پر آچکی تھی۔ حاشیہ پر خود مؤلف کی تحریر کردہ "التعلیقات السنیۃ علی الفوائد البہیۃ" ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ تعلیقات متن کتاب میں واقع اعلام و اشخاص پر نوٹس کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں حنفی اور غیر حنفی اعلام و اشخاص پر اتنا کافی مواد جمع کر دیا گیا ہے کہ اس کو الگ سے کتابی شکل دی جا سکتی ہے۔

(۲۶) علامہ رفیع الدین شروانی

ان کی کتاب "طبقات الحنفیۃ" کے نام سے موسوم ہے۔ علامہ شروانی کے حالات کوشش کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے۔ دار الکتب المصریۃ کی فہرست کے مرتب نے اپنی فہرست (۵/۲۴۸) میں تحریر کیا ہے کہ:۔

"طبقات الحنفیۃ" علامہ رفیع الدین شروانی کی تصنیف ہے۔ جیسا کہ "طبقات الفقہاء والعباد والزہاد" کے ابتدائی حصہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ مؤلف نے اس کتاب میں امام ابو حنیفہ کے ان تمام اصحاب کے حالات جمع کئے ہیں جو اُن کے معاصر تھے یا اُن کے بعد آئے اور ان تمام فقہاء کو اکیس طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ طبقۂ اولی میں سب سے پہلا تذکرہ امام اعظم کا ہے اور طبقۂ اخیرہ میں سب سے آخری تذکرہ احمد بن سلیمان بن کمال پاشا متوفی ۹۴۰ھ کا ہے۔

مصر کے مذکورہ بالا کتب خانہ میں اس کتاب کے دو مکمل نسخے محفوظ ہیں اور تیسرے نسخہ کا کچھ حصہ محفوظ ہے[1]۔ "طبقات الفقہاء والعباد والزہاد"[2] کے مؤلف کی تحریر سے صرف یہ ظاہر

[1] فہرست دار الکتب المصریۃ ۵/۲۴۸۔ [2] طبقات الفقہاء والعباد والزہاد و مشائخ الطریقۃ والصوفیۃ والمورخین والقراء والنحاۃ واللغویین" محمد امین بن حبیب بن ابی بکر بن خیضر کی کتاب ہے۔ یہ کتاب چند جلدوں پر مشتمل ہے۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ میں جلد اول کی تالیف سے مؤلف کو فراغت حاصل ہوئی (فہرست دار الکتب المصریۃ ۵/بعد صفحات ۲۴۸)۔

ہوتا ہے کہ علامہ شروانی نے بھی اس فن میں کوئی کتاب تصنیف کی ہے۔ اور صرف اس بنیاد پر
کہ ان کی بھی کوئی کتاب ہے احناف کے سیر و تراجم پر زیر بحث کتاب کو علامہ شروانی کی طرف
منسوب کر دینا بالکل غلط ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ کتاب بھی ابن الحنائی ہی کی کتاب کی مختلف
کاپیاں ہیں جن کا تذکرہ شمار نمبر ۱۶ کے تحت کیا جا چکا ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام خصوصیتیں اس
کتاب میں موجود ہیں جو ابن الحنائی کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ مزید براں خود فہرست کے
مرتب نے ہمارے خیال سے موافقت کی ہے وہ لکھتے ہیں: "وفی کشف الظنون ما یفید
انہ مختصر للمولی علی بن أمر اللہ الحنائی، رتبہ علی احدی وعشرین طبقۃ"
یعنی صاحب کشف الظنون کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک مختصر کتاب مولی علی بن
امر اللہ حنائی کی تصنیف ہے۔ جس کو انھوں نے اکیس طبقات میں مرتب کیا ہے۔

(۲۷) کتائب المجتہدین؟

اس کتاب کا ایک مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے[1]، مگر کہیں پر نہ تو کتاب کا نام
مذکور ہے اور نہ مؤلف کا۔ لائبریری کے کیٹلاگر نے اپنے کیٹلاگ میں اس کتاب کا نام "کتائب المجتہدین"
اس مناسبت سے رکھا ہے کہ اس میں حسب ذیل پانچ کتائب ہیں۔

(۱) کتیبۃ طبقۃ المجتہدین فی الشرع۔

(۲) کتیبۃ طبقۃ المجتہدین فی المذہب۔

(۳) کتیبۃ طبقۃ المجتہدین فی المسائل۔

(۴) کتیبۃ طبقۃ اصحاب التخریج۔

(۵) کتیبۃ طبقۃ المتبحرین فی الفتوی۔

اس نسخہ کے کل اوراق ۱۹۳ ہیں۔ بعض صفحات سادہ ہیں، حالات سے کم اور مسائل
سے زیادہ بحث کی گئی ہے۔ کفوی کی "کتائب أعلام الأخیار" کے حوالے بکثرت ملتے ہیں اور بعض

---

[1] انگلش کیٹلاگ خدا بخش لائبریری ۱۰۱/۵

مقامات پر حصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ کی کتاب دُرِ مختار کے بھی حوالے پائے جاتے ہیں۔

(۲۸) "مختصر الجواہر المضیۃ فی طبقات العلماء الحنفیۃ"

اس کتاب کے ملخص کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اس کا ایک نسخہ وِیَن لائبریری میں ۱۷۱ نمبر کے تحت محفوظ ہے[۱]۔

"الجواہر المضیۃ" سے ماخوذ ایک اور کتاب برلن لائبریری میں ۱۰۰۲۱ نمبر کے تحت محفوظ ہے۔ مؤلف نے خطبہ میں بیان کیا ہے کہ اس کتاب میں ان لوگوں کا تذکرہ میں کروں گا جن کے حالات "الجواہر المضیۃ" میں بیان کئے گئے ہیں اور وہ کسی نسبت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں نسخے ایک ہی کتاب کی دو کاپیاں ہوں۔

(۲۹) "نادرۃ الأیام فی شمائل أئمۃ الاسلام ومشائخ الکرام العظام"

اس کتاب کے مؤلف کا بھی نام معلوم نہ ہو سکا۔ مؤلف نے خطبۃ الکتاب میں حمد و صلوٰۃ کے بعد لکھا ہے کہ یہ کتاب کفوی کی "کتائب أعلام الأخیار" کی تلخیص ہے۔

اس کتاب کا پہلا حصہ برلن لائبریری میں ۱۰۰۲۸ نمبر کے تحت محفوظ ہے[۲]۔

(۳۰) نزھۃ الأبرار فی مناقب الأخیار"

یہ کتاب احناف کے سیر و تراجم کے متعلق لکھی گئی ہے۔ برلن لائبریری کی فہرست کے مرتب نے "طبقات الحنفیۃ" کے ذیل میں ۱۰۰۳۱ نمبر کے تحت اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے[۳]۔ اور صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے مناقب میں تالیف کی گئی ہے۔ کتاب بہت مختصر ہے۔ ابتدا ان کلمات سے ہوتی ہے:-

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی الخ[۴]

---

[۱] وِیَن کیٹیلاگ ۳۳۷/۲
[۲] برلن کیٹیلاگ ۴۴۳/۹۔
[۳] کشف الظنون ۱۹۳۸/۲۔
[۵] برلن کیٹیلاگ ۴۴۱/۹

عقیدۂ عصمت انبیاؤ ائمہ

تاریخ کی روشنی میں

جناب سید محمود حسن قیصر امروہوی

عقیدۂ عصمت انبیاء، اسلام کے تمام فرقوں میں ایک بنیادی عقیدہ شمار کیا جاتا ہے۔ امامیہ کے نزدیک چونکہ امامت بھی نبوت کی طرح ایک الٰہی منصب ہے، اس لئے وہ عصمت کے دائرے کو وسعت دے کر ائمۂ اثنا عشر تک لاتے ہیں، نیز کچھ مخصوص نصوص کی بناء پر حضرت فاطمہ بنت رسولؐ کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس عقیدے کی ضرورت اور عدم ضرورت پر حکم لگانا تو میرے منصب سے خارج ہے البتہ یہ ایک محکم عقل ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ عامۃ الناس کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں، اس لئے عام انسانی سطح سے ان کو بہت بلند ہونا چاہیئے، پیر ان کے لئے کسی بھی قسم کی اخلاقی خرابی کو تجویز کرنا یقیناً ایک جرأت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور مسلمین میں یہ عقیدہ بغیر کسی اختلاف کے نہایت آسانی سے قبول کر لیا گیا اور فخر الدین رازی سے لے کر اب تک، سوائے امام غزالی کے، کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ رہا یہ امر کہ مسلمان ہونے کے لئے یہ عقیدہ رکھنا کس حد تک ضروری ہے، اس کے لئے صرف حکم عقل کو بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک اس سلسلے میں کچھ واضح نصوص موجود نہ ہوں۔ اس بناء پر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ عقیدہ کس طرح نمو پذیر ہوا، جب کہ قرآن اور اس کے بعد حدیث، جو اسلام کے بنیادی مصادر ہیں، ان دونوں میں

عصمت انبیاء کے بارے میں کوئی واضح نص نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برخلاف، ان کے تذکرے میں جس قدر آیات ہیں، وہ سب کلیتہً اس عقیدے کی نفی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتب تفاسیر میں ان آیات کے ذیل میں طول طویل بحثیں ہیں جن میں اس قسم کی تمام آیات کی تاویلیں کی گئی ہیں۔

اس سلسلے میں بعض مستشرقین اس طرف گئے ہیں کہ اسلام میں یہ عقیدہ یہودیوں کی مذہبی کتابوں کے راستے سے داخل ہوا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا بے بنیاد خیال ہے، جس پر وہ خود بھی کوئی دلیل نہیں لا سکے اس لئے کہ عہد نامہ قدیم (Old Testament) کی طرف جب ہم رجوع کرتے ہیں تو اس میں کسی مقام پر کوئی ایسی آیت نہیں ملتی، جس کو انبیاء بنی اسرائیل کی عصمت کے ثبوت میں دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکے، بلکہ اس کے برخلاف، اس کی مختلف کتابوں میں اتنی آزادی کے ساتھ انبیاء و رسل کی خطاؤں اور لغزشوں کو بیان کیا گیا ہے، جن کو دیکھ کر ان کی عصمت کا کوئی تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، داؤد، سلیمان، ایوب، اشعیاء، عزرا وغیرہ کی خطاؤں کا متعدد مقامات پر اس انداز سے تذکرہ ملتا ہے گویا انبیاء کے لئے ارتکاب خطاء و عصیاں ایک امر عادی ہے۔ اس کے بعد عہد نامہ جدید (New Testament) کی جب ہم ورق گردانی کرتے ہیں تو اس کے بیانات اس سلسلے میں سراسر مایوس کن ہیں۔ اس لئے کہ اناجیل (Gospels) اور رسائل (Epistles) کے مصنفین نے صفت عصمت کو صرف یسوع (Jesus) کے لئے جائز رکھا ہے۔ یہ بھی اس حیثیت سے نہیں کہ وہ نبی تھے بلکہ "مسیح" کی حیثیت سے اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے علاوہ تلامذۂ مسیح یا دیگر انبیاء و رسل کے بارے میں اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ وہ معصوم تھے، یا ان سے خطا اور غلطی کا ارتکاب نہیں ہوتا تھا۔ کچھ محققین اس طرف گئے ہیں کہ اسلام میں عصمت انبیاء کا تصور بعض مشکوک الصحت کتابوں (Apocrypha) کے راستے سے داخل ہوا ہے[۶۲]۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے دعائے منسیٰ (Prayer of Manasses)

---

[۶۲] Tisdal: Religion of the Crescent: d ۲۱

کا ذکر کیا ہے۔ اس میں چند مقامات پر انبیاء علیہم السلام کا جو ذکر ہے اس سے بلاشبہ ان کی عصمت کی طرف خیال راجع ہو سکتا ہے مثلاً دعائے منسّی کا مصنف ایک مقام پر کہتا ہے:

"پس اس صورت میں اے پالنے والے! اے الٰہی! تو نے ابراہیم و اسحاق و یعقوب کے لئے توبہ کو فرض نہیں کیا، جنھوں نے تیری کوئی خطا نہیں کی، لیکن تو نے اس کو میرے اوپر فرض کیا ہے، میں گناہگار ہوں[1]"

اسی طرح عہد ابراہیم میں ایک مقام پر ابراہیم کے ذکر میں آتا ہے "وانه بدون خطیئة" (وہ خطاؤں سے مبرا تھے)

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا دونوں روایات کسی حد تک اسلام میں عقیدہ عصمتِ انبیاء کا ماخذ قرار دی جا سکتی ہیں، لیکن اس وقت تک ان کو اصل نہیں بنایا جا سکتا، جب تک قرآن اور اس کے بعد اقوالِ رسولؐ سے ان کی تائید نہ ہو۔ چنانچہ اس خیال کو لے کر جب قرآنِ مجید کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ پورے قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے، جس سے انبیاء کی عصمت پر روشنی پڑتی ہو بلکہ اس کے برخلاف متعدد مقامات پر اس میں انبیائے اولوالعزم: حضرت آدم، نوح، موسیٰ، داؤد وغیرہم کے حق میں ارتکاب معاصی کی طرف، نہ صرف اشارے بلکہ صراحت تک ملتی ہے۔ چنانچہ جنت سے حضرت آدم کے اخراج کا سبب ہی قرآن مجید نے ان کے عصیان کو قرار دیا ہے جیسا کہ ذیل کی آیت سے واضح ہوتا ہے:

وَقُلْنَا يَآ اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا	ہم نے آدم سے کہا: اے آدم! تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور جس طرح چاہو کھاؤ پیو؛ امن چین کی زندگی بسر کرو! مگر دیکھو! اس درخت کے قریب ہرگز نہ جانا ورنہ تمھارا شمار معصیت کاروں

[1] دیکھئے: Dictionary of Bible مادہ "Sin"

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ

(البقرہ ۳۵-۳۶)

میں ہو جائے گا۔ اس پر بھی شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے اور بالآخر ان کو اس سکون کی زندگی سے نکال دیا۔ اب ہم نے کہہ دیا: یہاں سے نکل جاؤ! تم میں سے بعض بعض کا دشمن ہے۔ اب تمھیں (بجائے جنت کے) زمین میں رہنا ہے اور ایک خاص وقت تک وہاں کی زندگی سے متمتع ہونا ہے۔

اس کے بعد آدم و حوا کی طرف سے اپنی معصیت کا اعتراف بھی اسی لفظ کے ساتھ ہے جس لفظ کے ساتھ اللہ نے ان کی تحذیر کی تھی، ملاحظہ کیجئے:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

(الاعراف ۲۳)

ان دونوں (آدم و حوا) نے کہا: اے ہمارے پالنے والے! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو یقیناً ہم خسارہ اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔

ایک مقام پر حضرت موسیٰؑ کے بارے میں قرآن کا یہ بیان ہے:

قَالَ: هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ، قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ، فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (القصص ۱۵-۱۶)

(موسیٰ نے) کہا: یہ ایک شیطانی عمل ہے۔ بے شک وہ دشمن ہے اور صریحاً بہکانے والا ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا، مجھے معاف کر۔ پس اللہ نے ان کو معاف کر دیا، بے شک وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

یہ آیت اس موقع کی ہے، جب حضرت موسیٰؑ نے ایک قبطی کو قتل کیا اور مدین کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

ایک دوسرے مقام پر حضرت داؤد کی معصیت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے

یہ وہ موقع ہے جب دو آدمی ان کے پاس جھگڑتے ہوئے آتے۔ ان میں سے ایک کا یہ دعوی تھا کہ دوسرے نے اس کی ایک بھیڑ لے لی ہے۔ اس پر حضرت داؤد نے فیصلہ صادر کیا جس کا بیان قرآن میں حسب ذیل انداز پر ہے۔

وَظَنَّ دَاوُدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ (سورۃ ص ع ۲)	اور داؤد کو (اس سے) خیال گزرا کہ ہم نے ان کا امتحان لیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پروردگار سے استغفار کی اور سجدے میں گر پڑے اور رجوع ہوئے

ان آیات کے معانی اس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں، جب قرآن مجید کے ان مقامات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، جہاں اس نے غیر انبیاء کی خطاؤں اور معاصی کا ذکر کیا ہے چنانچہ دونوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جو الفاظ اور تعبیرات قرآن مجید میں اعتراف گناہ کے سلسلے میں انبیاء کے لئے ملتی ہیں، بعینہ وہی الفاظ غیر انبیاء کے بھی ہیں، ملاحظہ ہو:

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ، فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا، وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (العنکبوت ۳۹-۴۰)	نیز قارون وفرعون اور ہامان، حالانکہ موسی ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تھے، لیکن انھوں نے زمین میں سرکشی کی اور راہ فرار اختیار نہ کر سکے۔ پس ہم نے ان سب کو ان کے گناہ کی پاداش کے طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان میں سے بعض پر ہم نے تند ہوا بھیجی، بعض کو ہولناک آواز نے آدبایا اور بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کچھ کو ان میں سے پانی میں غرق کر دیا۔ اللہ یقیناً ایسا نہیں ہے کہ وہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ	اور ہم نے پیغمبروں کو خاص اسی لئے مبعوث

بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ، فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ، وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ (النساء ۶۴)

فرمایا کہ بحکم خدا وندی ان کی اطاعت کی جائے۔ کاش جس وقت وہ اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور اللہ سے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے لئے اللہ سے استغفار چاہتے تو یقیناً وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

یہ چند آیات ہیں، جو صرف نمونے کے طور پر یہاں نقل کی گئی ہیں، ورنہ پورے قرآن میں جگہ جگہ انبیاء کی خطائیں اور لغزشوں کو بیان کیا گیا ہے۔ متکلمین اسلام نے اگرچہ اس قسم کی تمام آیات کی تاویلیں کی ہیں، پھر بھی عمومی حیثیت سے، ان نصوص کی روشنی میں انبیاء کو زلات اور نیم زلات سے مبرا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ آیات کے بارے میں یہ کہنا بالکل درست ہے، کہ ان میں دورِ نبوت سے قبل کی سرگذشت کو بیان کیا گیا ہے، لیکن منصب نبوت ملنے کے بعد بھی قرآن مجید کسی مقام پر اس کی صفائی نہیں دیتا کہ انبیا سے بشری کمزوریوں کو سلب کر لیا گیا تھا، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے ایک عام قاعدہ تمام انبیاء کے لئے سنا دیا گیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (الحج)

ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں بھیجا، جس کو اس سے دو چار ہونا نہ پڑا ہو کہ جب بھی اس نے کچھ پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں شبہ ڈال دیا۔

یہ نصوص تو عام انبیاء کے بارے میں ہیں جن میں واضح طور پر ان کی طرف گناہ اور عصیان کی نسبت دی گئی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی اسی قسم کی آیات ملتی ہیں،

اس سلسلے میں سب سے مشہور آیت ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی... (عبس)

(پیغمبر) چیں بجبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا، اس پر کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور جاتا یا نصیحت قبول کر لیتا اور نصیحت کرنا اس کو فائدہ پہنچاتا۔

ان آیات کی شان نزول ہم ایک مشہور شیعہ مفسر علامہ طبرسی (متوفی ۵۴۸ھ) کی تفسیر "مجمع البیان" سے نقل کرتے ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ آیات عبداللہ بن مکتوم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جن کا پورا نام یہ ہے: عبداللہ بن شریح بن مالک بن ربیعہ الفہری۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! جو کچھ اللہ نے آپ کو تعلیم دی ہے، اس میں سے آپ کچھ مجھے بھی بتا دیجئے۔ آنحضرت اس وقت عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، عباس بن عبدالمطلب اور فرزندان خلف اُبَیّ اور اُمیہ سے بات چیت میں مصروف تھے اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ عبداللہ بن مکتوم نے یہ لحاظ کئے بغیر کہ آپ اس وقت دوسروں سے ہم کلام ہیں، کئی مرتبہ یہ جملے دہرائے۔ اس پر آنحضرتؐ چیں بجبیں ہو گئے اور اپنے دل میں کہا کہ یہ لوگ کہیں گے کہ ان کے متبعین اندھے اور غلام ہیں۔ یہ سوچ کر آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بدستور ان ہی لوگوں سے مخاطب رہے اس پر اس آیت کے ذریعے اللہ نے آپ کو تنبیہ فرمائی۔ مؤلف کا بیان ہے کہ اس کے بعد سے آں حضرتؐ آپ کا بڑا اکرام کرنے لگے اور جب بھی ان کو دیکھتے تو کہا کرتے تھے، میں اس کو مرحبا کیوں نہ کہوں جس کی وجہ سے اللہ نے میری تنبیہ کی اور ہمیشہ ان کی ضروریات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔

آیت کی مذکورہ بالا شانِ نزول سے، میرے مطالعہ کی حد تک عامہ اور خاصہ میں سے کسی نے سوائے سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ ان کا بیان ہے کہ ظاہر آیت میں ایسی کوئی

دلالت نہیں ہے جس کے تحت عَبَسَ کی ضمیر کو رسول اللہؐ کی طرف پھیرا جا سکے بلکہ یہ صرف ایک خبر ہے، جس میں مخبر عنہ کی کوئی تصریح نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ "عبوس" ایسی صفت ہے جس کو دشمنوں کے لئے بھی رسول اللہؐ سے منسوب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا چہ جائیکہ مؤمنین کے لئے۔ اس کے علاوہ اغنیاء اور صنادید کی طرف کامل توجہ اور فقراء کی طرف سے بے اعتنائی آپ کے اخلاق کریمہ کے منافی ہے، اس لئے کہ آپ کے بارے میں یہ آیت ہے "اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" (اے رسولؐ تم خلق عظیم پر فائز ہو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ عَبَسَ کی ضمیر رسول اللہ کے علاوہ کسی دوسرے ہی کی طرف راجع ہو سکتی ہے۔

آیت کی یہ تاویل اتنی بعید اور دور از کار ہے، جس کو سید مرتضیٰ جیسے صاحب بصیرت عالم اور متکلم سے نسبت دینا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ پہلی آیت "عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی" میں عبوس کی نسبت اسی کی طرف دی گئی ہے جس کے پاس ایک اندھا آیا تھا، اس کے بعد دوسری ہی آیت میں خطاب شروع ہو جاتا ہے اور خطاب کا انداز بالکل وہ ہے جو صرف رسول اللہؐ ہی سے متعلق ہو سکتا ہے پھر دوسری طرف یہ امر بھی مسلم ہے کہ پورے قرآن میں انبیاء کے علاوہ اللہ نے کسی کو مخاطب نہیں کیا، اس لئے یہ بات کس طرح عقل میں آ سکتی ہے کہ یہ آیت کسی دوسرے سے متعلق ہو۔ اس کے علاوہ مخبر عنہ اگر اتنا مجہول ہے کہ تاریخ میں اس کا کہیں نام نہیں ملتا اور خود سید مرتضیٰ بھی اس کی کوئی نشاندہی نہ کر سکے، تو پھر اس کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے اور اس کے کسی منافی اخلاق فعل پر تنبیہ کیا معنی؟

صاحب مجمع البیان نے اس آیت کے ذیل میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ یہ آیت بنی اُمیّہ کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوتی ہے جو رسول اللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اسی اثناء میں عبد اللہ بن مکتوم آ گئے۔ اس شخص نے جب ان کو دیکھا تو تیور چڑھا لیا ہو گیا اور ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اسی واقعہ کی حکایت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کی ہے لیکن اسی کے ساتھ خود ان ہی امام جعفر صادقؑ سے یہ روایت بھی ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی عبداللہ بن مکتوم کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے مرحبا! مرحبا! لا واللہ! اللہ آپ کے بارے میں کبھی میرے اوپر عتاب نہ کرے گا اور یہاں تک ان کے ساتھ لطف و مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے کہ بسا اوقات وہ رسول اللہ کو اس سے روکتے تھے۔

(۲) وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدىٰ (اے رسول! اللہ نے تم کو بھٹکا ہوا پایا تو تمہاری ہدایت کی۔

(۳) لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ تا کہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے تمام گناہوں کو بخش دے۔

اول الذکر آیت میں رسول اللہؐ کے لئے "ضال" کا لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے۔ دوسری آیت میں صاف طور پر "ذنب" کا لفظ ہے، جس کا صدور عام انبیاء کے لئے بھی جائز نہیں چہ جائیکہ قرآن خاتم الانبیاء کی طرف اس کو منسوب کر رہا ہے۔

ان آیات کے پیش کرنے سے میرا کسی طرح یہ مقصد نہیں ہے کہ معاذاللہ حضرت ختمی مرتبت سے گناہ سرزد ہوتے تھے یا ان آیات کی روشنی میں آپ کو گنہگار اور عاصی تصور کیا جائے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کی موجودگی میں قرآن کو عصمتِ انبیاء کا ماخذ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ میرے پیشِ نظر وہ آیات بھی ہیں جن میں انبیاء و رسل کے اصطفاء و اجتبا کا ذکر ہے اور عامۃ الناس کے لئے ان کو مطاع مطلق قرار دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے متکلمینِ اسلام نے ان آیات کے جو محمل قرار دیئے ہیں، وہ بڑی حد تک صحیح ہو سکتے ہیں اور ان آیات میں تاویل کئے بغیر ایک مسلمان کے لئے چارۂ کار بھی نہیں ہے۔

قرآن کے بعد اسلامی عقائد کا دوسرا ماخذ احادیث ہیں۔ لیکن اس خیال کو ذہن میں لے کر جب ہم اقوالِ پیغمبر کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس میں انبیاء یا ائمہ کو معصوم کہا گیا ہو۔ رسول اللہ نے متعدد موقعوں پر اپنے اہلِ بیت اور اصحاب کے فضائل بیان کئے ہیں، خصوصاً، ابوالائمہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں تو تمام

محدثین اہلِ سنت یہ لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام میں جس قدر فضائل حضرت امیر کے وارد ہوئے ہیں، اتنے کسی صحابی کے وارد نہیں ہوتے، با اینہمہ کسی حدیث میں معصوم ان کو بھی نہیں کہا گیا۔

بہرحال قطع نظر اس امر کے کہ قرآن اور اس کے بعد حدیث، یہ دونوں عصمتِ انبیاء کے بیان سے خاموش ہیں، اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قرونِ اولیٰ کے متکلمین نے اپنی کسی تصنیف میں عصمتِ انبیاء کے عقیدے کا کوئی ذکر نہیں کیا، حالانکہ یہ وہ دور تھا، جب ان کے سامنے پہلا کام عیسائیت (Christianity) کا دفاع تھا اور یہ عقیدہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ مفید مقصد ہو سکتا تھا۔ چنانچہ عقائد اہلِ سنت میں پہلا رسالہ عبداللہ بن اسماعیل الہاشمی کا ہے، جو اس نے عبد المسیح بن اسحاق الکندی کے لئے تحریر کیا تھا[1] جس کی تصنیف خلیفہ عباسی مامون الرشید (۸۱۳ - ۸۳۳ء) کے زمانے میں ہوئی ہے۔ اس رسالے کی تصنیف کی غرض اگرچہ مرسَل الیہ کو دینِ اسلام کی صحت سے مطمئن کرنا تھا، با اینہمہ اس نے کسی مقام پر عصمتِ انبیاء کے عقیدے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ خود کندی نے اس کی رد میں جو رسالہ لکھا ہے، جس میں اس نے پیغمبرِ اسلام کی نبوت کی صحت کے عدمِ اعتراف کے اسباب کے لئے ایک طویل باب اپنے رسالے میں رکھا ہے۔ اس میں بھی اس نے اصلاً یا ضمناً عصمتِ انبیاء کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ پیغمبرِ اسلام کی نبوت کی صحت کے عدمِ اعتراف کے اسباب پر اس نے مفصل بحث کی ہے۔

دوسرا رسالہ: کتاب الدین والدولۃ[2] ہے، جو متوکل کی خلافت (۸۴۷ - ۸۶۱ء) کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی اس عقیدے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا مؤلف علی الطبری ہے، جو نصرانی سے مسلمان ہوا تھا۔ یہ وہ دور تھا، جب توراۃ و انجیل اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات

---

[1] ٹی۔ ڈبلیو۔ ارنلڈ (Preaching of Islam) ذیل اول، و کتاب احتجاج الکندی ترجمہ سر ولیم میور

[2] کتاب الدین والدولۃ ترجمہ Mingana طبع لندن، ۱۹۲۲

کے درمیان اختلافات پر بحثیں جاری تھیں، بایں ہمہ کسی مقام پر اس نے اس امر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ اسلام میں عصمت انبیاء کا عقیدہ نصرانیت کے اثر سے پیدا ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے آخر تک اس عقیدے نے علم کلام میں کوئی جگہ حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس کے بعد بھی تقریباً دو سو سال تک پورا اسلامی ادب عصمت انبیا کے ذکر سے خاموش نظر آتا ہے چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں پہلی مرتبہ فقہ اکبر نامی کتاب میں اشاراتی انداز پر اس کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ اسی کے متوازی جب ہم شیعہ کتب احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں کثرت کے ساتھ ائمہ اثنا عشری کی عصمت پر احادیث ملتی ہیں۔ شیعوں کے یہاں چونکہ عقیدہ امامت ایک بنیادی عقیدہ ہے اور ان کے نزدیک امام کا معصوم ہونا بھی ضروری ہے اس لئے انبیا بدرجہ اولی معصوم قرار پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مشہور مستشرق گولڈزیہر (Goldzihar) کا یہ بیان حقیقت سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ عقیدہ اس دور میں پیدا ہوا، جب شیعہ علم کلام کو ترقی ہوئی اور امامت وغیرہ پر بحثوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ یہ خیال اس وقت اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود جناب رسالت مآب اور امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کے ارشادات میں کوئی قول ایسا نہیں ملتا جو ائمہ اثنا عشری کی عصمت کے سلسلے میں دلیل بن سکے بلکہ یہ کہنا بھی خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ "معصوم" کا لفظ ہی ائمہ کے دور سے قبل نہیں ملتا۔

بہر حال اس سلسلے میں متکلمین شیعہ حسب ذیل آیات سے ائمہ کی عصمت کو ثابت کرتے ہیں۔

۱۔ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (سورۃ ص ۸۲ - ۸۳)	شیطان نے کہا: تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا، سوائے ان کے جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

(باقی آئندہ)

درویش حسین والہ ہروی
ایک تعارف

ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری صاحب شعبۂ فارسی، ٹی۔ ان۔ بی۔ کالج، بھاگلپور

مغل بادشاہوں کا عہد ہندوستان میں فارسی شاعری کا زرین ترین عہد مانا جاتا ہے۔ علم وادب، شاعری اور تہذیب وتمدن کے میدان میں مغل بادشاہوں اور امیروں کے قابلِ تحسین کارنامے آج بھی ملک کے تمام گوشوں میں موجود ہیں۔ ان بادشاہوں اور امیروں نے نہ صرف یہ کہ بڑی بڑی فتوحات کے ذریعہ اپنی سلطنت کو وسیع تر بنایا بلکہ ہندوستانیوں کی زندگی میں ایک نئی روح ڈالتے ہوئے تہذیب وتمدن کا بیش بہا خزانہ بھی انھیں عطا کیا۔ اکبر اور اس کے بعد کے تمام بادشاہوں نے اپنی زندگی کا معتد بہ حصہ ادب اور مختلف فنون کی ترقی میں صرف کر دیا۔ یہ انھیں بادشاہوں کے ذوق وشوق اور فیاضیوں کا نتیجہ تھا کہ ایران سے بے شمار شعرا اور فنکار ہندوستان میں وارد ہوتے۔ چنانچہ انھیں لوگوں کی طرح درویش حسین والہ ہروی بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی شناخت اور انعام واکرام کی توقع لے کر جہانگیر بادشاہ کی حکومت کے آخر زمانہ میں ہندوستان آیا اور تا دم مرگ اسی سرزمین میں رہا۔

نام | والہ ہروی کے حالات زندگی بہت کم تذکروں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ اپنے دیوان مخطوطہ کے دیباچہ میں وہ خود ہی اپنا نام درویش حسین والہ ہروی ظاہر کرتا ہے اور اپنے متعلق یوں رقمطراز ہے ؎

طفل دبستان خلقت و نو آموز مکتب فطرت دارستہ از کشمکش تعلق و تجرد درویش حسین[1]

---

[1] دیوان والہ ہروی مخطوطہ (خدا بخش خاں لائبریری، بانکی پور، پٹنہ) کیٹلاگ ۲۲۲

ہروی بجہت تذکرۂ خود وسیلہ و برای تبصرۂ خود فدیہ ای می خواست[1]

مندرجہ بالا دیوان میں وہ کئی مقامات پر اپنا پورا نام خود نے لکھتا ہے مثلاً ؎

درویش حسین ہروی آنکہ در آموخت   افلاک بر بیدلان سبق افلاک پر انزا[2]

اسی دیوان میں ایک دوسری جگہ وہ اپنا پورا نام رباعی میں ظاہر کرتا ہے ؎

درویش حسین والۂ صبح وصال   ای مہر چہار بالش اوجِ کمال

خواہم کہ بنور تو رسم چون سایہ   لیکن چہ کنم کہ شخص من گشتہ وبال[3]

کچھ تذکرہ نگاروں نے اس کا نام صرف "درویش" یا "محمد درویش" لکھا ہے حالانکہ اس کا پورا نام درویش حسین اور تخلص "والہ ہروی" تھا جیسا کہ مذکورہ اشعار میں مشاہدہ کیا گیا۔ والہ ہروی کے ہم عصر شاعر مرزا بیدل اپنی مشہور کتاب "چہار عنصر" میں والہ ہروی کی تعریف زور دار الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور اس کا نام "درویش حسین" بتاتے ہیں۔[4] ملا سید اشرف ماژندرانی کے ایک شاگرد لالہ چنپت رائے نے ان الذکر کے کچھ خطوط اپنی کتاب "مفید الانشا" میں ترتیب دیئے ہیں ان میں سے ایک خط میں اشرف ماژندرانی والہ ہروی کی ایک رباعی نقل کرتے ہوئے اس کا نام مولانا درویش حسین بتلاتے ہیں۔[5]

تاریخ پیدائش | والہ ہروی کی پیدائش کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا لیکن دیوان میں موجود اسکے ایک قطعہ سے اسکی تاریخ پیدائش پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ اس قطعہ سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اسکا ایک لڑکا مسمی محی الدین ۱۰۸۱ھ کے پانچویں ماہ میں بروز جمعرات پیدا ہوا تھا۔ اور اس وقت خود اسکی عمر پچاس برس کی تھی۔ قطعہ کے آخری مصرع

---

[1] دیباچہ دیوان ہذا، ورق ۱ [2] دیوان مرتبہ خاکسار، ص ۱۳۵ (پٹنہ یونیورسٹی لائبریری) انگریزی زبان میں

[3] ایضاً ص ۲۲۴

[4] چہار عنصر مخطوطہ، ورق ۴۳ اور ۴۴، خدا بخش خاں لائبریری، بانکی پور، پٹنہ

[5] مفید الانشا، مخطوطہ ورق ۶۹ ایضاً

سے اس لڑکے کی پیدائش کا سنہ ۱۰۴۰ھ نکلتا ہے اور اس کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں والہ خود اقرار کرتا ہے کہ اس کی عمر اس وقت پچاس سال کی تھی اس طرح ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ والہ ہروی کی پیدائش سنہ ۹۹۰ھ میں ہوئی ہوگی۔ قطعہ مذکور ملاحظہ ہو

جمیثانی واز ماه پنجم روز پنجشنبه — که واله را چراغ دیده روشن کرد مقصودش
قریب گام پنجاه از طریق عمر پیموده — جوانی زجوان تازه ای بخشید معبودش
بمحی الدین مسمی کردش خواهم چو بہناش — بجود مشغول دارد آنکه گردانید موجودش
جمل دان فرد سال تولدش را رقم زن شد — بالفاظی که نفظی بود از آنها اسم محمودش
بهر حرفی زنامش یک صد عبرت آگفتا شد — "بمحی الدین قرین باد اسعاد" سال مولودش[1]

جائے پیدائش | اس شاعر کی پیدائش صوبہ خراسان کے ایک شہر ہرات[2] میں ہوئی تخلص ہروی خود اس بات کی شہادت پیش کرتا ہے کہ اس کا تعلق ہرات سے تھا جس کے لئے اس کے دل میں ہمیشہ والہانہ محبت رہی وہ جب تک ہندوستان میں زندہ رہا اپنی جائے پیدائش ہرات کے لئے بے قرار رہا اور اس کی جدائی میں غم کے آنسو بہاتا رہا اور وطن واپس جانے کی خواہش دل میں دبائے ہوئے یہیں فوت بھی ہوگیا۔ اعتماد الدولہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھتے ہوئے ہرات واپس جانے کی شدید خواہش کا اظہار وہ ان لفظوں میں کرتا ہے ؎

صاحبا! ہیچمدان بندۂ ایں در واله — مدتی رفت که از مسکن مالوف جداست
بس که بربادِ ہری ریختہ از دیدہ سرشک — خار خشک فراش بسعد دنشو ونماست
گرچه صعب ست رسیدن بہراتش اما — قصہ کوتاه که در دستِ تو و دست خداست[3]

اس کے دیوان سے چند اشعار اس بات کے ثبوت میں کافی ہوں گے کہ وہ ہرات کا باشندہ تھا

---

[1] دیوان مرتبہ خاکسار ص ۱۴۳ (پٹنہ یونیورسٹی لائبریری)

[2] ہرات اس وقت افغانستان کا ایک شہر ہے جو قدیم زمانہ میں ایران کا ایک حصہ تھا۔

[3] دیوان، ص ۴۴۳

جو خراسان میں واقع ہے اور جس کے لئے ہندوستان میں رہ کر وہ زندگی بھر غم جدائی کے آنسو بہاتا رہا مگر وطن واپس نہ جا سکا ۔

حسن ہر جا کہ آورد سری دید مرا — گفت با عشق کہ در ہند خراسانی است[1]

یاد ہراتم از دل محزون نمی رود — لیلی بروں زخاطر مجنوں نمی رود[2]

زوالہ چند پرسی کز گدای کشوری برگو — ز ایرانم تعالی شانہ لیکن از خراسانم[3]

ندیدہ دید ہری عمر صرف شد بتمامی — نبرد ره ز خ غربت بطبع زحمت خامی[4]

آباواجداد والہ ہروی نے اپنے دیوان میں مختلف مقامات پر اپنے والد بزرگوار کی تعریف کی ہے اور ان کی روحانی عظمت اور بزرگی کا ذکر زوردار الفاظ میں کیا ہے ایک جگہ طویل نظم میں وہ اپنے والد بزرگوار کا نام شیخ غلام علی بتاتا ہے ۔

امام صومعہ شیخ جہاں غلام علی — بفقر فقر بری ز احتیاج امکانی

ستودہ والد و شایستہ مرشد والہ — وجود آگہی و معنی مسلمانی[5]

اس کے دیوان کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے والد شیخ غلام علی بہت متشرع اور پارسا تھے اور یہ کہ عوام کے درمیان ان کی کافی عزت اور احترام تھا وہ سحر خیز تھے اور صبح کی عبادت بلاناغہ کرتے تھے ان کے اوقات ہمیشہ عبادت و ریاضت میں گذرتے تھے ۔

شبی نرفت بسوی سحر کہ دیدۂ او — نداشت بر رہ صبح نخست دربانی

نبرد تا بدر شام ہیچ صبحدمی — بپای روز بجز راہ ذکر یزدانی[6]

---

[1] دیوان ص ۲۱۹

[2] ایضاً ص ۲۰۱

[3] ایضاً ص ۳۴۰

[4] ایضاً ص ۳۸۸

[5] ایضاً ص ۹۴

[6] ایضاً ص ۹۴

شیخ قضا اقضا مرد قدر را قدر — شیخ غلام علی منتہی از منتہا
در صفت اصحاب حال چوں تو کم آمد بلی — ہست فزوں حد و عدد مبتدی از مبتدا
باد مسیح است باد بادم جاں بخش تو — قفل زدہ انفاس تو بر در دار الشفا
گرچہ ازیں خاکداں وال در حق شدی — فیض تو باقی بود چوں پدراں سما[1]

والہروی کے والد کی زندگی خدا پرستی پر مشتمل تھی وہ اپنے زمانہ کے جید عالم تھے اور علم و فضل میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا بقول والہ اگر ان کے والد کا خرقہ زمین پر گر جاتا تو اس کو اُٹھانے کے لئے کعبہ خود اپنی جگہ سے دوڑ پڑتا۔ اس کے والد علم و فضل کے ایسے سمندر تھے جس کی لہریں فلاطون جیسے عالم و فاضل کی کشتی علم و فضل کو چور کر ڈالتیں ؎

کس را ز فاضل یدی چوں پدر نسبت — تصدیق دریں مسئلہ حق شد دیگر انزا
درویش غلام علی او مرد کہ در فقر — نفی از دگری کرد بمعنی دیگر انزا
شیخی است کہ چوں خرقہ اش از دوش بیفتد — از جا بدود کعبہ بہ برداشتن آنزا
بحریست ز دانش کہ گہی موجۂ گفتار — کشتی شکند فضل فلاطوں ہنر انزا[2]

والہ کی ابتدائی تعلیم | والہروی نے کہاں اور کس طرح اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی، یہ کہنا بہت مشکل ہے کیوں کہ تذکرے اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں لیکن داخلی شہادت اس سلسلہ میں زیادہ معتبر ہے خود اس کے اشعار کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابتدائی تعلیم اس نے خود اپنے والد بزرگوار شیخ غلام علی سے حاصل کی جو اس کے استاد بھی رہے اور بے شک ہرات ہی وہ جگہ ہے جہاں شروع میں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی ؎

جل شانہ ہری از جملۂ آفات مصون — کہ وہ ہم مولدی ام در خور و ہم منشائی[3]

---

[1] دیوان ص ۹۳

[2] ایضاً ص ۱۲۰

[3] ایضاً ص ۷۰

اس کے اشعار سے یہ کہیں پتہ نہیں چلتا کہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے والہ ہرات سے باہر گیا اس کے والد ہی اس کے استاد اور رہبر رہے جیسا کہ مندرجہ ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے[۵]

پیر من است و پدر مرشد و استاد من — دادہ زمبدا خبر چون خبر از مبتدا[۱]

والہروی کے دوسرے اُستاد مرزا فصیحی انصاری تھے جن کا ذکر وہ اپنے دیوان کے مختلف مقامات پر نہایت ادب و احترام کے ساتھ کرتا ہے نہ صرف دیوان کے دیباچہ میں بلکہ اصنافِ سخن کے ہر حصے میں خواہ قصیدہ ہو، غزل ہو، ترجیع بند ہو یا رباعی وہ اپنے اس اُستاد کی تعریف بڑے شد ومد سے کرتا ہے۔ دیباچۂ دیوان سے اس سلسلہ کا ماخذ ملاحظہ کریں ؎

حضرت استادی وافتخاری وسندی میرزا فصیحی الحسینی الانصاری ادام اللہ برکاتہ افاضتہ المقیام القیام :

حبذا روز و روزگار سخن	خامہ و فکر را درود از من
آمد آب سخن بجوی قلم	از رہ چشمہ سار قاف قلم
در گہی کہ زیر عرش خدا	از سخن بود بر سخن شدوا
شد ثنا فرض چرخ و ارکانرا	مرد میدان علم و عرفانرا
سایۂ معنی مسیحی را	عقلِ کل میرزا فصیحی را
مصطفیٰ زادہ مرتضیٰ پیوند	زان پدر این چنیں سزد فرزند
در جنت بود لب و دہنش	حور و غلمان عبارت و سخنش[۲]

والہروی کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے استاد کا ایک نہایت سعادت مند اور لائق شاگرد تھا اور یہ کہ اس کے استاد فصیحی کو خود اس کی شاگردی پر بڑا ناز تھا چنانچہ وہ اس کو قریب تر رکھتا

---

[۱] دیوان ص ۳۰

[۲] دیباچہ دیوان ص ۲

تھا اور اپنے تمام شاگردوں میں سب سے زیادہ محبت اسی سے کرتا تھا ؎

او بشاگردیم تفاخر کرد　　　شب ام از تربیت در کرد

بستود از بزرگی خویشم　　　داشت از جملہ بندگان پیشم[1]

اسی دیباچہ دیوان میں آگے چل کر اپنے استاد کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی نثر نگاری پر کوئی حرف نہیں رکھ سکتا اور اس کی نظم تمام عیوب سے پاک ہوا کرتی ہے ۔ اصناف سخن کے ماہرین جب تک مرزا فصیحی سے اجازت نہیں لے لیتے اور قبولیت حاصل نہیں کر لیتے تب تک اپنے اشعار کو رواج عام نہیں دے سکتے ؎

"ناقدانِ دارالعیار معنی نقد سخن را تا بر محک سماع او عرض نکنند و لبسکہ قبول او نرسانند زیور سماع و روز بازار روایتی نپذیرد[2]"

والہروی کا مقام | فارسی کی دنیائے شاعری میں والہروی کا مقام مسلم ہے اس کے عہد کے مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں نے اس کی تعریفیں کی ہیں ۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا "مفید الانشاء" کے ایک خط میں ملا سعید اشرف ماژندرانی رقمطراز ہیں کہ والہروی سے ان کے ذاتی تعلقات تھے اور بھی آگے لکھتے ہیں کہ والہروی نہ صرف عربی زبان میں ماہر تھا بلکہ فارسی شاعری کو بھی درجۂ کمال تک پہنچا دیا ؎

من ہم با ملا آشنا بودم آں عزیز علاوہ علوم عربیہ رتبۂ شعر را بکمال رسانیدہ بود و از علائق دنیوی فی الحقیقت وارستگی تمام داشت[3]"

مرزا بیدل نے اپنے سفر بنگالہ کے دوران والہروی سے ملاقات کی تھی اس خاص واقعہ کو مرزا نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "چہار عنصر" میں بیان کیا ہے کتاب مذکور کی عبارتوں کے

---

[1] دیباچہ دیوان ، ص ۲

[2] ایضاً

[3] مفید الانشاء (خدا بخش خاں لائبریری ، بانکی پور پٹنہ) ص ۶۹

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل والہ ہروی کی شاعرانہ صلاحیت سے بہت متاثر ہوئے تھے اور اس کے فنِ خطاطی کو بھی بہت پسند کیا تھا[1] اپنی ایک رباعی میں والہ خود ہی اپنے مقام کا تعین ان الفاظ میں کرتا ہے ؎

درویش کہ در ملک سخن سلطانست　　از فضل و ہنر نادرۂ دورانست

چوں آئینہ صاف دل بود باہمہ کس　　از خوبانست و والہ خوبانست[2]

والہ ہروی نے شاعری کے تقریباً تمام اصناف میں اپنی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار کیا ہے اس کی شاعری کے مطالعہ کے بعد اس کے جینیس کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی شاعری کا اندازِ بیان نہایت سادہ اور رواں ہے تخیلات عام طور سے مہذب اور مستحسن ہیں اور زبان شاعری سادہ، عام فہم اور تکلفات سے بری ہے سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ والہ ہروی ایک ایسے دور میں زندگی بسر کرتا تھا جس میں شاعری کو بیجا تکلفات و تصنعات کے زیور سے آراستہ کرنا ایک عام دستور بن گیا تھا، خاقانی، انوری اور فیضی کی شاعری میں ہمیں بے جا تکلفات کے التزامات عام طور سے دیکھنے کو ملتے ہیں سبکِ ہندی کی یہی نمایاں خوبی ہے اور اس طرح کی شاعری کا رواج والہ ہروی کے زمانہ میں عام طور پر پھیل چکا تھا لیکن والہ ہروی کی شاعری اس نہج سے بالکل الگ ہے اس کی شاعری سادہ مگر اثرانگیز ہے اس کی شاعری کے الفاظ خالص اور عام فہم ہیں۔ اس زمانہ کے رائج محاورات اور ضرب الامثال کے استعمال نے اس کی شاعری کو زوردار اور پرجوش بنا دیا ہے والہ کو اس بات کا بالکل شوق نہیں تھا کہ اپنی شاعری کو خواہ مخواہ پر تکلف اور پر تصنع بنا کر پیش کرے یہی وجہ ہے کہ ہم اس کی شاعری میں بے اَز قیاس تشبیہات و استعارات کا استعمال نہیں دیکھتے۔ اس کی شاعری میں جہاں کہیں تشبیہوں اور استعاروں کو استعمال کیا گیا ہے، شاعرانہ تجربات کا فطری اور لازمی حصہ سمجھ کر کیا گیا ہے

---

[1] چہار عنصر مخطوطہ ورق ۱۱ خدابخش خاں لائبریری بانکی پور پٹنہ

[2] دیوان ص ۳۲۴

جن کو کسی حال میں خیالات سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اس کی شاعری رسم زمانہ کے برعکس ہے اور یہ بات واؔلہ کے صحت مند نظریہ کی علامت ہے۔اس معاملہ میں بلکہ وہ اپنے زمانہ کا پیشرو ہے اور فارسی شاعری میں صحیح اور درست رجحانات کا قائد ہے کیوں کہ انھی رجحانات نے آگے چل کر عہد قاچاریہ میں فارسی ادب و شاعری میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا جس کو آج کل کی زبان میں ترقی پسند تحریک کا نام دیتے ہیں یہاں ہم والہ ہروی کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتے ہیں جن سے قارئین حضرات کو اس کی شاعری کے سلسلے میں مذکورہ باتوں کا اندازہ ہو سکے ؎

چو باشد رگ گردن و زور بازو | در افتاد گیہا بود پہلوانی
بعون ثنا کردہ در ملک نامہ | سخن نصب رایات صاحبقرانی
برا فرافت فکر نصیری مناقب | درفشی بفوج ثنا کاویانی [1]

سادگی، روانی اور برجستگی کا کتنا عمدہ نمونہ مذکورہ اشعار میں پیش کیا گیا ہے؟ اپنے ممدوح کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کتنے اچھوتے انداز میں دعا گو ہے ؎

طفل بدخواہ تو اندر رحم مادر خویش | از نہیب تو کند شب ہمہ شب جای بدل
تا فنا را نبود شیوہ در آئین چو بقا | تا ابد را نرسد دست بدامان ازل
گلشن جاہ تو آسودہ ز دیباہ زوال | فصل نوروز تو محفوظ ز تغییر عمل [2]

ذیل کے اشعار میں محبوب کی بے رخی اور اُس کے لئے قیامت کے روز اس کے جوابدہ ہونے سے بچنے کی دلیل ملاحظہ فرمائیں ؎

ایں قیامت بیں کہ چوں فکر جواب حشر داشت
در حساب کشتگان خود شمار ما نہ کرد

---

[1] دیوان مرتبہ خاکسار، ص ۷۷، ۸۰ (پٹنہ یونیورسٹی لائبریری)

[2] ایضاً ص ۴۱

جای شادی از محبت دائم اندر دل نماند
از چہ روزی توقف در دیار ما نہ کرد[1]

تلمیح کے برمحل استعمال پر غور فرمائیں ؎

تنہا نہ گل ز آمدنت در چمن شگفت   تا شاخسار سایۂ سرو سمن شگفت
چشمی براہ مصر پر از اشک حسرت است   ہر نرگسی کہ از گل بیت الحزن شگفت[2]

اپنی تعلی کس طرح کرتا ہے؟

عمر سخن دراز کہ تا حرف گفت و گوست   من یادگار اویم و او یادگار من
نخلی کشیدہ قامت باغ سخن منم   معنی و لفظ من ثمر و شاخسار من[3]

چند اور اشعار ملاحظہ کریں ؎

پیغام وصل می رسد از ہجر دیدہ را   تقریر می کند سخن ناشنیدہ را
پوشید جامہ دختر رز تہ نما بہ بیں   مستوری لباس گیسو بریدہ را
ای آنکہ یوسف از تو محبوس خانہ است   از بندہ بندگی برسان نور دیدہ را[4]
موافق نیابی دمی ہمدمی را   اگر سر بعالم دہی عالمی را
فراق تو دامن نشیں کرد دل را   بطوفان آوردہ شبنمی را[5]
پریشاں دماغی گر از عشق یابی   ترا ذوق زلف پریشاں نباشد
چہ تاثیر خواہی ازاں گریہ وآلہ   کہ با اشک چشمی بداماں نباشد[6]

---

[1] دیوان مرتبۂ خاکسار، ص ۲۶۰ (پٹنہ یونیورسٹی لائبریری)
[2] ایضاً ص ۲۲۷
[3] ایضاً ص ۳۰۸
[4] ایضاً ص ۲۰۰
[5] ایضاً ص ۱۹۶
[6] ایضاً ص ۲۰۱

علم منطق ——— ایک جائزہ

(۶)

مولانا بدرالزماں نیپالی ——— مرکزی دارالعلوم بنارس

مدرسۂ اسکندریہ فلسفیہ | نوفلاطونیت کے گڑھ اسکندریہ سے جب اس کا خاتمہ ہوگیا تو ایک نئے طرز فکر نے جنم لیا۔ اور آہستہ آہستہ نوفلاطونیت کے مسند پر قابض ہوگئی، جسے ہم مدرسۃ الاسکندریۃ الفلسفیۃ، کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عام مؤرخین اسے نوفلاطونیت سے الگ نہیں مانتے، بلکہ دونوں کو ایک ہی تحریک تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کو ایک دوسرے فکر کی پیداوار سمجھنا زیادہ مناسب ہے ہاں اس مکتب فکر کو نوفلاطونیت سے یک گونہ الفت ضرور تھی۔ لیکن اس کے اصول نوفلاطونیت کی طرح مسیحیت سے ٹکرانے والے نہیں تھے اسی لئے عیسائیوں نے اس کو باقی رکھنے میں کوئی تأمل نہیں کیا۔

اس فلسفیانہ مدرسہ کے تین بڑے مبلغ گذرے ہیں۔ اوّل ہرمس اسکندری دوم یحیٰی نحوی اور سوم اصطفن اسکندری، ان میں یحیٰی نحوی کو سب سے زیادہ ناموری حاصل ہوئی۔ غالباً اس مدرسہ میں صرف یحیٰی نحوی نے اور پھر اصطفن اسکندری نے منطق پر کچھ کام کیا ہے۔ بقیہ لوگوں نے تعلیم وتدریس کے سوا منطق پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، ان دونوں نے منطق ارسطو کے بعض بعض حصوں کی بڑی اچھی شرح کی ہے۔ یحیٰی نحوی نے منطق ارسطو کی شرح اور فورفوریوس صوری کی ایساغوجی کی شرح لکھنے کے ساتھ ہی چھ مقالوں پر مشتمل ارسطو پر بہت سے

اعتراضات بھی کئے ہیں۔ [۲۵] یحیٰ نحوی کی طرح اصطفن اسکندری نے بھی منطق ارسطو کے بعض حصوں کی شرح لکھی ہے۔ بہرحال اس اسکول نے بھی اپنے نظریات کے مطابق منطق ارسطو کی شرح پیش کی، یہ فتح اسکندریہ کے کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے۔

اس طرح اگر ان شروح کا ایک سرسری جائزہ لیں تو ہمیں تین قسم کی شرحیں نظر آئیں گی:

۱۔ مشائین کی شرحیں: یہ ارسطوی نظریات کی ترجمانی، تمام شرحوں سے زیادہ صحیح انداز میں کرتی ہیں کیونکہ اس قسم کے شارحین نے ارسطو کے نقطۂ نظر کو بالکل قریب سے دیکھا تھا اور صرف اسی کے فکر کے تابع تھے۔

۲۔ نوفلاطونین کی شرحیں: یہ لوگ چونکہ ارسطو اور افلاطون کے نظریات کے مابین ایک توجیہی راہ کے متلاشی تھے۔ اس لئے ان کی شرحیں ارسطو کے خیالات کو پوری آزادی کے ساتھ بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کریں گی، لہذا صحت ترجمانی میں یہ شرحیں مشائی شرحوں کو نہیں پا سکتیں۔

۳۔ مدرسۂ اسکندریہ فلسفیہ کی شرحیں: عیسائیت پر کامل ایمان لانے کے بعد کی شرحیں جو عیسائیت کی ستم رسانی کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہوں۔ آزادانہ اور بے باکانہ تفسیریں نہیں ہو سکتیں۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ منطق و فلسفہ کو حرام قرار دے دیا گیا ہو اور جب شارح، مذہب کا تابع ہو تو شعوری طور پر ایسی شرحوں کا مذہب کے تابع بن جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جس طرح بہت سے مناطقہ نے ارسطوی منطق کی شرح کسی خاص منطقیانہ ادارے سے شائع کیا اسی طرح بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے کسی خاص منطقیانہ اور فلسفیانہ مرکز فکر سے اپنی شرحوں یا منطق ارسطو کے بعض حصّوں کا جدید ایڈیشن اپنی تفسیر اور توضیح کے ساتھ شائع کیا۔

چنانچہ جالینوس (جو اسکندر افرودیسی کا ہم عصر ہے اس کو اسکندر کا بڑا سروالا ہونے کی

وجہ سے رأس البغل کہتا تھا) نے منطق ارسطو کے ایک جز و باری آرمینیاس (عبارہ) کی شرح کے علاوہ، علم البرہان میں بھی کوئی کتاب لکھی، چنانچہ قفطی لکھتے ہیں " مؤلف الکتب الجلیلۃ فی صناعۃ الطب وغیرھا من علم الطبیعۃ وعلم البرھان [۴۵] کہ جالینوس طب کے علاوہ علم طبیعہ اور علم برہان کے اندر بڑی اچھی اچھی کتابوں کا مؤلف ہے۔

چھٹی صدی عیسوی میں روم کی علمی حالت کو کلیمنٹ، سی، جے، وپ نے اپنی تاریخ فلسفہ میں بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے اسے ہم آگے نقل کر رہے ہیں۔

" آگسٹائن " کی موت کے بعد والی صدی میں روم وحشی اقوام کے سرداروں کے ہاتھ میں آگیا تھا، ان سرداروں میں کیسوڈرس " اور " بوتھیس " کو جو بڑے ہی اچھے عالم تھے، اپنا وزیر بنالیا۔ انھوں نے قدیم علوم کے ضائع ہوجانے کا خطرہ محسوس کرلیا۔ چنانچہ " کیسوڈرس " نے وزارت سے مستعفی ہوکر ۵۴۰ء میں ایک مرکز کی بنیاد ڈالی۔ جہاں ایک بڑے کتب خانہ کا انتظام کیا، لوگ یہاں مطالعہ میں اپنے اکثر اوقات بطورِ فریضہ صرف کرتے تھے۔ اس مرکز علمی کے بعد بہت سی نمانقاہوں کی بنیاد پڑی اور یہی علوم قدیمہ کی حفاظت کا ذریعہ ہوئے، " کیسوڈرس " نے ایک رسالہ تحریر کیا جس کا ایک جزو منطق پر بھی تھا۔ یہ رسالہ قواعد صرف ونحو، منطق وانشاء، حساب وہندسہ اور نجوم وموسیقی فنون سبعہ پر تھا، اول کے تین ابتدائی اور آخر کے چار انتہائی علوم سمجھے جاتے تھے۔

" بوتھیس " نے گو وزارت سے استعفیٰ نہ دیا لیکن اخیر عمر میں اس سے وزارت چھین لی گئی اور سارے اعزازات خاک میں ملا دیئے گئے اور اسے حبس دوام کی زندگی گذارنی پڑی۔ اس دوران اس نے بے شمار کتابوں کا ترجمہ اور تالیف کی، لیکن کوئی کتاب بھی رواج نہ پاسکی۔ ہاں صرف ارسطو کی منطق کا جو ترجمہ اور اس پر حاشیہ اس نے لگایا اس سے جدید یورپ کے آباؤ اجداد کو اچھا خاصا فائدہ پہنچا۔ اس نے فلاطینوس کے دوست پارفری (جو چوتھی صدی کے وسط میں گذرا ہے) کی ایک مختصر سی کتاب (جسے بالفاظ صحیح منطق کا

مقدمہ کہا جانا چاہیئے) کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں مموات خمسہ سے بحث کی گئی ہے۔ اور (غالباً اسی کتاب کی) شرح بھی لکھی ۴۹ گویا اس دور میں منطق کو بڑی اچھی کامیابی حاصل تھی۔

قیاصرۂ روم کو فتح یونان سے پہلے علوم و معارف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اپنا سب کچھ اسلحہ کو سمجھتے تھے۔ لیکن جب یونان فتح ہوا تو انھیں، مفتوحین کی علمی صلاحیتوں اور منطقی استدلالات کو دیکھ کر رشک آیا، دھیرے دھیرے رومیوں نے بھی اس طرف توجہ دینی شروع کی۔ آخر قیاصرۂ روم کو بھی ان فنون کو اپنے یہاں رواج دینے اور اپنے نوجوانوں کی قابلیتوں کو علم کی روشنی میں لانے کا شوق پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں انھوں نے فلسفہ و منطق وغیرہ علوم عقلیہ کی بڑی خدمت کی۔ لیکن جس وقت روم کا سرکاری مذہب مسیحیت قرار پایا۔ ساری توجہات بے توجہی سے، اشتیاق نفرت سے، اور شفقت بے رحمی سے بدل گئی، ۵۲۹ء میں قیصر جسٹنیان نے تو یہاں تک آرڈر دے دیا کہ روم و یونان کے جتنے منطقیانہ اور فلسفیانہ ادارے چل رہے ہوں ان کو بند کردیا جائے اور ان پر وقف شدہ جائدادوں کو حکومت کی تحویل میں کرلیا جائے، اس حکم کے بعد تمام فلسفیانہ مدارس کا خاتمہ ہوگیا، ہاں کچھ تحریکیں اپنی حکمت عملی کی بنا پر کسی طرح رواج پذیر رہیں۔ ۵۰

مدارس انطاکیہ و حران ورہاء و نصیبین مدرسۂ اسکندریہ کے بعد جن مدارس نے منطق کی ترویج واشاعت کی ذمہ داری سنبھالی وہ انطاکیہ، حران، رہاء اور نصیبین کے مدرسے تھے جن پر صائبہ، یعاقبہ اور نساطرہ وغیرہ کا تسلط تھا، ان اسکولوں کے ذریعہ منطق و فلسفہ کی صدائیں مشرقی ممالک کے اندر پہنچتی تھیں۔ اہل عرب اسلام کی آمد سے قبل یہاں کے علوم کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتے تھے۔ بلکہ بعض بعض لوگوں نے یہاں آکر تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ جب اسلام آیا اس وقت یہ مدرسے بڑی اچھی پوزیشن میں

تھے۔ اہل عرب کے کان ان کی آواز سے مانوس ہو چکے تھے۔

فارابی (دسمبر ۹۵۰ء) نے مدرسہ انطاکیہ اور حران کا تعارف اور ان کی خدمات کا ایک مختصر مگر جامع خاکہ پیش کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "ظہورِ اسلام کے بعد مرکزیتِ علوم عقلیہ اسکندریہ سے انطاکیہ منتقل ہو گئی اور یہاں ایک زمانہ تک باقی رہی، حتیٰ کہ وہ زمانہ آگیا جب انطاکیہ میں صرف ایک معلم باقی رہ گیا، اس وقت اس سے دو آدمیوں نے (منطق و فلسفہ کی) تعلیم حاصل کی اور اپنے ساتھ بہت سی کتابیں لے گئے۔ ان میں سے ایک حرّانی تھا اور دوسرا مروی، مروی سے دو آدمی ابراہیم مروزی اور یوحنا بن حیلان مستفید ہوئے اور حرانی سے پادری اسرائیل اور قویری نے علم حاصل کیا اور بغداد گئے۔ اسرائیل کو دین سے دلچسپی ہو گئی اور قویری نے مزید تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ ادھر یوحنا بن حیلان کو بھی دین ہی کے اندر انہماک ہو گیا۔ لیکن ابراہیم مروزی بغداد آکر فروکش ہوا تو متی بن یونان نے اس سے علم حاصل کیا۔ اور میں (فارابی) نے یوحنا بن حیلان سے علم سیکھا اور کتاب البرہان (تحلیلات ثانیہ) کے آخر تک اسی سے پڑھا۔"[۱۲]

اس اجمالی بیان سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ علم منطق و فلسفہ کس طرح گھوم کر لوگوں کو فائدہ پہنچاتے رہے اور اپنی ترویج و اشاعت کے لئے کس طرح راستہ ہموار کرتے رہے۔

<u>خصوصیت</u> دورِ اول میں جتنے منطقی فرقے تھے سبھوں نے اپنی جولانیٔ فکر کے مطابق ایک ایسے گروہ کو تیار کیا تھا جو اس کے پیش کردہ فکر کے اصول و مبادی کی تشریح و توضیح اور اس کی نشر و اشاعت کرے اور یہ چیز تقریباً تمام تحریکات کے قائدین کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر فرد اپنے مؤسسِ مذہب ہی کی فکر پر آئندہ کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ اس فکر کا پیرو وہ گروہ جیسا بھی کرے، ایک دوسری جماعت اسی فکر کو اپنا فکر قرار دے کر اس کی صحیح یا غلط ترجمانی کرنے میں منہمک ہو جاتی ہے، جس کا محرک

یا تو خلوص ہوتا ہے یا ریا و نمود، بغض و عناد اور ایک منظم پروگرام کے تحت اس فکر کو مسخ کر دینے کی سازش ــــــــ اور بعض صورتیں ایسی نکلتی ہیں کہ اخلاص کے محرک ہونے کے باوجود فکر کے اندر کسی مصلحت کی بنا پر معمولی سا تصرف کر لیا جاتا ہے، اور یہ معمولی سا تصرف غیر معمولی تبدیلیاں پیش کرتا ہے جو فکر کو جدا کر دیتی ہیں۔

مشائیت، رواقیت اور ابیقوریت میں سے ہر ایک کو رومی یونانی دور میں رواج حاصل تھا، ہر ایک کے مدرسے اور تعلیم گاہیں تھیں ان میں سے ہر ایک کی ترویج و اشاعت کی بڑی کوششیں کی گئیں۔ شروح و حاشیہ اور تفسیر و توضیح کے ذریعہ عام فہم بنایا گیا لیکن تقریباً یہ تمام کارنامے مندرجہ بالا نظریات کے پیش نظر انجام دی گئیں گویا یہ ائمہ فن کی تخلیقات کی تشریح و توضیح کا دور تھا جس میں صاحب تخلیق کے فکر کے موافق شرحیں لکھی گئیں اور ایسی شرحیں بھی معرض وجود میں آئیں جو مخالفت پر مبنی تھیں۔ حالانکہ ان شارحوں کو مخالفت مقصود نہیں تھی۔ بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر صاحب فکر کے بعض اصولوں میں تصرف ہوا اور وہ فکر مسخ ہو کر رہ گیا۔ پہلے ذکر کی ہوئی تینوں قسم کی شرحیں ہمارے اس کلی بیان کا آئینہ دار ہیں۔

(ب) ہندوستان

نالندہ کے اندر منطق کی تعلیم جس معیار پر ہوتی تھی اس پر پورا اُترنے کے بعد آدمی کو منطق کے اندر اتنا درک ہو جاتا تھا کہ وہ منطق پر مستقل تصنیف تیار کر سکے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے اندر جو نقص ہو اس کی اصلاح کر کے اس لائق بنا دے کہ لوگوں کے مزاج کے موافق بن جائے اور وہ اسے اپنا گمشدہ سرمایہ سمجھ کر گلے لگالیں۔ چنانچہ یہ چیز اوجھا صاحب اور اِتسنگ کے بیانات سے صاف ظاہر ہے۔ ہیونگ سانگ کے بیانات کو سامنے رکھ کر یہ معلوم کر لینا قطعاً دشوار نہیں ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان علمی اعتبار سے

اس قدر ترقی کر چکا تھا کہ بیرون ممالک کے طلباء بھی یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ ہندوستان میں پڑھنے والے طلباء کی تعداد دو لاکھ بارہ ہزار سے بھی متجاوز تھی، جن اسکولوں میں ان طلبہ کو تعلیم دی جاتی تھی انھیں سے سب تو یقیناً اس طرح کے نہیں تھے، جن میں منطق کی باقاعدہ تعلیم ہوتی رہی ہو، لیکن وہ مدرسے جن میں اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہوتا تھا اور جن میں مذہبی علوم کے علاوہ بقیہ اور علوم پر بھی کچھ توجہ دی جاتی تھی۔ ان سب میں منطق کی تعلیم کو دوسرے علوم پر تقدم حاصل تھا۔ چنانچہ رائے بہادر اوجھا لکھتے ہیں:

" نیائے دوارتارک شاستر (تاگارجن کی تصنیف کردہ منطق کی تمہید) کے مطالعہ سے صحیح استدلال . . . . کی قوت پیدا ہوتی تھی "

ذیل میں اوجھا صاحب کی کتاب سے ایک لمبا اقتباس نقل کیا جا رہا ہے جس سے اس دور کی منطق کا ایک اجمالی خاکہ سامنے آجائے گا۔ وہ رقمطراز ہیں ———— " نیائے شاستر کا مصنف گوتم تھا، اس کے نیائے سوتروں کی شرح " باتسائن " نے کی۔ اور اس شرح کی تفسیر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں " ادت کر " نے لکھی، یہ تفسیر نیائے شاستر کے علماء میں بہت مستند سمجھی جاتی ہے، " واسودتا " کے مصنّف " سوبندھو " نے " مل ناگ " " نیائے استھتی " " دھرم کیرتی " اور " ادت کر " ان چاروں مصنّفوں کا ذکر کیا ہے، قیاساً یہ سبھی ساتویں صدی کے آغاز میں ہوئے ہوں گے، " ادت کر " کی تفسیر " واچسپتی مسر " نے لکھی، اور تفسیر کی تفسیر مزید " اُدیناچارج " نے " تات پریہ پری شدھی " نام سے لکھی، ۹۸۴ء کے قریب ایک دوسرے " ادین " نے اپنی مشہور کتاب " کسمانجلی " لکھی اس میں اس نے نیائے شاستر کے اصولوں سے ایشور کا وجود ثابت کیا ہے، دنیا میں مسئلہ توحید پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس کا بھی شمار ہے۔ " ادین " کا طرز استدلال اور اسلوب بیان نہایت عالمانہ اور حیرت انگیز ہے۔ اس میں اس نے " میمانسا " کے منافقانہ اصولوں اور ویدانتیوں، سانکھیوں اور بودھیوں کے ستکاریا د (علت میں معلول کا پہلے سے

موجود رہنا) کا کامل طور پر ازالہ کیا ہے، اس نے بودھ فلسفہ کی مخالفت میں بھی ایک کتاب "بودھ دھکار" لکھی۔ یہ سب کتابیں قدیم نیائے شاستر سے تعلق رکھتی ہیں۔

۶۰۰ء سے نیائے شاستر کے معتقدوں میں جین اور بودھ علماء نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان کا طرز استدلال قدیم طرز سے جداگانہ تھا۔ اس کی تکمیل آٹھویں صدی کے قریب ہوئی۔ اسے زمانۂ متوسط کا نیائے (منطق) کہتے ہیں۔ بودھ منطقی "دگناگ" نے اس دائرہ (مکتبۂ فکر) کی بنیاد ڈالی۔ مذہب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اسے نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا، اسے ایسے نہج پر ڈھال لیا گیا تھا کہ منصبی امور میں وہ خلل انداز نہ ہو سکے اور چونکہ منطق کی بنیاد ہی ہندوستان میں اس لئے پڑی تھی کہ مذہب کے رموز و اسرار کو سمجھنے میں مدد ملے اور نجاتِ ابدی حاصل کرنے کے وسائل کو استدلال کے ذریعہ پہچان لیا جائے، اس لئے اس میں کسی خاص ترمیم کی بھی ضرورت نہیں پیش آئی ہو گی، بہر حال ہندوستانی منطق اس دور میں کمال کو پہنچ چکی تھی، اس کے بعد اس کا انحطاط شروع ہو گیا۔

نالندہ میں رہنے والے "دھرم پال" کے تلمیذ "دھرم کیرتی" نے ساتویں صدی میں "نیائے بندو" نام کی کتاب لکھی (چنانچہ تسنگ لکھتا ہے کہ "اچاریہ جن" کے بعد دھرم کیرتی نے منطق میں اصلاح کی) جس پر "دھرموتر" نے ۸۰۰ء کے قریب ایک تفسیر مرتب کی۔ جین عالم "ہیم چندر" نے سوتروں کے طرز میں "پرمان میمانسا" لکھی ——— متوسلین کی زیادہ تر کتابیں اب لاپتہ ہیں۔ ہاں تبت میں بودھ نیائے سے متعلق کئی سنسکرت کتابوں کے تبتی ترجمے ملتے ہیں جن کی اصلیں حوادثِ روزگار کی نذر ہو گئیں۔ ۲۴

اصلی منطقی فرقہ "گوتم" کا تھا اس کے مقابلہ میں "کناد" کا فرقہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، اس لئے لوگوں نے خصوصی طور پر گوتمی منطق ہی کی تشریح و تفسیر کو لائق اعتنا سمجھا۔

ہندوستانی منطق و فلسفہ اور یہاں کے مناطقہ و فلاسفہ کی مدح عرب سیاحوں اور

مؤرخوں نے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ چنانچہ یعقوبی لکھتا ہے " سدھانت انھیں (ہندوستانیوں) کی ذہانت کا نتیجہ ہے جس سے یونانیوں اور ایرانیوں تک نے فائدہ اٹھایا، ..... منطق و فلسفہ کے اندران کی تصنیفات ہیں "[۴۳]

تیسری صدی کے ایک مؤرخ ابوزید سیرافی کا بیان ہے کہ " ہندوستان کے اہل علم برہمن کہلاتے ہیں اور ان میں شاعر بھی ہیں جو بادشاہوں کے درباروں میں رہتے ہیں اور جوتشی اور فلاسفر اور فال کھولنے والے اور بازی گر ہوتے ہیں اور یہ قنوج میں زیادہ ہیں جو " جوز[۴۴] کی مملکت میں بڑا شہر ہے "[۴۵]

خصوصیت | اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں منطق کی شروح در شروح اور تفسیر در تفسیر لکھی گئیں۔ بعض بعض خامیاں جواب تک چلی آرہی تھیں ان کا ازالہ کیا گیا، اور ایک نئے طرز پر استدلال کرنیوالوں کا ایک گروہ اسی زمانہ میں اٹھ کھڑا ہوا جس نے قدیم طریقے کی پیروی سے آزاد ہو کر منطق پر نظر ڈالی اور استنباط اور استخراج مسائل میں جدّت پیدا کر دی، منطق کی تعلیم کے لئے مستقل بڑے ادارے قائم ہوئے اور طلبہ کو اس مضمون میں اچھی طرح ٹریننگ دی جاتی رہی۔

(ج) ایران

ایران کا تقریباً تمام فلسفیانہ علم حملۂ اسکندر کے وقت ضائع ہو گیا تھا اور ایک مدت تک طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا، اس وجہ سے ان علوم و فنون کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔

الیٰ ان ملک " اردشیر بن بابک	یہاں تک کہ " اردشیر بن بابک ساسانی
من نسل ساسان	نے زمام حکومت سنبھالی، اور ہند و چین اور
فبعث الی بلاد الھند والصین	روم کے شہروں میں پائی جانے والی ایرانی

فی الکتب التی کانت قبلھم والی	کتابوں کو جمع کرنے کے لئے آدمی بھیجے
الروم ، ونسخ ما کان سقط الیھم	تو جو کچھ انھیں ملا اسے بادشاہ نے نقل کرایا
وتتبع بقایا یسیرۃ بقیت بالعراق	اور عراق کے اندر جو تھوڑا بہت باقی رہ گیا
۲۵	تھا اسے اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ نکالا۔

اور ساتھ ہی نہایت اچھے انداز پر تمام اہل ایران کو جماعتوں اور گروہوں میں بانٹ دیا تاکہ اہل سیاست کو انکار تبر اور مقام حاصل رہے، اہل زراعت کو اپنے کام سے کام ہو اور اہل علم کو اطمینان کے ساتھ علمی سرگرمیوں میں مصروف رہ کر ضائع شدہ علوم کی تلافی کا موقع مل سکے ـــــــ اس کی تفصیل بیرونی کی زبانی سنئے:

ان اردشیر بن بابک عند تجدیدہ	اردشیر بن بابک نے ملک فارس کی تجدید
ملک فارس، جدد الطبقات	کے وقت لوگوں کے طبقات از سر نو
وجعل الاساورۃ وابناء الملوک	قائم کئے، اساورۃ اور شاہی خاندان کو
فی اولھا، والنساک وسدنۃ	پہلے طبقہ میں رکھا، عباد، مغان اور علماء
النیران وارباب الدین فی	مذہب کو دوسرے میں، طبیبوں، نجومیوں
ثانیتھا، والاطباء المنجمین و	اور ہر قسم کے علماء کو تیسرے میں، اور
اصحاب العلوم فی ثالثتھا، والزراع	کاشت کاروں اور صنعت کاروں کو چوتھے
والصناع فی رابعتھا، علی مراتب	میں اور ان میں سے ہر ایک میں بھی
فی کل واحدۃ منھا۔ ۲۶	بہت سے درجے متعین کئے۔

اب علماء، فلاسفہ اور مناطقہ کو اپنی جولانی طبع دکھانے کا سنہری موقع نصیب ہوا۔ اور علمی خدمات کا سلسلہ آنے والے تمام بادشاہوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ انجام دیا۔ جیسا کہ ابن ندیم رقمطراز ہے:

فعل ذالک من بعدہ ابنہ	اردشیر کے بعد اس کے بیٹے سابور نے

سابور حتی نسخت تلک الکتب	اس کام کو انجام دیا حتیٰ کہ تمام کتابیں
کلھا بالفارسیۃ ..... ثم	فارسی زبان میں نقل کرلی گئیں، پھر
..... من بعدھا کسریٰ	ان دونوں کے بعد کسریٰ انوشیروان
انوشروان ابتہ کانت فی	نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کیونکہ وہ علم
العلم ومجتہ ؎	کو بام عروج پر پہنچانا چاہتا تھا اور
	اس سے بڑی الفت رکھتا تھا۔

سابور نے کتابوں کے نقل کرانے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک بہت بڑے ادارہ کو بھی قائم کیا جو مدرسۂ جندیسابور کے نام سے مشہور ہوا، اس کے اندر جس طرح بڑے بڑے اطباء ہر وقت موجود رہتے تھے اسی طرح بڑے بڑے منطقی بھی موجود تھے جو قدیم ایرانی منطق پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ غالباً دوسری قوموں کی منطق پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے، یا پھر "نصیبین" (جو منطق کا گہوارہ تھا) ہی میں کچھ ایسے علماء و فضلاء موجود تھے جنھوں نے دوسروں کی منطق کے نقل و ترجمہ کا کام انجام دیا ہو۔ کیونکہ ہمیں چند ایسی یونانی منطقی کتابوں کا پتہ ملتا ہے جو اسلام کی آمد سے بہت پہلے فارسی زبان میں منتقل کرلی گئی تھیں۔ جیسا کہ ابن ندیم کا بیان ہے:

وقد کانت الفرس نقلت فی القدیم	فارسیوں نے عہد قدیم ہی میں منطق اور
شیئاً من کتب المنطق والطب	طب کی بعض کتابوں کا فارسی زبان
الی اللغۃ الفارسیۃ ؎	میں ترجمہ کرلیا تھا۔

جب بہت سے حکماء پر عیسائی روم کی جانب سے عتاب ہوا تو انھوں نے بھاگ کر کسریٰ ہی کے دربار میں پناہ لی اور کسریٰ نے انھیں علمی کاموں میں لگا دیا، بہت کچھ ممکن ہو کہ انھیں کے واسطے سے یہ کتابیں بزبان فارسی نقل کرلی گئی ہوں۔ چنانچہ ڈاکٹر لیبان لکھتے ہیں ــــــ

"جس وقت نسطوری پادری، حکومتِ مشرقی سے نکالے گئے تو انھوں نے عراق عرب میں

مقام " اڈیسیا " پر ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ذریعہ علوم یونان کی اشاعت ایشیا میں ہونے لگی، جب " زینخا ایساری " (رومی شہنشاہ) نے اڈیسیا کو غارت کیا۔ اس وقت ان علماء کو ملوک ساسانیہ نے اپنے دربار میں بلالیا اور اس کے بعد ہی " جسٹینین نے (۵۲۹ء میں) اتھینس اور اسکندریہ کے مدارس کو بند کردیا تو یہاں کے اساتذہ ایران میں جمع ہو گئے، اور ان اساتذہ نے کتب یونان کو جن میں ارسطو اور جالینوس . . . . . کی تصنیفات شامل تھیں، سریانی اور کلدی وغیرہ مشرقی زبانوں میں جو اس وقت مروج تھیں، ترجمہ کیا۔ [۴۹]

بہرحال ایک طرف تو علوم منطق و فلسفہ اور طب کی توسیع کے لئے مدرسہ کھلوایا گیا اور بڑے بڑے علماء کی ایک ٹیم محض اس مقصد سے تیار کرلی گئی کہ وہ ان فنون کو عہد قدیم کی طرح اعلیٰ پیمانے پر دنیا کے سامنے پیش کریں اور دوسری طرف حفظ ماتقدم کے طور پر تمام قسم کے علوم کو ایک مضبوط قلعہ کے اندر محفوظ کردیا تاکہ اب سکندر کی طرح کوئی علوم ایران کو نہ مٹا سکے، چنانچہ ابن ندیم لکھتا ہے:

فلما وصلوا المستودع علومهم	(ہند، چین اور روم کے اندر) ان کے محفوظ
طلبوا لها من بقاع الارض اصحها	علوم، جب انھیں واپس مل گئے تو انھوں
تربة . . . . فجاؤا الی قهندز	نے ایک بہترین جگہ کو تلاش کیا، انھیں
هو فی داخل مدینة جی (من	" قہندز " سب سے اچھی جگہ ملی جو " اصفہان "
اصفهان) فاودعوا علومهم	کے مدینہ جی میں پڑتا ہے انھوں نے ہر قسم
وبقی الی زماننا هذا، وذالك	کے علمی سرمایہ کو یہیں محفوظ کردیا اور وہ ہمارے
انه لما كان قبل زماننا	زمانے (چوتھی صدی ہجری کے اواخر) تک
تهدمت من هذه المصنع ناحية	باقی رہا، پھر ہوا یہ کہ آج سے کچھ دنوں پہلے
فوجدوا فيه كتباً كثيرة	اس عمارت کا ایک گوشہ منہدم ہو گیا
من كتب الاوائل مكتوبة كلها	تو لوگوں کو پہلے لوگوں کے تمام قسم کے

فی لحاء التوز مودعة اصناف	علوم کی بہت سی کتابیں توز کے چھلکے
علوم الاوائل بالکتابة الفارسیة	پر قدیم فارسی زبان میں لکھ کر محفوظ
القدیمة ۔ ؎	کی ہوئی ملیں۔

اسی خزانے میں سے بعض کتابوں کے بارے میں اپنا عینی مشاہدہ دوسری جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

اثبت انا بالمشاھدة	میں نے چند پھٹی پرانی کتابوں کو دیکھا جو
کتبا منقطعة اصیبت باصفہان	اصفہان میں ملی تھیں اور یونانی زبان
..... وکانت بالیونانیة	میں تھیں، یوحنا وغیرہ جیسے مترجمین نے
فاستخرجھا اھل ھذا الشان	ان کا ترجمہ کر دیا ہے۔
مثل یوحنا وغیرہ ؎	

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اس دور میں ایران کے اندر یونانی علوم کو اچھا خاصا مقام حاصل ہو چکا تھا اور جس طرح ایرانی منطق کو پڑھا پڑھایا جاتا اور تقریر و تحریر کا موضوع بنایا جاتا تھا، اسی طرح یونانی منطق سے بھی استفادہ کیا جاتا تھا۔

"حران" کے صابی جو عوام ایران کے دلدادہ تھے، حرآن پر یونانی فلسفہ کی چھاپ پڑنے سے پہلے، انھوں نے خالص ایرانی منطق، فلسفہ، ہئیت اور طب وغیرہ کو بڑا فروغ دیا تھا، غالباً انھیں کی کوششوں کی بنا پر وہ ایرانی علمی سرمایہ ایک زمانے تک محفوظ رہا جس کی مدد سے "بوعلی سینا" اور پھر "شیخ الاشراق" نے "الحکمۃ المشرقیہ" اور "حکمۃ الاشراق" تیار کی۔

خصوصیت | اس دور میں منطق کو جس قدر بھی فروغ ہوا، غالباً شرحی اور تفسیری نقطہ نظر سے کوئی ایسا کام نہیں ہوا جو ہندوستانی منطق کی شرحوں اور یونانی منطق کی تفسیروں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت رکھتا ہو، چونکہ حوادثِ روزگار نے یہاں کی ساری علمی متاع کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس وجہ سے کوئی صحیح رائے ان کی منطقی ذہنیت کے سلسلے میں لگانا جوئے شیر

اسے کم نہیں، لیکن اس میں البتہ کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس دور کی ایرانی منطق زیادہ تر یونانی منطق سے متاثر ہونے لگی تھی، اور آخر کار مخلوط ہونے کے بعد وہ دن بھی اس پر گذرا جب یہ اپنا وجود کھو بیٹھی۔

حوالہ جات

۲۱۔ اخبار الحکماء صہ ۵

۲۲۔ الفہرست صہ ۱۷۴

۲۳۔ تاریخ ابن خلدون مع تعلیق شکیب ارسلان ج ۱ صہ ۲۸۵

۲۴۔ اخبار الحکماء ص ۲۳۲، ۲۳۳

۲۵۔ طبقات الاطباء ج ۲

۲۶۔ زبدۃ الصحائف صہ ۳۵

۲۷۔ الفہرست صہ ۲۵۶

۲۸۔ اخبار الحکماء صہ ۸۶

۲۹۔ تاریخ فلسفہ ص ۷۴، ۷۵، ۷۶

۳۰۔ زبدۃ الصحائف صہ ۳۸

۴۱۔ طبقات الاطباء ج ۱

۴۲۔ قرون وسطیٰ ... صہ ۱۰۴، ۱۰۵

۴۳۔ تاریخ ابن واضح یعقوبی ج ۲ صہ ۱۰۵ بحوالہ عرب ہند کے تعلقات صہ ۱۲۹

۴۴۔ جوز کی تحقیق کیلئے ملاحظہ ہو مقالات سید سلیمان ندوی ج ۱

۴۵۔ تاریخ سیرافی صہ ۱۲۷ بحوالہ عرب و ہند کے تعلقات صہ ۱۲۹

۴۶۔ کتاب الہند صہ ۴۸

۴۷۔ الفہرست صہ ۳۲۴

۴۸۔ " صہ ۳۲۷

۴۹۔ تمدن عرب (ترجمہ سید علی بلگرامی) صہ ۴۹۸

۵۰۔ الفہرست صہ ۳۲۵

۵۱۔ " صہ ۳۲۶

نوٹ :۔ حوالہ ۲۱ تا ۲۶ مارچ ۱۹۷۶ء کے ہیں جو درج ہونے سے رہ گئے تھے۔ حوالہ ۳۷ تا ۵۱ اس آخری قسط سے متعلق ہیں (منیجر)

۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔ تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اوّل، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید) مع ضمیمہ ترتیب جدید، بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے اور انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب اور [illegible]

۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط، امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اوّل۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط۔ اسلامی کتب خانے۔ عرب و [illegible]۔ تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں۔ معارف الآثار۔ نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ رو سرکشی ضلع بجنور۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اوّل

۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم۔ حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اوّل۔ تاریخی مقالات۔ لادینی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نو آبادیات

۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ [illegible]۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم۔ تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ [illegible]، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل، عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 APRIL 1976

Subs. Rs. 15-00 Per Copi Rs.1-50

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ [illegible] دہلی میں طبع کرا کر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ملا سے شائع کیا۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔ تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامان اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول 'نبی عربی صلعم'۔ صراط مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات) مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم 'خلافت راشدہ'۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظام حکومت۔ سلسلہ تاریخ ملت حصہ سوم 'خلافت بنی امیہ'

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم 'خلافت ہسپانیہ'۔ تاریخ ملت حصہ پنجم 'خلافت عباسیہ اول'

سنہ ۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل) تاریخ ملت حصہ ششم 'خلافت عباسیہ دوم' بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم 'تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ'۔ تدوین قرآن۔ اسلام کا نظام مساجد۔ اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم 'خلافت عثمانیہ'۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابت حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

جلد نمبر ۷۶ بابت ماہ جمادی الاول ۱۳۹۶ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۶ء شمارہ نمبر ۵

فہرست مضامین

نظرات

آہ! کیوں کر کہئے کہ علم و فضل اور تحقیق و تدقیق کی ایک اور شمع روشن گذشتہ ماہ اپریل کی ۲۹ر تاریخ کو گل ہوگئی یعنی مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری نے اپنے وطن میں وفات پائی، مولانا کا سلسلۂ نسب بیس (۲۰) واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے، ساتویں پشت میں آپ کے جدِ امجد سید ابو اسحٰق ابراہیم عہدِ شاہجہانی میں بغداد سے ہندوستان آئے اور اورنگ آباد میں مقیم ہوگئے، حضرت مفتی صاحب ۱۳۰۰ہجری میں شاہجہانپور کے محلہ کاکا خیل میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وطن میں پائی، مفتی کفایت اللہ صاحب کے مدرسۂ امینیہ دہلی میں درسیات کی تکمیل کی پھر دیوبند جاکر حضرت شیخ الہندؒ سے صحیح بخاری اور ترمذی کا درس لیا، اگرچہ بیعت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے تھے لیکن خلافت و اجازت حضرت کے خلیفۂ مجاز مولانا شیخ شفیع الدین مہاجر مکیؒ سے لی، کم و بیش تیس برس راندیر ضلع سورت میں مقیم رہ کر درس و افتا کی خدمات انجام دیں، پھر صدر مفتی کے عہدہ پر دیوبند چلے آئے، تقریباً اٹھارہ برس کے بعد مسلسل بیماری اور ضعیفی کے باعث وطن چلے گئے، یہاں آخر دم تک صاحبِ فراش ہونے کے باوجود افتا اور مطالعۂ کتب کا مشغلہ برابر جاری رہا۔ حدیث اور فقہ مولانا کے خاص فن تھے، چھوٹی بڑی متعدد کتابیں تصنیف کیں، لیکن علمی تحقیق و تدقیق، دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کا شاہکار یہ کتابیں ہیں: (۱) امام محمد کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ کی تحقیق و ترتیب اور اُس پر تعلیقات و حواشی، پوری کتاب

چار جلدوں میں ہے، لیکن حیدر آباد سے دو جلدیں شائع ہوئی ہیں، (۲) امام محمد کی کتاب الآثار کی شرح تین ضخیم جلدوں میں یہ بھی حیدر آباد سے شائع ہوئی ہیں، (۳) موطا امام محمد کی شرح، (۴) علامہ ابن حزم کی کتاب المحلی پر تنقید جو غالباً مکمل نہیں ہوئی، علمی اور تحقیقی کمالات کے ساتھ شعر و ادب کا ذوق بھی بڑا شگفتہ تھا، عربی اور اُردو دونوں میں قادر الکلام شاعر تھے ورع و تقویٰ اور اخلاق و شمائل میں سلف صالحین کا نمونہ، نہایت شگفتہ طبع، خندہ جبیں، متواضع اور منکسر المزاج تھے، اَعْلَی اللّٰہُ مَقَامَہٗ وَبَرَّدَ مَضْجَعَہٗ۔

افسوس ہے انھیں دنوں ہمارے فاضل اور لائق دوست جناب محمد یوسف صاحب صدیقی بھی ہم سے جدا ہو گئے، مرحوم انگریزی اخبار ریڈینس (اب ممنوع) کے اڈیٹر تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے، انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر کی قدرت تھی، بڑے ہوش و گوش اور سمجھ بوجھ کے انسان تھے، صبر و استقلال اور خلوص اُن کا شعار تھا، مجلس مشاورت کے جنرل سکریٹری تھے، جماعت اسلامی (اب ممنوع) کے ہائی کمانڈ میں شامل ہونے کے باعث متعدد بار قید و بند کی تکالیف سے دو چار ہوئے، لیکن پائے استقامت میں کبھی جنبش پیدا نہیں ہوئی، جو وقت پڑا اسے ہنسی خوشی انگیز کر لیا، ریڈینس کے اڈیٹر کی حیثیت سے عرب ملکوں اور خصوصاً سعودیہ عرب میں اُن کا بڑا وقار اور اعتبار تھا چنانچہ وہاں کی متعدد کانفرنسوں میں مدعو کی حیثیت سے شریک ہوئے گھر کے بہت خوش حال اور صاحب املاک و جائداد تھے، حرماشی کے تگ بھگ ہوگی، اس کے باوجود گھر کا عیش و آرام چھوڑ

کر جماعتی کاز کی خاطر دلی میں غربت اور بے آرامی کی زندگی بسر کرتے رہے اپنے وطن ٹونک میں تھے کہ وہاں سے بیوی کے ڈاکٹری معائنہ کی غرض سے جے پور آئے ابھی ڈاکٹری معائنہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ خود انھیں پیغامِ اجل آپہنچا، بڑی خوبیوں کے نہایت شریف اور با وضع انسان تھے، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْہ:۔

ابھی ۲ رمئی کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں مولانا حامد الانصاری غازی ناظمِ اجلاس جشن کی رپورٹ سے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ ملک کے ہر گوشہ میں یک صد وسیزدہ جشن دارالعلوم کا پرتپاک خیر مقدم ہورہا ہے اور بڑے بڑے اربابِ ثروت و دولت اُس کے لئے اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں، ۲۴ راپریل کو جناب صدر جمہوریہ جب دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے تو انھوں نے بھی دارالعلوم دیوبند کے عظیم تعلیمی اور علمی و دینی کارناموں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوکر اُتر پردیش کی حکومت کو (گورنر اور چیف منسٹر اس موقع پر موجود تھے) حکم دیا کہ جشن کے سلسلہ میں انتظامی اعتبار سے دارالعلوم کو جو سہولتیں درکار ہوں وہ فراہم کی جائیں، چنانچہ اُسی وقت سے حکومت اُتر پردیش اور دارالعلوم میں ربط قایم ہے اور کام آگے بڑھ رہا ہے۔

جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب اگرچہ مارچ میں سیرت کانفرنس پاکستان میں ایک ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے گئے تھے، لیکن یہ صرف ایک برس میں تیسری مرتبہ پاکستان کا ویزا حاصل کرنے کا بہانہ تھا چنانچہ

کانفرنس میں آپ کی شرکت برائے نام ہی رہی ، اصل مقصد جشن دارالعلوم کے سلسلہ میں پاکستان کا دورہ کرنا تھا، پاکستان کے چپہ چپہ پر دیوبند کے علماء اور فضلاء پھیلے ہوئے ہیں اور اللہ کے فضل وکرم سے پاکستانی مسلمانوں کی عظیم اکثریت بھی مسلک اور فکر کے اعتبار سے دیوبندی ہے اس بنار پر مولانا کا یہ دورہ بہت کامیاب رہا ، وہاں کراچی ، لاہور اور پشاور میں تین کمیٹیاں بن گئی ہیں جو مولانا کے مرتب کئے ہوئے پروگرام کے مطابق جشن کے لئے کام کریں گی ، اس سلسلہ میں آپ حکومت کے ارکان سے بھی ملے اور اُن سے وعدہ لیا کہ جشن میں شرکت کے لئے جانے والے پاکستانیوں کو پاسپورٹ حاصل کرنے میں سہولت دی جائے گی ۔

پاکستان کے مجلات و رسائل خاص نمبروں کے لئے مشہور ہیں، عجیب اتفاق ہے کہ انھیں دنوں میں لاہور کے ماہنامہ الرشید نے اپنا باریک کتابت کا آٹھ سو صفحات کا دارالعلوم دیوبند نمبر جس کا غلغلہ مہینوں سے برپا تھا بڑے اہتمام و انتظام سے شائع کر دیا اور حضرت مہتمم صاحب کے ہاتھوں اس کا اجرا عمل میں آیا برہان میں اس نمبر پر باضابطہ تبصرہ تو عنقریب ہوگا اس موقع پر یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ نمبر بڑی محنت اور خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے اور انڈو پاک کے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے تاریخی لٹریچر میں بڑا اہم اور قابلِ قدر اضافہ ہے ۔

حدیث کا درایتی معیار

(داخلی فہم حدیث)

۱۰

ایمان بالرسل

(۴) ختمِ نبوّت

مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظمِ دینیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

ختمِ نبوت نورانی دنیا سے یہ فیض (علم وادراک) جوہر انسانیت کی تربیت و پرورش کے لئے تھا جس کے قویٰ و خواص ابتداءً خام حالت میں تھے (جس طرح سونا کان سے نکلکر خام حالت میں ہوتا ہے) پھر بتدریج اس علم وادراک کے ذریعہ ان میں پختگی و توانائی آتی رہی اور جب اس جوہر کی صلاحیت "مطلوبہ سرفرازیوں" کے لئے اُبھر آئی تو فیض رسانی کے سلسلہ کو بند کر دیا گیا کیوں کہ اگر اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا تو انسان نورانی دنیا کی فیض رسانی پر اعتماد و بھروسہ کرکے مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی جد و جہد میں نہ مصروف ہوتا اور تعمیر و ترقی کی وہ نوع نہ وجود میں آتی جو سلسلہ ختم ہونے کے بعد

وجود میں آتی جیسا کہ ختم نبوت سے قبل ہر اہم کام کے لئے رسول اور نبی کا انتظار قوموں کے حالات و واقعات سے ثابت ہے۔

تاریخ انسانی کے دو بڑے حصے | اس طرح جوہر انسانیت کی خامی و پختگی کے لحاظ سے تاریخ انسانی دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔

(۱) قبل ختم نبوت اور

(۲) بعد ختم نبوت

قبل ختم نبوت | قبل ختم نبوت میں جوہر انسانیت کی خامی بتدریج دور کی جارہی تھی اس لئے ہر قوم و گروہ میں رسول و نبی آتے رہنا ناگزیر تھا اور اُن میں کسی بھی تعلیم کو بقاء و استحکام نہ حاصل ہونا لازمی تھا اگر پختگی سے پہلے رسول و نبی کا سلسلہ بند کر دیا جاتا یا ان میں کسی کی تعلیم کو بقاء و دوام کی سعادت حاصل ہوتی تو جوہر انسانیت کو پختگی نہ میسر آتی اور موجودہ خامی کو استقرار و جماؤ حاصل ہو جاتا پھر خلافت و نیابت کا وہ تصور نہ اُبھرنے پاتا جو ختم نبوت کے بعد اُبھرا۔

بعد ختم نبوت | بعد ختم نبوت میں خامی دور کرنے کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا اب پختگی و توانائی کے بعد صلاحیتوں کی "ضابطہ بندی" کا مرحلہ تھا جس کے لئے مختلف رسولوں اور نبیوں کا آتے رہنا یا تعلیمات میں ردو بدل کرتے رہنا دونوں سخت مضر تھے اس بنا پر صلاحیتوں کی "ضابطہ بندی" کے لئے ایک رسولؐ اور اس کی تعلیم کو جامع و کامل بنا کر بقاء و دوام کی سعادت سے نوازا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوہر انسانیت میں نورانی و حیوانی بنیادوں کے درمیان تجاذبی قوت کی ایک حد مقرر ہے جو دونوں کی طبعی خصوصیات پر مبنی ہے پختگی کے بعد اس حد میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ خلافت و نیابت کی صلاحیتوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا جس طرح لوہے کے ٹکڑے میں خارجی مقناطیسی میدان کے ذریعہ لوہائی مقناطیسیت پیدا کرنے میں ایک حد ایسی آتی ہے کہ پیدا شدہ مقناطیسیت میں مزید اضافہ نہیں کیا جا سکتا

خواہ خارجی مقناطیسی میدان میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ کر دیا جائے۔ ختم نبوت پر جو علم و ادراک دیا گیا وہ اس حد کے لحاظ سے نہایت جامع و کامل ہے کہ حد کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے اس پر مزید اضافہ کی گنجائش نہیں ہے اور "حد" کو بدل دینے میں خلافت و نیابت کا نظام درہم برہم ہوتا ہے اس لئے رسالت و نبوت کو ختم کر دیا گیا اور علم و ادراک کا سلسلہ روک دیا گیا۔

ختم نبوت سے متعلق یہ آیت ہے۔

ختم نبوت سے متعلق آیتیں	مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا[۱]	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے

عربی لغت و محاورے میں ختم کے معنی بند کرنے، مہر لگانے، ختم کر دینے اور کام سے فارغ ہو جانے کے ہیں مثلاً

ختم الاناء	برتن کا منہ بند کر دیا۔
ختم الکتاب	خط پر مہر لگا دی۔
ختم علی القلب	دل پر مہر لگا دی۔
ختم الشیء (بلغ آخرہ)	شی کے آخر تک پہنچ گیا۔
خاتم القوم (آخرھم)	قوم کا آخری آدمی
ختم العمل (فرغ من العمل)	کام سے فارغ ہو گیا۔

عربی زبان کی ہر مستند لغت میں ختم اور خاتم کے یہی معنی ہیں[۲] پھر جو ہر انسانیت میں تجاذبی قوت کی مقررہ حد لوگوں کو معلوم نہ تھی اس لئے "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" کے ذریعہ ہر قسم کے شکوک و شبہات کو ختم کر دیا گیا کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے اور ختم نبوت کے وقت کو بھی وہی جانتا ہے کہ کب اس کا وقت ہے؟

ختم نبوت جس رسول پر ہوا وہ روئے زمین کے تمام انسانوں کا رسول ہے ہر قوم و ہر گروہ کے لئے علیحدہ رسول و نبی کی ضرورت نہیں رہی قرآن حکیم میں ہے۔

---

[۱] الاحزاب ع ۵ [۲] اقرب الموارد۔ لسان العرب اور قاموس وغیرہ۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سبا ع ۳)

ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے خوشی اور ڈر سنانے والا رسول بنا کر بھیجا لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت سے) واقف نہیں ہیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الاعراف ع ۲۰)

آپ کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جس کے لئے آسمان و زمین کا ملک ہے۔

معنویت حاصل کرنے والی حدیثیں | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف آیتوں سے معنویت حاصل کرکے فرمایا

کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء[1]

بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کرتے تھے جب کسی نبی کا وصال ہوجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے۔

ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین[2]

میری اور مجھ سے پہلے گذرے ہوتے نبیوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی مگر ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد چکر لگا کر دیکھتے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے ہوتے کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں

اس مضمون کی کئی حدیثیں مسلم میں بھی ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ ہیں

---

[1] بخاری ج ا کتاب المناقب باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

[2] بخاری ج ا کتاب المناقب باب خاتم النبیین۔

فجئت فختمت الانبیاء[1] — پس میں آیا اور میں نے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا۔

ایک حدیث میں فرمایا

ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی[2] — رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

کان کل نبی یبعث الی قومہ خاصة — ہر خاص نبی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں

وبعثت الی کل احمر واسود[3] — ہر سیاہ و سرخ کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

ارسلت الی الخلق کافة وختم بی النبیون[3] — میں تمام مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہوں اور میرے اوپر نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

ختم نبوت کا علم و ادراک | ختم نبوت پر جو علم و ادراک دیا گیا وہ مقررہ حد پر پہنچنے کے بعد ہے اس بناء پر صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کے لحاظ سے کامل و مکمل ہے اب اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔ قرآنِ حکیم میں ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (الانعام ع ۱۴) — آپ کے رب کی سچائی اور انصاف کی باتیں کامل ہو گئیں اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ ع ۱) — آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے لئے اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

[1] مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب خاتم النبیین۔

[2] مسند احمد بن حنبل عن انس بن مالک و ترمذی کتاب الرؤیا باب ذہاب النبوة

[3] مسلم ج ۱ کتاب المساجد و مواضع الصلوٰة

فضلت علی الانبیآء بست اعطیت جوامع الکلم[۱] الخ

میں نبیوں پر چھ چیزوں میں فضیلت دیا گیا ہوں ان میں ایک یہ ہے کہ "جوامع الکلم مجھے عطا ہوا۔

دوسری روایت میں ہے

بعثت بجوامع الکلم[۲]

میں "جوامع الکلم" کے ساتھ بھیجا گیا ہوں

"جوامع الکلم" سے مراد آسان و مختصر الفاظ جن میں کثیر معانی پائے جائیں[۳] ابن قیم کہتے ہیں

جوامع الکلم ھی الالفاظ الکلیۃ العامۃ المتناولۃ لافرادھا[۴]

جوامع الکلم وہ عام کلی الفاظ جو اپنے تمام افراد کو شامل ہوں۔

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علم فواتح الخیر وجوامعہ او جوامع الخیر وفواتحہ[۵]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امور خیر کے فواتح (سرچشمے) اور امور خیر کے جوامع (مجموعے) کی تعلیم دی گئی۔

علم و ادراک پر رسول اللہؐ کی شہادت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس علم و ادراک پر "شاہد" بنا کر بھیجا گیا

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا[۶]

اے نبیؐ ہم نے آپ کو بھیجا گواہ بنا کر بشارت دینے والا ڈرانے والا اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

۱و۲ مسلم ج ا کتاب المساجد و مواضع الصلوٰة۔

۳ نووی شرح مسلم حوالہ بالا

۴ ابن قیم - اعلام الموقعین ج ا تفسیر جوامع الکلم

۵ مسند احمد بن حنبل ج ا صفحہ ۴۳۷ عن عبداللہ بن مسعود۔

۶ الاحزاب ع ۶

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام شہادت پر کھڑا کر دینا اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے یہ شہادت فہم وادراک سے قول وعمل سے دنیا وآخرت میں ہر جگہ مراد ہے چنانچہ نماز کے بعد آپ فرمایا کرتے تھے

انا شہید انت الرب وحدك لا شريك لك انا شہید ان محمدا عبدك ورسولك انا شهيد ان العباد كلهم اخوة[1]	میں گواہ ہوں کہ تو رب ہے تنہا ہے تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ میں گواہ ہوں کہ محمدؐ تیرا بندہ اور تیرا رسول ہے۔ میں گواہ ہوں کہ سب بندے بھائی بھائی ہیں۔

آخرت کے بارے میں ہے۔

انی فرط لکم وانا شہید علیکم[2]	میں تم سے پہلے جانے والا ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں۔

اسی شہادت کی بنا پر حدیث میں ہے۔

فمن اطاع محمدا صلی اللہ علیہ وسلم فقد اطاع اللہ ومن عصی محمدا فقد عصی اللہ ومحمد فرق بین الناس[3]	جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں

شاہد علی الشاہد کی حیثیت | اس "شہادت" کو جن لوگوں نے اپنی زندگی میں رچایا اور بسایا ان کو بھی "شاہد" بنایا گیا جن کی حیثیت "شاہد علی الشاہد" کی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا — تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور "تم" لوگوں پر گواہ

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۶۹ عن زید بن ارقم

[2] بخاری ج ۲ کتاب الزمان باب ما یحذر من زہرۃ الدنیا الخ

[3] بخاری ج ۲ کتاب الاعتصام باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الحج ع ۱۰) ہو۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ع ۱۷)

اسی طرح ہم نے تم کو معتدل اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اس "شاہد" کو جس قدر فضیلت و برتری حاصل ہے وہ "مقام شہادت" کی بنا پر ہے جیساکہ فرشتوں نے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا۔

فقالوا ان لصاحبکم ھذا مثلا فاضربوا له مثلا فقالوا مثله کمثل رجل بنی دارا وجعل فیھا مأدبة وبعث داعیا فمن اجاب الداعی دخل الدار واکل من المأدبة ومن لم یجب الداعی لم یدخل الدار ولم یأکل من المأدبة فقالوا الدار الجنة والداعی محمد[1]

فرشتوں نے کہا کہ تمھارے اس صاحب (رسولؐ) کی ایک مثال ہے اس کو بیان کرو وہ مثال یہ ہے کہ کسی نے گھر بنایا اور اس میں دسترخوان چنا اور کھانے کے لئے بلانے والے کو بھیجا جس نے داعی کی بات قبول کی وہ گھر میں داخل ہوا اور دسترخوان سے کھایا اور جس نے نہیں قبول کیا نہ وہ گھر میں داخل ہوا اور نہ دسترخوان سے کھایا کہا انھوں نے کہ دار سے مراد جنت ہے اور داعی سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

دوسری جگہ ہے

انتم تتمون سبعین امة انتم خیرھا واکرمھا علی اللہ تعالیٰ[2]

تم ستر بڑی امتوں کے تمام کرنے والے ہو اللہ کے نزدیک تم ان میں سب سے بہتر اور معزز ہو۔

علم و ادراک میں درک و بصیرت کا حکم

مقام شہادت ہی کی بنا پر اس علم و ادراک میں درک و بصیرت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا کہ اس کے بغیر فرائض کی ادائیگی کی کوئی شکل نہیں ہے

---

[1] بخاری ج ۲ کتاب الاعتصام باب الاقتداء بسنن رسول اللہؐ۔

[2] ترمذی و مشکوٰۃ باب ثواب ہذہ الامۃ۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (التوبہ ع ۱۵)

کیوں ایسا نہ کیا گیا کہ مومنوں کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی جو دین میں تفقہ حاصل کرتی اور جب وہ اپنے گروہ میں واپس جاتی تو لوگوں کو (جہل و غفلت کے نتائج سے) ہوشیار کرتی تاکہ لوگ برائیوں سے بچیں۔

تفقہ فی الدین (دین میں فہم و بصیرت) کے لئے رسمی علم کافی نہیں ہے بلکہ وہ فہم و فراست درکار ہے جو عقل و قلب دونوں کے آمیزہ سے تیار ہوتی ہے[1]۔ اس کے بغیر مذکورہ علم و ادراک کے لئے مقام شہادت نہیں حاصل ہو سکتا۔ دین میں تفقہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جو ہر کسی کو نہیں حاصل ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی[2]

جس شخص کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین میں تفقہ (بصیرت) عطا فرماتا ہے میں (علم کو) تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ (سمجھ) دیتا ہے۔

ایک موقع پر رسول اللہ نے صحابہ کرام کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

ان رجالاً یأتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیراً[3]

لوگ تمھارے پاس مختلف اطراف سے دین میں تفقہ حاصل کرنے کے لئے آئیں گے جب وہ آئیں تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کر دیہ میری وصیت ہے

علماء انبیاء کے وارث: مقام شہادت ہی کی بنا پر رسول اللہ نے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا اور عالم کی عابد پر فضیلت بیان فرمائی۔

ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے۔ جیسے

---

[1] امینی ۔ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ فقہ کی حقیقت

[2][3] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ کتاب العلم۔

ليلة البدر على سائر الكواكب وان العلماء ورثة الانبياء وان الانبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما وانما ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر

چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں انبیاء دینار اور درہم کے وارث نہیں بناتے وہ علم کے وارث بناتے ہیں جس نے علم حاصل کیا اس نے بڑا حصہ پالیا۔

دوسری جگہ ہے۔

فضل العالم على العابد كفضلي على ادناكم

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں ادنیٰ شخص پر ہے۔

وارث بنانے کا مقصد | انبیاء کی وراثت یا شہادت مذکورہ علم و ادراک کی صرف ترجمانی سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کے لئے ہر دور و زمانہ میں وہ تعبیر و تشریح اور اخذ و استنباط کی صلاحیت درکار ہے کہ جس کے ذریعہ نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کا رشتہ علم و ادراک سے منقطع نہ ہونے پائے۔ یہ زندگی اور معاشرہ جوہر انسانیت کی انھیں صلاحیتوں سے وجود میں آئے گا جن کی پختگی کے بعد علم و ادراک آیا ہے۔ اس بناء پر زندگی اور معاشرہ کی ترقی سے جس قدر نئی جزئیات پیدا ہوں گی وہ سب علم و ادراک کے اصول و کلیات میں موجود ہیں صرف ان سے اخذ و استنباط کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دے کر گویا یہ ظاہر فرمایا کہ نبوت اگرچہ ختم ہوگئی لیکن کار نبوت ہمیشہ جاری رہے گا اور ہر دور و زمانہ میں علم و ادراک کی تعبیر و تشریح اور اس سے اخذ و استنباط کا سلسلہ جاری رہے گا اگر اس سلسلہ کو بند کیا گیا تو ختم نبوت پر حرف آئے گا اور کار نبوت نہ جاری رہ سکے گا جب کہ اس کا جاری رہنا ختم نبوت کا مقصود و مطلوب ہے۔

(باقی آئندہ)

مقصودِ تخلیقِ کائنات

جناب غلام نبی صاحب مسلم لاہور

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ

اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ نے چاہا کہ اُس کی ذاتِ خداوندی کا ظہور ہو، اور اسے پہچانا جائے پس اُس کی مشیت نے کُن کی حسین وجمیل صورت اختیار کی تو پھر آنِ واحد میں فیکون کا حیرت انگیز عمل جاری ہوگیا، خلا کے کسی حصے میں رحمانی کرنیں (اشعۂ رحمانیہ) پھوٹ پڑیں، اور ارض وسما کی محفل جم گئی، سورج، چاند اور ستاروں کے انوار فضا میں بکھر گئے اور کہکشاں کی مانگ روپہلی افشاں سے بھر گئی، سطحِ ارضی کے آئینہ میں انوار سماوی کا عکس رقص کرنے لگا، حتیٰ کہ پانی کے حیات بخش قطرے نے سطحِ زمین پر آندھیوں اور طوفانوں کو سکون بخشا، پہنائے زمین کو بادلوں نے ڈھانپ لیا۔ نسیمِ سحری کے جھونکے، پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیوں، چٹانوں اور ریت کے ٹیلوں سے اٹھکیلیاں کرنے لگے اور آن کی آن میں زمین کی دسعتیں چشموں، ندیوں، نالوں اور دریاؤں سے ہم آغوش ہوگئیں، اور یہ آبِ حیات اپنی رعنائیوں کے ساتھ بلندیوں پر تیخ اور گہرائیوں میں سمندروں کی صورت میں ڈھل گیا۔

جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ

پانی کے فیض سے سمندر کی تہ اور سینہ صحرا میں زندگی نے کروٹ لی، زمین کا سینہ شق ہوا، حیات نے انگڑائی لی اور کرنوں کی آغوش میں حرکت واہتزاز کا ظہور ہوا بلندیوں

اور بستیوں کی آغوش میں سبزہ لہلہانے لگا، پہاڑوں اور صحراؤں کے دامن رنگ رنگ کے فردوس نگاہ، خوشنما پھولوں سے بھر گئے۔ جن کی مہک نے کائناتِ ارضی کو ڈھانپ لیا، گوناگوں پھلوں نے شاخوں کو زیر بارِ احسان کر دیا اور وہ فرطِ تشکر و امتنان سے جھک کر زمین کو چومنے لگیں بادِ سحر کے خنک جھونکے انھیں سہلانے اور پیار کرنے لگے، چاند نے ان کے سینے میں رس گھولا تو آفتاب نے ان پر سنہری کرنوں کا غازہ مل دیا اور عالمِ نباتات کا ہر پتا، پھول اور پھل کسی قدر شناس کی راہ تکنے لگا۔

پانی اور نباتات کے امتزاج سے حیات نے نئی زندگی پائی، اور وہ جہانِ آب و گِل سے آزاد ہو کر ہلنے، سرکنے، چلنے اور دوڑنے لگی، حیات کو احساس نمو نے متحرک کر دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے رینگنے والے حشرات الارض، ہزار پایوں، چوپایوں اور دوپایوں نے زمین کے چپے چپے کو ڈھانپ لیا، فضائیں، طاؤس، کوئل، پپیہوں کے فردوس گوش نغموں سے گونج اٹھیں، غزالوں کی چھلانگیں، چرندوں کی کلیلیں، حسینانِ صحرا کی اچھل کود، پرندوں کی اڑانیں اور مرغانِ فضا کے ترانے کسی خلاصۂ کائنات کی آمد آمد کا اعلان کرنے لگے۔

آخر وہ ساعت آ پہنچی، جس کے انتظار میں کارکنانِ قضا و قدر، عروسِ کائنات کی زینت و آرائش میں مدتوں سے سرگرم کار تھے، جس کے استقبال کے لئے ارض و سما کی بزم آرائی کی گئی تھی، جس کے لئے روحِ کائنات چشم براہ تھی، اچانک خالقِ کائنات کے پُر جلال و پُر ہیبت الفاظ فضا میں گونجے۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ میں نے آدم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تمھارا فرض ہے کہ اس کے سامنے سجدے میں گر جاؤ اور اپنے تمام خزانے اس کے سامنے ڈھیر کر دو، ارض و سما، کوہ و صحرا، بحر و بر، چرند و پرند، شجر و حجر ۔۔ کائنات کی ہر شے نے ارشاد الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا، اور ایک عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے کائنات آدم کی مطیع و منقاد ہو گئی اور مسخر لکم ما فی السماوات والارض کے اثرات مرتب ہونے لگے۔

تخلیق و تقویم آدم | اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کر کے فرمایا "میں زمین میں آدم کو خلیفہ مقرر کرنے

تھا ہوں، میں نے اس میں اپنی روح پھونکی ہے اسے مخلوقات میں بزرگی عطا کی ہے، اسے احسن تقویم پر تخلیق کیا ہے، اسے علم، غور و فکر، ارادہ، تدبر و تعقل اور ارتقائی صلاحیتوں سے نوازا ہے، اس کے وجود سے میری صفات کا ظہور مقدر ہے، پس کسی وسوسہ کا شکار ہوتے بغیر، بلا چوں و چرا اس کی خدمت میں لگ جاؤ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، تمھاری نظر محدود ہے، اور تم ان عظمتوں اور رفعتوں سے بے خبر ہو، جہاں تک یہ پیکر آب و گل پہنچنے والا ہے۔

فرشتے، جن، حیوانات، نباتات اور جمادات نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ کے اسرار و غوامض سے بے خبر تھے، اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے حسن سے نا واقف، وہ غور و فکر، سوچ بچار، دور بینی اور ارتقا کی وسعتوں سے نا آشنا تھے۔ ان میں اپنے خالق کی محبت میں فنا ہو کر اُس سے وصال کی صلاحیت تھی نہ تڑپ، انھیں معلوم نہ تھا کہ اس مشتِ خاک کی فطرت میں وہ استعدادیں رکھ دی گئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی ہدایت کی اتباع سے وہ ان رفعتوں سے گذر جائے گا جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں، جہاں دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کے مقام کا اندازہ سرحدِ فکر و ادراک سے بالاتر ہے۔ فرشتوں کی حدِ نگاہ تخلیقِ آدم کے عناصر کے سطحی علم اور محدود تجربے کے پیشِ نظر یُفْسِدُ فِی الْاَرْضِ اور یَسْفِكُ الدِّمَآءَ تک رہی اور وہ خَلَقَ سے گذر کر فَسَوّٰی وَقَدَّرَ فَهَدٰی کے اسرار تک نہ پہنچ سکے، وہ آدم کے تعلق باللہ اور ان ارتقائی مناظر کا احاطہ نہ کر سکے جو پردۂ مستقبل میں خوابیدہ و پوشیدہ تھے۔ انھوں نے آدم کو ایک بیج کی صورت میں دیکھا تھا، لیکن اس بیج میں پوشیدہ تناور درخت، اُس کی وسیع و عریض شاخیں، نظر فریب پتّے، حسین و جمیل پھول، روح افزا پھل اور جانفزا شمیم ـــــ تمام صلاحیتیں اور استعدادیں ان کے علم سے باہر تھیں، اس لئے وہ اس شاہکارِ قدرت کے خداداد علم، تدبر اور تخلیقی قوتوں کا اندازہ نہ کر سکے۔

<u>خلافتِ آدم</u> | اللہ تعالیٰ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے، اس نے ہر شے کو فطرت عطا کر رکھی ہے۔ ہر شے کی تخلیق میں اُس کا دائرۂ کار اور تخریب و تعمیر کے عناصر موجود ہیں، چیونٹی سے

ہاتھی تک، بیج سے لے کر فلک بوس اشجار تک تمام اپنی فطرت کی حدود میں مصروفِ عمل ہیں انسان بھی فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کی غیر مرئی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُسے خلق کیا اسے احسن و متناسب قویٰ (فسوّٰی) اور استعدادیں مرحمت فرمائیں، پھر قَدَّرَ کے الفاظ میں اُس کی صلاحیتوں کے تزکیہ اور نشوونما کی حدود متعین کر دیں، کہ جہاں اُس میں جسمانی، ذہنی، علمی، اخلاقی اور روحانی ترقی و بالیدگی کی فطرت رکھی، وہاں ان کی ایک حد بھی مقرر کر دی جس کی حسین جبر و آزادی سے وہ باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ ایک نطفہ سے بچہ اور بچہ سے تنومند جوان تو بن سکتا ہے لیکن اس کا جسم کسی بھی تدبیر سے میلوں لمبا اور گزوں چوڑا نہیں ہو سکتا (لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا)، اسی طرح اُس کی قوتِ برداشت، قوتِ فکر، بصارت اور بصیرت ترقی پذیر ہو سکتی ہے، لیکن ایک حد تک، اس سے آگے نہیں، اُس کی عمر ایک حد تک لمبی ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں، پھر ایک ایسا وقت بھی آکر رہتا ہے کہ وہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے اور اس سے اُسے جائے فرار نہیں، البتہ اُس کی تخلیق میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی پہنائی اور گہرائی تو حاصل نہیں کر سکتا، تاہم ان رفعتوں اور وسعتوں پر تصرف پا لیتا ہے، وہ مخلوق ہے مگر خالق کی معرفت اور اسرار تک رسائی کی استعداد رکھتا ہے، وہ کائنات میں ایک ذرہ کی سی حیثیت رکھتا ہے، لیکن کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی نظر و قوت کی زد میں ہے اور اُس نے ایک ذرہ کی توانائی پر غلبہ پا کر تسخیرِ عالم کی راہ ہموار کر لی ہے۔

البتہ اس کی فطری و طبعی استعدادیں اپنی نشوونما اور تزکیہ کے لئے قدم قدم پر صحیح رہنمائی اور ہدایت کی محتاج ہیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اسے متناسب اعضا اور استعدادیں بخشیں ان استعدادوں کی نشوونما کے لئے ایک تقدیر یعنی اندازہ مقرر کر دیا ہے، ان استعدادوں کی نشوونما کے لئے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے (فھدیٰ) کامل ہدایت کا

یہی ہے ساماں کر دیا اس ہدایت پر کما حقہ عمل کرنے سے انسان کی تمام استعدادیں کامل نشو و نما پاکر مقصدِ تخلیق کی تکمیل کرتی ہیں، اور انھیں نظر انداز کر کے ان استعدادوں کو مٹی میں ملا دیا جاتا ہے، نفسِ انسانی کے احسنِ تقویم پر ہونے اور اپنی استعدادوں کی تکمیل یا تخریب کی طرف رہنمائی اور نشو و نما کا ان آیات میں صاف اشارہ ملتا ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ انسانی نفس کو ہم نے کیا ہی اعتدال پر بنایا ہے، پس ہم نے اسے ہلاکت اور نشو و نما ہر دو کے اصول کی تعلیم دے دی ہے، پس جس نے اس کی نشو و نما کی وہ کامیاب ہو گیا، اور جس نے اسے دبائے رکھا وہ برباد ہو گیا (الشمس) اور تکمیلِ فطرت کے لئے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا کے الفاظ میں دینِ فطرت اسلام کی کامل بے لوث اطاعت کا ابدی پیغام دے دیا۔

جس وقت انسان کو زمین میں منصبِ خلافت بخشا گیا، وہ تمام فطری استعدادوں کا مرقع تھا، اس میں زندگی کی تمام امنگیں، آرزوئیں، اشتہائیں موجود تھیں، اس میں زندہ رہنے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی تڑپ تھی، وہ کائنات کی تمام نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا متمنی اور آرزومند تھا، اس کے ماحول میں وہ تمام نعمتیں موجود تھیں، جو اس کی صلاحیتوں کو نشو و نما دے سکتی تھیں اسے ان نعمتوں سے آگاہ کر دیا گیا، یہ تمام نعمتیں اس کی رسائی میں تھیں، لیکن وہ ان کی موجودگی کے باوجود ان سے کام لینے سے ناآشنا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کی خلافت کا ارادہ فرمایا تو فرشتوں نے اُس کے ظاہری تخلیقی عناصر کو سامنے رکھ کر عرض کی، "اے پروردگارِ عالم! کیا تو ایسی ہستی کو خلافت سونپ رہا ہے، جو امنِ عالم کو درہم برہم کر دے گی اور خون بہائے گی" لیکن جوں ہی انھیں آدم کی علمی، فکری اور تخلیقی استعدادوں کا ہلکا سا احساس دلایا گیا، تو انھوں نے آدم کی خلافت کو تسلیم کر لیا، اور اس کی معاونت پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

فرشتوں کو اپنی عظمت کا دعویٰ نہ تھا، لیکن شیطان کو اس بات کا غرور تھا کہ میں آگ سے تخلیق کیا گیا ہوں، جس کا عظیم مظہر سورج ہے، جس کے فیضان سے دنیا میں روشنی اور گرمی ہے۔

ہوائیں، بادل، بارش، روئیدگی اور پھل پھول اسی کے مرہونِ احسان ہیں، اس لئے میں خاک کے اس پتلے — آدم سے بہتر ہوں" لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ آدم میں خود سورج اور آگ کے خالق کی پھونکی ہوئی روح کارفرما ہے۔ جس کی بدولت یہ خاک ہم دوشِ ثریا ہے۔ اس کی تقویم میں خود سورج کی گرمی و روشنی سے کام لیا گیا ہے، اور اس میں سورج، آگ اور دیگر کائناتی قوتوں کی تسخیر کی قوت موجود ہے،" لیکن شیطان اپنے محدود علم کی بنا پر اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہا اس لئے اپنے خالق کے حکم کی نافرمانی کر بیٹھا اور ابدی لعنت میں گرفتار ہو گیا،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ کیا اہلِ علم اور بے علم جاہل برابر ہیں؟ ہرگز برابر نہیں" مخلوق میں یہی امتیاز آدم کی خلافت کی سند تھا، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ابلیس رحمتِ حق سے محروم ہو گیا، اسے احساس نہ ہو سکا کہ اس میں وہ صلاحیت نہیں جو آدم کو ودیعت کی گئی ہے، اس لئے اس کی تمام توجہ اس بات پر مرکوز ہو گئی، کہ وہ آدم کو بھٹکا کر اپنی راہ پر لے آئے، اور اس طرح اپنی ذلت و محرومی کا انتقام لے پس یوں وہ دنیا میں مایوسی، پست ہمتی، قنوطیت اور جمود کا نمائندہ، محرک اور نشان بن گیا اسی حقیقت کی معرفت یا عدم معرفت کی بدولت خود نوعِ انسان عروج یا زوال کا شکار ہوتی ہے، علم ہی کی بدولت دنیا میں ترقی، تہذیب، درسِ سلسل سربلندی اور ارتقاء ہے — اور اسی کے فقدان کی وجہ سے انتشار، فساد، پستی بربریت اور حیوانیت کی تاریکی دنیا کو ڈھانپ لیتی ہے۔

انسان کو علمی اور فکری صلاحیتوں سے نوازا گیا، اس کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا، لیکن ابھی اس کی فطری استعدادوں کی نشوونما اور رہنمائی کے لئے نہ تو لائحہ عمل عطا کیا گیا، نہ ہی اس کے سامنے کوئی ماضی تھا، جس کی رہنمائی میں وہ مستقبل کی منزلوں کی طرف جادہ پیما ہو جاتا، رہ سہہ کر اس کا مادی وجود اور اس کی بقا کے تقاضے تھے، اسے کھانے پینے اور گرمی و سردی سے بچنے کا احساس تھا۔ اس کا دشمن شیطان نہیں چاہتا تھا کہ آدم پر اس کا حقیقی مقام کھل سکے اور وہ علم و معرفت کی شاہراہ پر چل کر سربلند ہو جائے، اور اس طرح روحانی رفعتوں پر پہنچ کر اس کی زد

اور گرفت سے باہر ہوجائے، چنانچہ اس نے آدم کو جسمانی اور مادی تقاضوں میں الجھا دیا، اور آدم، شیطان کے بہکانے سے، نادانستہ، اپنے حقیقی مقام سے گرگیا، (فَنَسِيَ آدَمَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا) اور اپنی رفیقۂ حیات کو بھی شریک کرلیا،

نفسانی خواہشات کے تقاضوں نے انسان کو کشمکش حیات سے دوچار کردیا، راستے کے نشیب و فراز سے بے خبر ہونے کی وجہ سے اسے مشکلات نے گھیر لیا، سفر زندگی میں اس کی رنج وراحت کی شریک رفیقۂ حیات حوا بھی آدم کی پیدا کردہ مشکلات میں لپیٹی گئی مگر دونوں کو اپنی غلطی کا جلد ہی احساس ہوگیا، اور اس مقام کی عظمت کا شعور جاگ اٹھا جہاں سے وہ گرائے گئے تھے، پس انھوں نے سربسجود ہوکر بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑا کر التجا کی ربَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ - اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفسوں پر تیری نافرمانی کرکے، ظلم کیا ہے، اور اگر تو ہماری خطا کو معاف نہیں کرے گا، اور ہم پر رحمت نہیں کرے گا، تو بلاشبہ ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے" آدم و حوا کی یہ مخلصانہ گریہ وزاری رائگاں نہ گئی۔ رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور نہ صرف اول البشر کی مشکل کشائی کرگئی۔ بلکہ تا قیامت نوعِ بشر پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ جب کبھی انسان راہِ راست سے بھٹک جائے گا، اور اپنی خطا پر نادم ہوکر دستگیری کے لئے بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوگا، ہر بار رحمتِ الٰہی اس کی دستگیری کے لئے آگے بڑھے گی اور اگر وہ ہزار بار بھی خطا کرکے اُس کے آستانے پر سر رکھے گا تو محروم و مایوس نہیں لوٹے گا۔

باز آ۔ باز آ۔ ہر آنچہ ہستی، باز آ۔ گر کافر و گبر و بُت پرستی باز آ

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست۔ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

پس بارگاہِ سرمدی سے شیریں کلام میں یہ بشارت سنائی گئی "تمھاری توبہ قبول ہوتی۔ تم نے جلدبازی سے کام لیا تھا، تمھیں آئندہ شیطان کے وسوسوں سے بچانے اور کارگہِ حیات میں رہنمائی کے لئے ضابطۂ ہدایت عطا کروں گا، جیسے نسلِ انسانی کی ہدایت کے لئے انسانوں ہی

میں سے منتخب رسولوں کے ذریعے بھیجتا رہوں گا تاکہ وہ رسول جہاں تعلیم پہنچائیں وہاں اس پر عمل کر کے انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ پیش کریں،

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ)

پس جب میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے تو جو تم میں سے میری ہدایت پر چلیں گے، پس انھیں نہ خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (اعراف)

اے اولادِ آدم! جب تم ہی میں سے میرے رسول آکر میری آیات تمھیں پڑھ کر سنائیں، تو جو میری نافرمانی سے بچیں گے اور میری تعلیمات کے مطابق اپنی اصلاح کریں گے، ان پر نہ ہی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔"

متقین اور صالحین کا گروہ | آدم کو جنت میں رکھا گیا تو تاکید کر دی گئی کہ شجرِ ممنوعہ کے قریب نہ جاؤ گے تو ابدی جنت نصیب ہوگی، جس میں اَنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی ۔ نہ تو بھوکا رہے گا اور نہ ننگا، نہ اس میں تو پیاسا رہے گا اور نہ ہی تمھیں دھوپ ستائے گی مگر آدم سب کچھ بھول گیا، اور شجرِ ممنوعہ کے پاس جانے سے نہ رہ سکا اور ان تمام نوازشات سے محروم ہو گیا جن کا خدا کی طرف سے وعدہ دیا گیا تھا۔ تب اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا اور وہ نادم ہو کر بارگاہِ خداوندی میں تائب ہوا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں اور لاانتہا رحمت نے دوبارہ اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور نسلِ آدم کو مزید لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچانے کے لئے اپنے اطاعت شعار اصولوں کی معرفت انھیں کتابِ ہدایت سے نوازا اور تاکید کر دی کہ تم میں سے جو لوگ میری رضا کی خاطر، کامل طور پر میری ہدایت کی پیروی کرتے رہیں گے، وہ ہر گونہ مفاسد سے محفوظ رہ کر میری پناہ میں رہیں گے اور بلند سے بلند تر مراتب پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا ارشاد سے ایک حقیقت نکل کر سامنے آتی ہے کہ وہ اپنی ہدایت کی روشنی میں رسولوں کے ذریعہ متقین اور صالحین کی ایک جماعت قائم کرنا چاہتا ہے، جو دنیا میں اجتماعی طور پر احکامِ الٰہی پر کاربند ہو، بھولے بھٹکے برادرانِ نوع کو نیکی، انصاف، خداشناسیؔ اور احکامِ الٰہی کی پیروی کی دعوت دے، بدی، فساد اور معصیت کے استیصال اور بیخ کنی کے لئے اجتماعی اور انفرادی سطح پر مصروفِ جدوجہد رہے، انسان دشمن استحصالی قوتوں کو ختم کرے، اور اس میں مداہنت، تقیہ اور تملق سے بلند تر ہو کر بلا خوف لومۃ لائم گامزن رہے، مَنْ تَبِعَ هُدَايَ اور فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کے الفاظ ربانی اُن کی نہیں جماعتِ مسلمین، اُمّتِ مسلمہ کی نشاندہی کرتے ہیں اور گو خدا کا ایک مخلص بندہ، عبد صالح بھی خدا کی نظر میں مقبول ہوتا ہے، تاہم خلافتِ ارضی کا خلعت ہر زمانے اور دور میں اُمّتِ مسلمہ یعنی جماعتِ المسلمین، حزب اللہ کا مقدر رہا ہے، اور جب کبھی انبیاء علیہم السلام کے متبعین کو کہا گیا کہ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ کہ ہم نے تمھیں کفّار و مکذبین کے بعد دنیا میں خلافت بخشی تو اس سے مراد جماعت بہ حیثیت اُمّت تھی، فرد مخاطب نہ تھا۔

بعثتِ انبیاء زمین پر آباد ہونے کے بعد انسان کنبوں اور خاندانوں میں ڈھلتے گئے، جنھوں نے بعد میں قبیلوں اور بالآخر نسلی، علاقائی اور تہذیبی اساس پر قوموں کی صورت اختیار کرلی۔ کسی مربوط اصلاحی نظامِ ہدایت کی عدم موجودگی میں بقائے ذات کے تقاضوں نے انھیں راہِ راست سے دُور کر دیا۔ عدل و انصاف، رواداری اور جائز وسائل سے روزی حاصل کرنے کی بجائے طاقت وروں نے ناتوانوں کو لوٹنا شروع کر دیا، "ہر قیمت پر، ہر صورت اور ہر طریق سے زندگی کی بقا" آسان ترین گُر نظر آنے لگا۔ "ہر جائز و ناجائز طریق سے زیادہ سے زیادہ تمائدہ اُٹھاؤ" اور "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" آئینِ حیات قرار پایا۔ ایک دوسرے کو لوٹنے، ایک دوسرے کو قتل کرنے، ایک دوسرے سے علاقوں، اموال اور وسائلِ حیات کو ہتھیانے کی خاطر باہمی امن و سلامتی، عدل و انصاف، اصلاح و شرافت کے تمام تقاضوں کو پسِ پشت

ڈال دیا۔ اور مردم آزاری سے گزرکر مردم کشی اور آدم خوری تک نوبت پہنچ گئی، پھر کمزوروں کے مقابل تو ایک قبیلہ یا قوم کی روش جابرانہ ہوتی تھی، اور جب اپنے سے زیادہ کوئی طاقت ور گروہ حملہ آور ہوتا تھا، تو پھر یہ جابر قبیلہ مظلومیت کا لبادہ اوڑھ لیتا، اور کبھی کبھی جان، مال، ناموس، گھربار اور آزادی کے تحفظ کے نام پر میدان میں کود پڑتا۔ لیکن ناتوانوں کو ان تحفظات سے محروم کردیتا، غرضیکہ ویسا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (انسان کے ہاتھوں بحر و بر پر فساد کے طوفان چھا گئے) کا منظر پیش کرنے لگی، جس کی اصلاح و درستی کے لئے اپنی رحمت سے اللہ تعالیٰ کسی رسول کو ہدایت کے لئے بھیج دیتا، انبیاء کی بعثت و ترسیل کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (البقرہ: ۲۱۳)	"سارے انسان ایک اُمت ہیں، پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ہمراہ حق کے ساتھ کتاب اُتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے، جن میں باہم اختلاف کرتے تھے، اور جنہیں وہ کتاب دی گئی تھی انھوں نے اپنی ضد کی بناء پر اس میں اختلاف کیا، اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں پس اللہ نے اپنے حکم سے ان کو جو ایمان لائے اس حق کی طرف ہدایت کی جس میں لوگ اختلاف کرتے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔"

جب کبھی کسی قوم یا بستی میں شدید اختلاف رُونما ہو کر فساد و انتشار کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ انسانی ترقی و تہذیب کو زوال آجاتا تھا، باہمی عداوت و حسد کا غلبہ ہو جاتا تھا، انسانیت

کی قدریں مضمحل ہوجاتی تھیں، اجتماعی عمل ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی تھی، فکر وحریت کے سوتے جہالت وجمود کے خس وخاشاک سے اَٹ جاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ ہدایت کا سامان کردیتا تھا۔ اس کے رسول آسمانی ہدایت لاتے تھے، خالص بے لوث ہدایت، اگر ایک گروہ خواہشات سے مغلوب ہوکر تکذیب کرتا تھا۔ تو دوسرا گروہ ہدایت پر ایمان لاکر بشارات وافضالِ الٰہی سے جھولیاں بھرتا تھا، اور اپنی قوم میں خلافت وامامت کا نمونہ قائم کرتا تھا، مومنین، متقین اور صالحین کا یہی گروہ انبیاء کی بعثت کا مقصود تھا، رہا ہے اور آج بھی ہے، حتیٰ کہ یہی گروہ دنیا میں غالب آکر نسلِ آدم کو عدل وانصاف، صلح وآشتی، محبت و اخوت اور اخلاق وروحانیت سے ہم کنار کردے گا۔

سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا انقلابی مقصد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے دنیا میں قبائلانہ گروہ بندیاں تھیں اور بڑے بڑے قبائل طاقت ور اور جابر اُمراء کی گرفت میں تھے۔ جو اقتدار، دولت اور تقلیدی ورواجی مذہب ہر تین قوتوں پر مسلط تھے، ابلیس نے جب کبھی بدی کی قوتوں کو نسلِ آدم کے خلاف استعمال کیا اُس نے انسانوں میں سے ان تینوں گروہوں کو ہی آلۂ کار بنایا، حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور اسی زمانے کے دیگر انبیاء کو ان خواہشات کے غلام، ہوس کار متکبر، مترف اور مذہب کے اجارہ داروں ہی سے واسطہ پڑا، ان انبیاء نے پند وموعظت سے اپنی اقوام کو راہِ راست پر لانے، جبر وتشدد سے نجات دلانے اور سیاسی، معاشی اور مذہبی اجارہ داریوں کو ختم کرکے عدل ومساوات پر مبنی نظام میں متحد ویکجا کرنے کے لئے سرتوڑ سعی کی لیکن تھوڑے ہی لوگ ان کے مسلک پر گامزن ہوئے حتّٰی کہ انجام کار انبیائؑ کے مخالفین ہلاک اور ان انبیاء پر ایمان لانے والے بندگانِ حق کی جماعت کو بجا کر انھیں خلافتِ ارضی سونپی جاتی رہی، اور اس طرح انسان تہذیب وارتقار کی شاہراہ پہلان موجوں کی طرح بڑھتا ہوا باہم ٹکرانے کے ساتھ ساتھ سمندر کی طرف بہتی چلی جاتی ہیں۔

مذہبی دنیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے نبی نظر آتے ہیں جن کے عہد میں قبائلی رُؤسا کی جگہ ایک قوی، جابر، متمرد بادشاہ نے لے لی تھی، بابل کا بادشاہ نمرود اپنی قوت، جبروت اور خودسری کی وجہ سے خود سیاسی اقتدار، دولت اور علم و فراست کے بل بوتے پر خدائی کا مدعی تھا، اور اس کی سلطنت کے لوگ جہاں اُس کے اقتدار سے لرزاں تھے، وہاں عقیدت اور خوف کی بنا پر اس کی پرستش بھی کرتے تھے، اقتدار، مال و دولت کی فراوانی اور مذہبی قیادت تین ایسی قوتیں ہیں جن کا ہر مادہ پرست انسان پجاری چلا آیا ہے، اور آج بھی جو شخص انسانوں پر اقتدار حاصل کر کے ان کو گرفت میں لینا چاہتا ہے۔ وہ سیاسی، معاشی اور مذہبی اقتدار، خطرات اور تحفظ کی آڑ میں انسان کی جان، مال اور آبرو پر تصرف حاصل کر لیتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تنہا ان تمام دشمن قوتوں کا مقابلہ کیا، آپ نے معجزات سے نہیں بلکہ دلائل و براہین سے وقت کے حاکم اور عامۃ الناس کو خود ساختہ بتوں کی بے بسی کا احساس دلایا، اور خدائے واحد کی طرف دعوت دیتے وقت ایثار و قربانی کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی نظیر تاریخِ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے، آپ نے حق کی خاطر آتشِ نمرود کو خوش آمدید کہا، خویش و اقارب، گھر بار اور وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا، حتیٰ کہ اپنی عزیز ترین متاعِ حیات، اکلوتے جوان سال فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو رضائے الٰہی کی خاطر قربان کرنے سے دریغ نہ کیا، تاکہ آپ کی سنت پر چلنے والے عظیم انسانوں پر مشتمل امتِ مسلمہ کی تشکیل ہو۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جب تسلیم و رضا کی آزمائش میں پورے اُترے اور اللہ تعالیٰ اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، (میں تمہیں نوعِ انسانی کا امام بنانے لگا ہوں) کے الفاظ میں آپ کو امام الناس کے خلعت و خطاب سے نوازا تو آپ نے دنیا میں توحید کے قیام و دوام کے لئے مکہ مکرمہ میں اپنے فرزندِ ارجمند حضرت اسماعیل کی معیت میں بیت اللہ تعمیر کیا جو دنیا میں خانہ کعبہ کے نام سے مشہور و معروف ہوا، اسے توحید پرستوں کے اجتماع اور امن کا گہوارہ، مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا، قرار دیا گیا، اور اس مقصد کی خاطر سالانہ حج کا اعلان کیا گیا

تاکہ لوگ ہر سال بلکہ ہر آن بیت اللہ میں یکجا ہو کر خدا کی یکتائی اور توحید کا اعلان متواتر لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ لَاشَرِیْكَ لَكَ کے نعروں سے کریں، تین توحید پرستوں — حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ، حضرت اسماعیلؑ — کی یاد تازہ کریں، توحید پرستوں پر مشتمل امتِ مسلمہ دنیا کے کونے کونے سے یہاں جمع ہو، امن و سلامتی، وحدت ربانی، وحدتِ نسل انسانی، اور مساوات و حریتِ بنی آدم کے عزم کامل کا مظاہرہ بھی کرے اور اس پیام و سنت ابراہیمی کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچانے کا جذبہ و عزم لے کر اقصائے عالم میں پھیل جائے۔

دو انسانیت نواز دعائیں | جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہو گئے، تو حکم الٰہی کے مطابق عرب کی سرزمین میں اعلان حج کر دیا اور خانہ کعبہ کو عام زائرین، معتکفین حرم اور عبادت گذاروں کے لئے پاک و مطہر کر دیا، تو اپنی دلی تڑپ اور لگن کو بقائے دوام بخشنے کے لئے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوتے :-

۱- رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (البقرہ)

اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری نسل سے ایک امت مسلمہ (فرمانبردار امت) بنا ہو، اور ہمیں ہمارے حج کے طور طریقے (اعمال حج) بتا اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما۔ تو رحمت سے توجہ فرمانے والا رحم کرنے والا ہے۔

۲- رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (البقرہ)

اے ہمارے رب! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمائیو، جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک کرے۔ تو غالب حکمت والا ہے۔

جو مقصد انبیائے سابقین کے سامنے تھا اور ابھی تکمیل کا محتاج تھا۔ وہ ان ہر دو عدیم النظیر باپ بیٹے کی زبانوں پر دعا بن کر ظاہر ہوا۔ ان دونوں دعاؤں میں ایک تو امت مسلمہ کی تشکیل اور

دوسرے ایک عظیم الشان جلیل القدر رسولؐ کی بعثت لازم وملزوم ہیں، ان ہر دو دعاؤں کا مرکزی نقطہ "امت مسلمہ" ہے، اور رسولؐ کی بعثت کی غرض وغایت اس امت کا قیام اور اس کے دوام وتکمیل کے لئے تطہیر وتزکیہ کے ساتھ ساتھ احکام وحکمت خداوندی کی تعلیم دینا ہے، بلاشبہ نبی مبعوث ہو کر دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرتے ہیں، اور ایک صالح گروہ کو اپنے پیغام پر یکجا کر کے رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن کسی رسولؐ کے پیغام کا علمی اور عملی نمونہ اس کی امت پیش کرتی ہے۔ وہی اس کی تعلیمات کو پھیلاتی اور دنیا میں حق وصداقت کی علمبردار ہوتی ہے، وہی اقوام عالم کے سامنے خدا کی توحید، کتاب اللہ کی تعلیمات اور اپنے نبی کی سنت کا نمونہ پیش کرتی اور مخالفین پر حق کی شہادت دے کر اتمام حجت کرتی ہے۔ یہی امتِ خیر ہے، یہی امت وسط ہے، یہی نسل انسانی کے درمیان شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ہونے کا آسمانی فریضہ ادا کرتی ہے جس کی بدولت ایک امت "میانِ انناں والا مقام است" کی مصداق بنتی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ بھی اس امت پر درود وصلوٰت بھیجتے ہیں۔

فلاح وبہبود انسان کا مقصدِ عظیم | سیدنا حضرت ابراہیمؑ تسلیم ورضا کے جس بلند مقام پر تھے، اور قیام ونشر توحید کے سلسلہ میں آپ مصائب کی جس بھٹی میں سے گذرے وہ اس محبت الٰہی اور نبی نوع انسان کی فلاح اور بہبود کی تڑپ سے عبارت ہے جو آپ کے قلب پر غالب ومتسلط تھی اور اس کا اظہار آپ نے حیاتِ مستعار کے آخری ایام میں ذیل کے الفاظ میں فرمایا:۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ
وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّهُنَّ
اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ
فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ رَبَّنَآ اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ
بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ

"اے ہمارے رب! اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا
اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے بچا کہ ہم بتوں
کی پوجا کریں۔ میرے رب! انھوں نے اکثر لوگوں
کو گمراہ کیا ہے۔ پس جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے
ہے، اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا رحم
کرنے والا ہے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ

رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (ابراہیم ع ۶ آیت ۲)

اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے پاس اس وادی میں لابسایا ہے۔ جہاں کھیتی نہیں اگتی، ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں، پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ وہ شکر ادا کرتے رہیں۔

ایک بے آب و گیاہ، غیر آباد ریگ زار میں خدائے واحد کی عبادت کے لئے خانۂ خدا کی تعمیر، دنیا میں ایک پُر امن، فتنہ و فساد سے پاک، جنت نظیر بستی کی آرزو، خدا کی عبادت گذار موحد جماعت کے وجود کی تڑپ، شرک و بت پرستی سے نجات کی خواہش اور اس نوزائیدہ جماعت کے لئے باعزت روزی کی دعا اُس دنیا کی عکاس ہے، جو خلیل اللہ کے تصور میں موجود تھی۔

امت مسلمہ — امت مسلمہ دن گذرتا گیا، دن مہینوں، سالوں اور صدیوں میں ڈھلتے گئے، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی تمنائیں اور دعائیں زمانے کی آغوش میں نشوونما پاتی رہیں۔ حتی کہ کوئی اڑھائی ہزار سال بعد رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ کی دعا خاتم الانبیاء رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں رونق افزائے بزمِ انسانیت ہوئی، جس کی بشارت قرآنِ حکیم نے تصدیق ذیل میں دی:-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (الجمعہ)

اللہ ہی نے اُمیوں کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے۔ اور انہیں پاک کرتا ہے، اور انہیں کتاب و حکمت سکھلاتا ہے اور اس سے قبل یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ام القریٰ مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیمؑ کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ایک نبی مبعوث فرمایا جو انہی صفات کا حامل تھا۔ جن کا حضرت ابراہیمؑ کی دعا

میں ذکر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیانی عرصے میں اس قوم میں کوئی نبی، رسول، وصی اور امام نہ آیا۔ خود بعثت سے قبل آپ مَاكُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ کے مطابق خود ایمان اور کتاب کی حقیقت اور ماہیت سے بے خبر تھے، آپ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کی رو سے آسمانی رہنمائی اور ہدایت کے متلاشی تھے، اور آپ کو ہدایت عطا کی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل آپ کی قوم بھی لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ کے مصداق ہدایت سے محض ناآشنا تھی اور ان کے درمیان آپ کے زمانے میں کوئی دوسرا نبی، رسول امام یا وصی موجود نہ تھا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بعثت کو امت مسلمہ پر احسان کے طور پر بیان کیا گیا، کیا ہی عظیم محسن، کتنا ہی بڑا احسان اور کس قدر عظیم وہ امت مسلمہ تھی، جس پر احسان کی بارش کی گئی۔ اور نعمتوں سے مالا مال کر دیا گیا:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران: ۱۶۴)	"یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے، اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائے خلیل اور حکم خداوندی کے مطابق اہل ایمان کا تزکیہ فرمایا اور ان کی تطہیر کی، ان کے سینے ایمان و حکمت کے نور سے بھر دیئے اور وہ دنیا میں دعائے خلیل کی مظہر، امت مسلمہ کے سانچے میں ڈھل گئے، یہی سنت ابراہیمی کا عکس و نمونہ تھے، یہی امت مسلمہ تھی جو انبیاء کی توجہ اور تعلیمات کا مرکز تھی، اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ	یقیناً ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ قریب

اَتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (آلِ عمران : ۶۸)

وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اس کی پیروی اختیار کی، اور یہ نبیؐ اور وہ جو اس نبیؐ پر ایمان لائے اور اللہ مومنوں کا ولی ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تربیت یافتہ، سنّتِ ابراہیمی کے پابند اور محب، مومنین کے دین و ایمان پر قرآن کی یہ آیت شاہد اور مذکورہ بالا آیت کی موید ہے:۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا (النساء : ۱۲۵)

اور دین کے لحاظ سے اس سے زیادہ اچھا کون ہے، جس نے اپنی تمام تر توجہ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر لگا دیا، اور وہ نیکوکار اور یک سو ہوکر ابراہیمؑ کے راستے کی پیروی کرتا ہے اور اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنا لیا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم، تربیت، تطہیر اور تزکیہ کا شاہکار، امتِ مسلمہ کلی طور پر آستانۂ الٰہی پر گر گئی، اس نے اپنی خواہشات کو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے قربان کردیا، حسنِ عمل، حسنِ اعتقاد اور حسنِ سلوک میں محسنینِ انسانیت بن گئے، حضرت ابراہیمؑ کے طریق پر چلے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنا لیا تھا، یہ امت بھی خدا کی برگزیدہ و محبوب بن گئی۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الحج : ۷۸)

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے، اُس نے تمھیں چن لیا ہے، اور دین کے بارے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، تمھارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب، اُس نے تمھارا نام پہلے ہی سے مسلمین (امتِ مسلمہ) رکھا، اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسولؐ تم پر شاہد (نمونہ) ہو اور تم لوگوں پر شاہد (نمونہ) ہو، پس نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھو، وہ تمھارا مولا ہے، سو وہ کیا ہی اچھا مولا ہے اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔

عہد نبوی کے غزوات و سرایا

اور

اُن کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۷)

(سعید احمد اکبر آبادی)

سلسلہ کے لئے دیکھئے اشاعت جنوری ۶۶ء

حی بن اخطب النضیری جو بنو نضیر کے اُن چند لیڈروں میں سے ایک تھا جنھوں نے غزوۂ احزاب کا فتنۂ عظیم برپا کیا تھا خود بنی قریظہ کے پاس گیا اور اُن کے سردار کعب بن اسد القرظی سے ملاقات کے لئے اُس کے قلعہ میں داخل ہونا چاہا تو اُس نے قلعہ کا دروازہ بند کرلیا، حی بن اخطب نے دروازہ کھولنے کی درخواست کی تو کعب نے کہا: میں تمھارے لئے دروازہ نہیں کھولوں گا۔ تم منحوس آدمی ہو، تم مجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت پر اُکساتے ہو، حالانکہ میں نے اُن سے عہد و پیمان کر رکھا ہے، اور میں نے محمد کو اپنے عہد و پیمان کو بڑا پابند اور سچا پایا ہے۔ اس لئے میں بھی اُس عہد کو نہیں توڑ سکتا جو میرے اور اُن کے درمیان ہے۔" حی بن اخطب بولا: اچھا! دروازہ تو کھولو، میں تم سے بات کروں گا اور لوٹ جاؤں گا" کعب نے اب بھی دروازہ نہیں کھولا تو حی بن اخطب نے کعب کی عربی غیرت کو مہمیز کرنے کی غرض سے ایک ایسی بات کہی جس کے بعد دروازہ

کھول دینا یقینی تھا، اس نے کہا:

میں سمجھا! تم دروازہ اس لئے نہیں کھولتے کہ تمہیں ڈر ہے میں تمہارے طعام خاص[1] میں حی بن اخطب کی یہ تدبیر کارگر ہوئی کعب نے غضبناک ہو کر فوراً دروازہ کھول دیا، اب حی نے کہا: میں قریش اور غطفان کے سرداروں کی ایک فوج گراں لے کر آیا ہوں جس نے محمد اور اُن کے ساتھیوں کو ختم کر دینے کی قسم کھالی ہے یہ کعب نے جواب دیا: تم مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو، میں تمہاری بات ہرگز نہیں مان سکتا، تم جسے فوجِ گراں کہتے ہو میرے نزدیک وہ چھپتے بادل ہیں جو کہن گرج تو بہت دکھاتے ہیں مگر برستے نہیں،، حی اور کعب میں دیر تک اسی طرح ردّ و قدح اور تکرار ہوتی رہی، اس سلسلہ میں حی نے یہ بھی کہا: اگر قریش ناکام واپس ہوئے بھی تو میں بہر حال یہیں مدینہ میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا پھر تمہیں کیا غم ہے،، آخر کعب پسیجا اور اُس نے حی کی ہمنوائی اختیار کر لی[2]

بنی قریظہ سے باہر! بنو قریظہ نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پُرامن رہنے کا معاہدہ کر رکھا تھا لیکن جیسا کہ گذر چکا ہے وہ کبھی اس کے پابند نہیں رہے اور انھوں نے مسلمانوں پر حملہ کے لئے کسی مناسب وقت کے انتظار میں اس کو دفع الوقتی کا محض ایک بہانہ بنایا تھا، ورنہ جب کبھی ذرا موقع ملتا اپنی شرارت سے باز نہیں آتے تھے، چنانچہ غزوۂ خندق کے لئے تیاری کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو بنو قریظہ کے قریب ایک محفوظ قلعہ میں فروکش کر دیا تھا تو بنو قریظہ اُس وقت بھی نہ چوکے۔ انھوں نے خواتین پر حملہ کا ارادہ کیا اور ایک یہودی کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ حرم نشینانِ کاشانۂ نبوت کے جائے قیام اور اُن کے حفاظتی انتظامات کا سراغ لگائے، یہ شخص مشتبہ انداز میں ادھر

---

[1] روایت میں جشیشہ کا لفظ آتا ہے، یہ عرب کا خاص اور لذیذ کھانا تھا جو موٹے پسے ہوئے گیہوں گوشت اور کھجور سے تیار کیا جاتا تھا۔

[2] البدایہ ج ۴ ص ۱۰۳

اُدھر گھوم رہا تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی حضرت صفیہ نے بھانپ لیا، انھوں نے حضرت حسان بن ثابت کو جو قلعہ کی پہرہ داری پر متعین تھے، اس طرف متوجہ کیا۔ مگر وہ ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے، انھوں نے اس پر دھیان نہیں دیا، آخر حضرت صفیہ نے خود ہمت کی اور قلعہ سے باہر نکل ایک چوب گراں سے یہودی کے ضرب کاری لگائی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا، اس موقع پر حضرت صفیہ کے جو الفاظ ہیں وہ یاد رکھنے کے قابل ہیں، فرماتی ہیں :-

وقد حاربت بنو قریظۃ، وقطعت ما بینہا وبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]	بنو قریظہ اس وقت بر سر جنگ تھے اور جو معاہدہ اُن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان

تھا وہ انھوں نے منقطع کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں، حی بن اخطب کا کعب بن اسد القرظی کو شیشہ میں اُتار لینا اور مدینہ سے جلا وطن ہونے کے باوجود خود اس کا بنو قریظہ میں رہ پڑنا! ان سب کے کیا معنی تھے ؟ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو تحقیق حال کے لئے چار آدمیوں کا ایک دستہ بھیجا جس میں خزرج کے سردار سعد بن عبادہ اور اُس قبیلہ کے لیڈر سعد بن معاذ بھی شامل تھے، دستہ کی روانگی کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت کر دی تھی کہ جو کچھ ہم نے سنا ہے اگر یہ سچ ثابت ہو تو تم واپس آکر ہم کو اُس کی اطلاع گول مول لفظوں میں دینا تاکہ مسلمانوں میں اُس سے عام اضطراب اور بے چینی نہ پیدا ہو البتہ ہاں اگر یہ خبر جھوٹی ہو تو تم اس کی خبر علانیہ دینا اب یہ دستہ وہاں پہنچا اور اُس نے تحقیق حال کی تو جو کچھ سنا تھا حالت اُس سے بھی بدتر پائی بنو قریظہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہایت گستاخانہ الفاظ کہے اور انھوں نے صاف صاف کہا کہ ہمارا محمد سے کوئی کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہے !

جس طرح بنو قینقاع خزرج کے حلیف تھے اسی طرح بنو قریظہ اُس کے حلیف تھے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۳۹

اس بناء پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہ دور اندیشی وحکمت عملی اس دستہ میں سعد بن معاذ کو جو اُس قبیلہ کے سردار تھے شامل کیا تھا تاکہ یہ جو رپورٹ کریں گے اُس کے درست ہونے میں کسی کو تردد ہی نہ ہو اور بنو قریظہ کو بھی اُس کی تکذیب کا یارا نہ ہو، سعد بن معاذ اگرچہ بنو قریظہ کے حلیف تھے، لیکن اس وقت انھوں نے ان بدبختوں کی زبان سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جو سخت گستاخانہ کلمات سنے تو برداشت نہ کرسکے اور پلٹ کر انھوں نے بھی جواب ترکی بترکی نہایت سختی اور درشتی سے دیا، جب بات زیادہ بڑھی تو سعد بن عبادہ نے کہا: سعد بن معاذ! ان کو چھوڑ دو بھی! کیوں کہ ہمارے اور اُن کے درمیان جو معاملہ ہے وہ تو سب وشتم سے بھی کہیں زیادہ سخت ہے۔" سعد بن نے واپس ہو کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق یہ خبر ڈھکے چھپے الفاظ میں سنائی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہِ دل داری و دل جوئی فرمایا: لو! اے مسلمانو! تمھارے لئے خوش خبری ہے۔[1] یہ حضور کی قیادت کا کمال ہے کہ خبر کس درجہ منحوس اور تشویش انگیز آئی ہے لیکن مسلمانوں کے سامنے آپ اس کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں تاکہ اُن میں بے چینی اور اضطراب نہ پیدا ہو۔

غرض کہ اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا کہ بنو قریظہ حسبِ سابق اب بھی اسلام اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید دشمن تھے، آپ سے ان کا جو معاہدہ ہوا تھا اس کو قولاً وعملاً انھوں نے توڑ دیا تھا، مقتول کے خون بہا کے معاملہ میں ان کو بنو نضیر کے ہم مرتبہ قرار دے کر آپ نے اُن پر جو احسانِ عظیم کیا تھا اُس کو اُن لوگوں نے پس پشت ڈال دیا تھا، آپ نے معاہدہ کی رو سے ان کو جان و مال کی امان اور مذہب وکسبِ معاش کی جو آزادی مرحمت فرمائی تھی اس کی ان لوگوں نے ذرا قدر نہیں کی اور ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے سینہ میں چھرا بھونک دینے کا جتن کرتے رہے۔

---

[1] (الدرر ص ۸۳)

غزوۂ احزاب سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے نازک اور تشویش انگیز وقت اور کون سا ہو سکتا تھا جب کہ دس ہزار کے ٹڈی دل نے مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تھا اور مسلمان خندق کی ڈھال پر ان کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھے، ظاہر ہے اس وقت بنو قریظہ کس طرح چوک سکتے تھے، چنانچہ وہ کون سی شیطنت ہے جو انھوں نے نہیں کی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ جنگی قیادت کو داد دینا چاہئے کہ آپ بنو قریظہ کی ایک ایک حرکت سے واقف رہے لیکن جنوب میں دوسرا محاذِ جنگ نہیں کھلنے دیا، بنو قریظہ ہزار کسمسائے اور بار بار پر کھلاتے رہے لیکن حضور نے ان کی طرف حضرت علی کی سرکردگی میں دو سو آدمیوں کا جو دستہ متعین کر رکھا تھا اُس کی وجہ سے انھیں کھلم کھلا جنگ کرنے اور قریش و غطفان کو کمک پہنچانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ قرآنِ مجید میں ان کے اس حال کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے۔

وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ	اور وہ اہل کتاب (بنو قریظہ) جنھوں نے مشرکین
أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ صَيَاصِيهِمْ	کی مدد کی اللہ نے اُن کو اُن کے قلعوں سے نیچے
وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ	اُتارا اور اُن کے دلوں میں (مسلمانوں کا)
(الاحزاب)	رعب بٹھا دیا۔

مولانا شبلی نے لکھا ہے: قریظہ نے علانیہ جنگ میں شرکت کی اور شکست کھا کر ہٹ آئے۔" (سیرت النبی ج ا ص ۴۴۳) لیکن ماخذ کی عام روایات سے کھلم کھلا جنگ کرنے کا ثبوت نہیں ملتا، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تحقیق حال کے لئے حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟ اور پھر ان دونوں حضرات نے حضور کو جو رپورٹ دی اُس میں کہیں علانیہ شرکتِ جنگ کا تذکرہ نہیں ہے۔

علاوہ ازیں حضرت علی اپنے دستہ (Regiment) کے ساتھ وہیں کہیں موجود

تھا اگر یہ لوگ میدان میں آکر مقابلہ کرتے تو حیدر کرار کی زد سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے، تاریخ میں کہیں تو اس کا تذکرہ ہوتا۔

ایک عام روایت اور اُس کی تردید | اس سلسلہ میں ایک عام روایت جو تاریخ وسیر کی تمام کتابوں میں یہاں تک کہ حافظ ابن عبدالبر کے ہاں بھی موجود ہے، وہ یہ ہے کہ جن دنوں میں قریش اور بنو قریظہ میں بات چیت چل رہی تھی، نعیم بن مسعود اشجعی نام کے ایک غطفانی سردار تھے نئے مسلمان ہوئے تھے انھوں نے حضور کو پیش کش کی کہ وہ قریش اور بنو قریظہ دونوں کے پاس جا کر لگائی بجھائی کی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں کو ایک دوسرے کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو جائے اور اُن میں باہم سنگھٹن نہ ہو سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی تو اب یہ بنو قریظہ کے پاس آتے اور کہا : قریش کا کیا اعتبار ہے، آج وہ یہاں ہیں، کل چلے جائیں گے، اس لئے تم قریش سے مطالبہ کرو کہ وہ اپنے کچھ آدمی تمھارے پاس بہ طور رہن کے رکھ دیں، دوسری طرف قریش سے جا کر کہا : بنو قریظہ کو تم پر بالکل اعتماد نہیں ہے، اس بنا پر وہ تم سے رہن کا مطالبہ کریں گے،" نعیم بن مسعود کا یہ حربہ کارگر ہوا، چنانچہ بنو قریظہ کی طرف سے جب ضمانت یا رہن کا مطالبہ ہوا تو قریش اُن سے مایوس ہو گئے اور دونوں میں گٹھ جوڑ نہ ہو سکا۔

مولانا شبلی نے بر بنائے قیاس اس روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی نے حاشیہ میں اس قیاس کی تصویب کرتے ہوئے مصنف ابن ابی شیبہ اور البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر کے حوالہ سے اس روایت کے بالمقابل ایک اور روایت پیش کی ہے جس سے روایت متعلقہ کی تردید ہو جاتی ہے اور ہمارے نزدیک حق یہی ہے، (دیکھئے سیرت النبی ج ا ص ۴۳۰ و ۴۳۱) جب ایک مستند روایت موجود ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ ابن اسحٰق کی روایت پر بھروسہ کیا جائے جس میں الحرب خدعۃ کی آڑ میں ایک صحابی کی نسبت ایسی بات بیان کی گئی ہو جو اُن کی شان کے مناسب نہ ہو۔

بہر حال اس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کی نسبت یہ طے کر لیا کہ اب اُن سے درگذر کرنا سانپ کو دودھ پلانے کے ہم معنی ہوگا اور اُن کا قطعی فیصلہ کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے، آپ کو انتظار صرف اسی بات کا تھا کہ غزوۂ احزاب ختم ہو تو آپ اس طرف متوجہ ہوں۔ اور قدرت نے اس کا سامان کر دیا۔

قبائل کی ناکام واپسی محاصرہ جس قدر طویل ہوتا جاتا تھا قریش اور غطفان کے حوصلے پست ہوتے جاتے تھے، کیوں کہ خندق عبور کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی جو اُدھر کا رُخ کرتا مسلمان قدر اندازوں کے ہاتھوں منہ کی کھاتا تھا، سامانِ رسد کم ہوتا جا رہا تھا، مزید سپلائی کی امید نہ تھی، یہود کی شرکت سے مایوسی اور نا امیدی تھی، یہ سب کچھ تو تھا ہی کہ اچانک موسم بہت شدید ہو گیا، سردی غیر معمولی طور پر سخت تھی، آندھی بھی چلنے لگی، جس کے باعث اُن کے خیمے اُڑ گئے اور ہانڈیاں اُلٹ پلٹ ہو گئیں، گھوڑے تتر بتر ہو گئے اور ایک عجیب افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا، ابو سفیان ایک مرد جہاندیدہ و تجربہ کار تھا، یہ صورتِ حال دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ اب مزید توقف کرنا مرگ عام کو دعوت دینا ہے، اُس نے قریش کو خطاب کر کے کہا: لوگو! اب یہاں ٹھہرنا سخت نقصان کا باعث ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ روانہ ہو جاؤ اُس نے یہ کہا اور جھٹ اپنے اونٹ پر سوار ہو چل دیا، ساتھ ہی قریش اور غطفان روانہ ہو گئے، اس طرح مدینہ کا مطلع جو کم و بیش تین ہفتوں سے غبار آلود تھا یکایک صاف ہو گیا[1]۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ (احزاب)	اور اللہ نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا واپس اس حالت میں لوٹا دیا کہ اُن کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور اللہ نے مسلمانوں کو جنگ سے بچا لیا۔

---

[1] الاسماء ص ۱۸۸

قبائل کی ناکامی کے اسباب | دس ہزار کے ٹڈی دل فوج کا اس طرح ناکام ونامراد واپس ہوجانا دنیا کی تاریخ جنگ کا عجیب وغریب اور بڑا حیرت انگیز واقعہ ہے، پروفیسر مونٹگومری واٹ لکھتے ہیں: جنگی نقطۂ نظر سے قبائل کی ناکامیابی کا سبب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غیر معمولی جنگی تدبیر، اُن کا اعلیٰ درجہ کا جاسوسی اور خبر رسانی کا محکمہ اور مسلمانوں کی اعلیٰ تنظیم ہے، قریش کو اپنی سوار فوج کی وجہ سے کامیابی کا یقین تھا، وہ جانتے تھے کہ اسلامی فوج اس سے عہدہ برآنہ ہوسکے گی، لیکن ایک خندق کے حربہ نے اُن کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا اور اُن کے چھ سو گھوڑے ذرا اُن کے کام نہ آئے، علاوہ ازیں اہل مکہ کو ایک عظیم نقصان اس سے پہنچا کہ جب انھوں نے مدینہ پر چڑھائی کی ہے اُس سے ایک ماہ قبل ہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازراہِ دوراندیشی تمام فصلیں کٹوا لی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت تمام کھیت صاف تھے اور گھوڑوں کے لئے چارہ نہ تھا۔

پروفیسر موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں:

اس خالص فوجی اور جنگی نقطۂ نظر کے علاوہ غزوۂ احزاب کا جو نتیجہ ہوا اُس کا ایک بڑا سبب مسلمانوں کا اتفاق واتحاد اور اُن کا ڈسپلن اور نظم ونسق بھی تھا، پھر اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنو قریظہ کو شرکتِ جنگ سے الگ رکھ کر جس طرح جنوب میں ایک دوسرا محاذ جنگ نہیں کھلنے دیا وہ اُن کے اعلیٰ سیاسی تدبیر کی دلیل ہے[1]

بنو قریظہ کا محاصرہ | آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بروز چہار شنبہ ۲۳ ذیقعدہ ۵ھ غزوۂ احزاب سے واپس لوٹے اور چونکہ حی بن اخطب بنو قریظہ میں مقیم تھا اور وہ ایک عظیم فتنہ کا باعث ہوسکتا تھا اس بنا پر آپ فوراً بنو قریظہ کی طرف متوجہ ہو گئے، ابھی عصر کی نماز بھی ادا نہیں ہوئی تھی کہ آپ مجاہدین کی ایک جمعیت لے کر روانہ ہو لئے

---

[1] Mohammad in Madina P: 37 - 39

علمبرداری کا شرف حضرت علی کو عطا فرمایا گیا، اور مدینہ کی حفاظت اور نگرانی عبداللہ بن مکتوم کے سپرد ہوئی حضرت علی اور اُن کے ساتھیوں کا بنو قریظہ سے آمنا سامنا ہوا تو اُن لوگوں نے حضور کی شان میں سخت گستاخانہ الفاظ کہے، اتنے میں حضور بھی پہنچ گئے، آپ نے بنو قریظہ کو خطاب کر کے فرمایا، بدبختو! تم نے معاہدہ توڑ دیا ہے، خدا تم کو اس کی سزا دے گا۔ اب آپ نے حکم دیا کہ بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا جائے، کم و بیش تین ہفتے محاصرہ جاری رہا۔

بنو قریظہ کا خاتمہ: بنو قریظہ چاہتے تھے کہ قلعہ میں رہتے ہوئے حضور سے کوئی معاملہ طے کریں، لیکن آپ کو اصرار تھا کہ پہلے وہ قلعہ سے نکل کر اپنے آپ کو حضور کے سپرد کر دیں، پھر جو معاملہ مناسب ہوگا۔ وہ اُن کے ساتھ کیا جائے گا۔ چنانچہ مجبور ہو کر یہ لوگ قلعہ سے اتر آئے، اب اُن کے ساتھ معاملہ کیا ہو؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنو قریظہ کی خواہش کے مطابق حضرت سعد بن معاذ کو حَکَم مقرر کر دیا کہ وہ جو فیصلہ چاہیں کریں، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، حضرت سعد بن معاذ قبیلۂ اُوس سے تعلق رکھتے تھے اور یہ قبیلہ بنو قریظہ کا حلیف تھا، اس بنا پر بنو قریظہ حضرت سعد بن معاذ کے حکم بننے سے مسرور بھی تھے اور مطمئن بھی، بنو قریظہ پر حجت تمام کرنے کی غرض سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید یہ تجویز بھی کی کہ سعد بن معاذ کا جو فیصلہ ہو وہ توراۃ کے احکام کی روشنی میں ہو، حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ کیا کہ "بنو قریظہ میں جو بالغ مرد ہیں اُن کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور اُن کا مال و متاع تقسیم کر دیا جائے"، چوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے جلا وطن کرنے اور اس طرح اُن کو زندہ چھوڑ دینے کا انجام دیکھ چکے تھے اس بنا پر قرآن کے حکم اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ کے مطابق آپ کا ذاتی رجحان بھی ان لوگوں کا قصہ ہی پاک کر دینے کی طرف تھا اور اس کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن ہی نہ تھی، چنانچہ سعد بن معاذ نے جو فیصلہ دیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس

کی تصویب کی اور فرمایا: خدا کا فیصلہ بھی یہی ہے۔

اس فیصلہ کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ کے بازار کی جانب خندقیں کھودی گئیں اور وہاں لے جاکر بالغ مردوں کا سر قلم کر دیا گیا، حی بن اخطب اور کعب بن اسد بھی ان مقتولین میں شامل تھے، حی بن اخطب کو جب مقتل میں لایا گیا تو اُس نے حضور کی طرف دیکھا اور بولا: بخدا! مجھ کو اس کا افسوس نہیں ہے کہ میں نے تیرے ساتھ دشمنی کیوں کی، لیکن ہاں بات یہ ہے کہ خدا جس کو رسوا کرتا ہے وہ رسوا ہو ہی جاتا ہے، اس کے بعد وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا:۔

ایھا الناس: لاباس بامر اللہ کتابٌ وقدرٌ وملحمۃ کتبہا اللہ علی بنی اسرائیل[1]	اے لوگو! امر خداوندی کی تعمیل میں کوئی حرج نہیں ہے، یہی نوشتۂ تقدیر اور حکم الٰہی تھا اور یہ ایک پاداش عمل تھی جو اللہ نے بنو اسرائیل کے مقدر کی تھی۔

مقتولین میں ایک عورت بھی تھی، جس کا نام بُنانہ تھا اور الحکم القرظی (بعض کتابوں میں الحسن القرظی) کی بیوی تھی، اس کا جُرم یہ تھا کہ بنو قریظہ کے معرکہ میں اُس نے حضرت خلاد بن سوید پر قلعہ کے اوپر سے ایک چکی پھینک دی تھی جس سے وہ جاں بحق ہو گئے تھے[2] (باقی آئندہ)

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۵۲ [2] الدرر ص ۱۹۲

گزارش

خریداری بُرہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر نہ ہو، اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقع پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

عقیدہ عفتِ انبیاءؑ و ائمہؑ

(تاریخ کی روشنی میں)

(جناب سید محمود حسن صاحب قیصر امروہوی)

(۲)

اس آیت سے اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ اگر انبیاء سے گناہوں کا ارتکاب جائز قرار دیا جائے گا، تو وہ لامحالہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کو شیطان گمراہ کرتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کے مخلص بندے نہیں ہو سکتے۔

ہمارے خیال میں یہ استدلال اگر صحیح مانا جائے تو ان آیات کے متعلق کیا کہا جائیگا، جن میں انبیاءؑ کے اعمال سے شیطان کا تعلق دکھایا گیا ہے۔ خود جناب رسالتمآبؐ کے لئے قرآن کا بیان ہے:-

اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى۔ اے رسول! اگر شیطان تم کو بھلا دیا کرے تو یاد آنے کے بعد نہ بیٹھے رہو

معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کے مخلص بندوں کو شیطان سیدھے راستے سے نہیں ہٹا سکتا اور اس میں انبیاء یا ائمہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے اس لئے کہ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ وہ ہو سکتے ہیں جن پر شیطان قابو نہیں پا سکتا۔

۲۔ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ، قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؟ قَالَ ، لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ ۔ (اے ابراہیمؑ) میں تم کو انسانوں کے لئے امام بناؤنگا اس پر ابراہیم نے کہا میری ذریت میں سے؟ ارشاد ہوا۔ میرا منصب ظالموں کو نہیں مل سکتا۔

(البقرہ ۱۱۸)

اس آیت سے متکلمین شیعہ عصمت ائمہ پر اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ اگر ائمہ سے ارتکاب معاصی کو جائز قرار دیا جائے گا، تو بلاشبہ ان پر ظالم کا اطلاق ہوگا۔ حالانکہ آیت یہ بتاتی ہے کہ الٰہی منصب ظالمین کو نہیں مل سکتا۔ ان کے علاوہ اور بھی کچھ آیات ہیں۔ جن کو بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے علامہ محمد باقر مجلسی نے اپنی کتاب "حیات القلوب" میں اس پر مفصل بحث کی ہے، بلکہ اسکی تیسری جلد کو انھوں نے امامت اور عصمت ائمہ ہی کے لئے مخصوص کیا ہے اور اس کو امامیہ کے بنیادی عقائد میں شمار کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :- (۵)

"جاننا چاہئے کہ علماء امامیہ کا اس پر اجماع ہے کہ امام اپنی اول عمر سے آخر عمر تک صغیرہ یا کبیرہ ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کوئی گناہ نہ عمداً صادر ہوسکتا ہے، نہ سہواً نیز اس باب میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں کسی نے اختلاف نہیں کیا بجز ابن بابویہ اور انکے استاد ابن الولید کے، جو تبلیغ رسالت اور احکام الٰہی کی تلقین کے علاوہ دیگر امور میں ان کے لئے سہو و نسیان کو جائز قرار دیتے ہیں مثلاً سہو فی الصلوۃ وغیرہ۔ نیز یہ کہ تمام فرق امامیہ سوائے اسماعیلیہ، عصمت ائمہ کے لئے کسی شرط کو تجویز نہیں کرتے"

اس کے بعد اس عقیدے کے اثبات میں انھوں نے کچھ احادیث بھی نقل کی ہیں، لیکن ان میں زیادہ وہ احادیث ہیں جن کا سلسلۂ روایت امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ اس مقام پر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عصمت ائمہ جیسے بنیادی عقیدے کو ثابت کرنے کے لئے متکلمین شیعہ اقوال رسولؐ یا اقوال امیر المومنینؓ سے کوئی قول نقل نہیں کر سکے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو کوئی چیز اپنے مقصد کی تائید میں نہیں مل سکی۔

جہاں تک قرآنی آیات سے عصمت ائمہ پر استدلال کا تعلق ہے، تو اس کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اگر پہلے سے ائمہ کی عصمت کا تصور ذہن میں نہ ہو تو تنہا ان آیات سے ذہن اس معنی کی طرف رجوع نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے ان آیات کے تحت رسول اللہؐ

(۵) حیات القلوب - ج ۳، ص ۲۷

صلعم کا کوئی قول ضرور ملتا یا کم از کم صحابۂ رسول میں عبداللہ بن عباس، حضرت علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل رض وغیرہ ہی کا کوئی قول ملتا۔ یہ وہ صحابی ہیں جو علم بالقرآن کے ماہر تھے اور جن کے اقوال تقریباً ہر آیت کے ذیل میں ملتے ہیں لیکن مذکورہ بالا آیات کے تحت ایسا کوئی قول ان کا بھی نہیں ملتا جس سے عصمت انبیاء کا مفہوم نکلتا ہو یا عصمت انبیاء و ائمہ کے اثبات میں اس کو پیش کیا جا سکے۔ اس سلسلے کی سب سے مشہور آیت وہ ہے، جو اوپر نقل کی گئی ہے، اور جس میں ابراہیم کو امام بنانے کا ذکر ہے۔ اس کے تحت حضرت ابن عباس کا یہ قول ہے:-

لا عهد لظالم عليك في ظلمه ان تطيعه ليس للظالمين عهد وان عاهدته فانقضه	(ظالم کے لئے اس کے ظلم میں تمہارے اوپر کوئی عہد نہیں ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو، ظالموں کے لئے کوئی عہد ہی نہیں ہے اگر تم اس سے معاہدہ بھی کر لو تو اس کو توڑ دو)

مجاہد اور عکرمہ کا قول ہے:- لا يكون امام ظالماً۔ (امام ظالم نہیں ہوتا) (۵)

علامہ طبرسی (متوفی ۵۴۸ھ) نے اس آیت کی دل کھول کر تفسیر کی ہے لیکن امیر المؤمنین یا کسی بھی دوسرے صحابی کا کوئی قول ایسا نقل نہیں کر سکے جو عصمت ائمہ پر دلالت کرتا ہو بلکہ مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"واستدل اصحابنا بهذه الآية على ان الامام لا يكون الا معصوماً عن القبائح"

(ہمارے اصحاب نے اس آیت سے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ امام قبائح سے معصوم ہوتا ہے)

(۳) اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔	یقیناً اللہ کا ارادہ ہے یا اللہ یہ چاہتا ہے کہ اے اہلبیت! تم سے اللہ ہر قسم کے رجس کو دور کر دے

---

(۵) تفسیر طبری ج ۳ ص ۲۰ - ۲۲

اور تم کو اس طرح پاک بنادے جو پاک بنانیکا حق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس آیت سے کچھ افراد کی عصمت کی طرف بطور پر ذہن منتقل ہو سکتا ہے اسلئے کہ عصمت کی تعبیر اس سے بہتر الفاظ میں ممکن نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ چند امور اس سلسلے میں یقیناً قابل غور ہیں۔

۱۔ آیت میں واضح طور پر لفظ "اہل بیت" آیا ہے اس لئے ائمہ کی عصمت کے لئے اس کو دلیل میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔

۲۔ یہ آیت ازواج پیغمبرؐ کے تذکرے میں وارد ہوئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ عرف عام اور خود قرآن کی زبان میں بھی اہل بیت کے دائرے میں بیٹی، داماد اور نواسوں کے ساتھ بیویاں بھی داخل ہیں۔ آیت میں چونکہ لفظ "اہل بیت" اپنی عام شکل میں وارد ہوا ہے، اس لئے جب تک حدیث یا تاریخ یا کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تخصیص نہ ہو۔ اس وقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے مراد اہل بیت کے کون افراد ہیں۔

۳۔ آیت میں مضارع کا صیغہ ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں: اے اہلبیت! اللہ کا ارادہ ہے یا اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کے رجس کو دور کردے اور تم کو اس طرح پاک بنادے جو پاک بنانے حق ہے۔ گویا عمل تطہیر ابھی واقع نہیں ہوا ہے، اس کے برخلاف حضرت مریم کے سلسلے میں جو آیت ہے وہ ماضی کے صیغے کے ساتھ ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ۝	(جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے تم کو چن لیا اور پاک کردیا اور تمام عالموں کی عورتوں پر تم کو برگزیدہ قرار دیا)

لہٰذا صیغے کے بدل جانے کے ساتھ ساتھ ان دونوں آیات میں معانی کے لحاظ سے بھی فرق کرنا پڑیگا اور وہ فرق ظاہر ہے کہ مریم کی عصمت وطہارت تنہا آیت سے ثابت ہو سکتی ہے لیکن اہل بیت کی تطہیر کے لئے کوئی تکمیلی عمل درکار ہے۔

اسکے لئے جب ہم احادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہ تینوں مسئلے حل ہوجاتے ہیں ۔ چنانچہ اس آیت کی شان نزول کے بارے میں تمام مفسرین یہ لکھتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن، امام حسین علیہما السلام کو اپنی چادر میں لے کر فرمایا "اللّٰھم ھٰؤلاء اَھلُ بَیتی، فاذھب عنھم الرجس وَطَھِّرھُم تَطھِیراً" ۔ بارالہا! یہ میرے اہل بیت ہیں تو ان سے رجس کو دور کردے اور ان کو ایسا پاک بنادے جو پاک بنانے کا حق ہے

روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت ام سلمہؓ زوجہ رسول نے بھی چادر میں آنے کی خواہش کی تھی لیکن آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا "اَنتِ عَلی الخَیرِ" (تم نیکی پر ہو) اس حدیث سے اولاً افراد اہلبیت کی تعیین ہوجاتی ہے اور وہ صرف اصحاب کساء ہیں ۔ ثانیاً چونکہ رسول اللہؐ نے ان کو چادر میں لے کر پاک و پاکیزہ بنانے کی دعا بھی فرمائی لہذا آیت کے ساتھ دعائے رسول کا ضمیمہ معصیت کے لئے تکمیل عمل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ لیکن ان کے علاوہ بقیہ نو اماموں کی عصمت کا مسئلہ اپنے مقام پر باقی ہے جب تک کوئی ایسی ہی نص ان کے لئے بھی نہ ہو ۔ غالباً یہی وجہ ہے ۔ امام زید بن علی بن الحسین صرف اصحاب کساء کی عصمت کے قائل تھے اور امام کے لئے وہ عصمت کو ضروری نہیں سمجھتے تھے ۔

حقیقت یہ ہے کہ شیعوں میں عقیدۂ عصمت کا نشو و نما، جیسا کہ احادیث سے واضح ہوتا ہے ، امام حسین کی شہادت کے بعد سے امام منتظر کی غیبت تک کی درمیانی مدت میں ہوا ہے ۔ چنانچہ علامہ محمد باقر مجلسی کے بیان کے مطابق محمد بن یعقوب کلینی اور شیخ مفید، ہر دو محدثین نے مذکورہ بالا آیت "اِنّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً ۔ ۔ ۔ ۔" کی تفسیر کو امام جعفر صادق علیہ السلام (متوفی ۷۶۵ء) کی طرف منسوب کیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو امام بنانے کے لئے ان کے معصوم ہونے کو ثابت کرتی ہے ۔ اور آخر میں اس قول کا بھی اضافہ کیا ہے : "لا یکونُ الفاسق اماماً للصالحین" (فاسق صالحین کا امام نہیں ہوسکتا) اور چونکہ کلینی ، شیخ مفید ، ابن بابویہ ، شیخ صدوق ، ان شیعہ

محدثین میں تھے جن کا زمانہ بوہییں کے عروج کا زمانہ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں میں عقیدۂ عصمت انبیا وائمہ اسی دور میں نمو پذیر ہوا ہے۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی کتاب "تبصرۃ العوام" میں بھی اس عقیدے کا ذکر ملتا ہے، لیکن ان کا زمانہ بھی بالکل اسی سے متصل ہے۔

اس کے بعد جہاں تک کتب اہل سنت کا تعلق ہے، تو صحاح ستہ میں بھی کوئی حدیث عصمت انبیاء کے بارے میں نہیں ملتی بلکہ ان کتابوں کی تدوین کے بہت بعد دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں فقہ اکبر ثانی میں پہلی بار اس عقیدے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ کتاب بھی جیسا کہ معلوم ہے، کلینی کی کتاب "الکافی" کے بعد تصنیف ہوئی ہے بایں ہمہ امام غزالی اس کے قائل نظر نہیں آتے، جیسا کہ ان کے حسب ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

اما بیان وجوبها (ای التوبة) علی الدوام وفی کل حال، فهو أن کل بشر لا یخلو من المعصیة لم یخل عنها الانبیاء، کما ورد فی القرآن، والاخبار عن خطایا الانبیاء وتوبتهم وبکائهم علی خطایاهم فان خلا فی بعض الاحوال عن معصیة الجوارح فلا یخلو عن الهم بالذنو بالقلب، فان خلا عنها فلا یخلو عن غفلة وقصور فی العلم بالله وصفاته وافعاله، وکل ذلك	لیکن ہمیشہ اور ہر حال میں توبہ کے واجب ہونے کا بیان، وہ یہ ہے کہ کوئی بشر معصیت سے مبرا نہیں ہے حتیٰ کہ انبیا بھی اس سے خالی نہیں ہیں، جیسا کہ قرآن اور احادیث میں انبیاء کی خطاؤں، ان کی توبہ اور اپنی خطاؤں پر انکے گریہ کا بیان ہے۔ پس اگر بعض حالات میں وہ اعضاء وجوارح کی معصیت سے خالی ہوتے ہیں تو کم از کم دل میں ارادۂ گناہ سے خالی نہیں ہوتے اور اگر یہ بھی نہیں تو غفلت اور اللہ اور اس کی صفات اور افعال میں کوتاہی علم سے خالی نہیں ہوتے۔ اور یہ سب کچھ نقص میں شامل ہے..... اسی آنحضرت صلعم نے فرمایا "وہ (اللہ) میرے

نقص... ولھذا قال علیہ السلام "انہ لیغان علی قلبی حتی استغفر اللہ فی الیوم واللیلۃ سبعین مرۃ" الحدیث ولذلک اکرمہ اللہ تعالیٰ بان قال "لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر" واذا کان ھذا حالہ فکیف حال غیرہ۔ (۶)

قلب پر معاونت کرتا ہے، یہاں تک کہ میں دن اور رات میں ستر مرتبہ استغفار کروں۔ اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ آپ کو سرفراز فرمایا "تاکہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے سب گناہ بخش دیئے" جب خود آنحضرت کا یہ حال ہے تو آپ کے غیر کے لئے کیا کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

غزالی کے تقریباً ایک سو سال بعد فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ ظاہر ہوئے، جن کا شمار مشاہیر علمائے اہل سنت میں ہوتا ہے۔ نیز جیسا کہ گولڈ زیہر (Goldziher) کا بیان ہے، وہ عصمت انبیاء کے شدت کے ساتھ قائل تھے۔ قطع نظر ان کی تفسیر کے جس میں انھوں نے متعدد مقامات پر اس پر بحث کی ہے، ایک مستقل رسالہ "عصمۃ الانبیا" کے نام سے تصنیف کیا ہے، جس میں انھوں نے الگ الگ ہر پیغمبر کو لیا ہے۔ نیز قرآن اور احادیث میں جس قدر اقوال ان کے مسلک کے منافی وارد ہوئے ہیں، ان سب کی تاویل کی ہے۔ حالانکہ اپنے پیشرو امام غزالی کی طرح وہ خود شافعی تھے اور ان ہی کی طرح صوفی افکار سے بھی متاثر تھے ان حقائق کی روشنی میں ہر شخص اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ عقیدہ عصمت انبیاء و ائمہ خالص شیعی عقیدہ ہے۔ جو تصوف کی وساطت سے عامہ اہل سنت میں منتقل ہوا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان عقائد کا بیشتر حصہ جو سنیوں سے شیعوں کی طرف اور شیعوں سے سنیوں کی طرف منتقل ہوا، ان کا تنہا واسطہ ابتدا میں صوفیا تھے، اس کے بعد معتزلہ۔ مثال کے طور پر شعرانی

---

(۶) احیاء العلوم (۴/۵-۶)

جن کا شمار مشاہیر متصوفہ میں ہوتا ہے اور جو رازی سے دو سو سال قبل گذرے ہیں، کا قول ہے :

ان رسول اللّٰہ لیری من خلفہم مثل مایری من امامہم ویبصر فی الظلام و یغایر طولہ کیفما اراد، ولیس لجسمہ ظل لانہ ممتلی بالنور

رسول اللّٰہ اپنے پیچھے کی چیزوں کو بھی اسی طرح دیکھتے تھے، جس طرح سامنے کی چیزوں کو۔ آپؐ اندھیرے میں بھی دیکھتے تھے اور اپنے طول قامت میں جس طرح چاہتے تھے تبدیلی کر لیتے تھے آپؐ کے جسم کا سایہ نہ تھا اس لئے کہ وہ نور ہی نور تھا

غرضیکہ اس قسم کے بہت سے شیعی، عقائد ہیں جو تصوف کی وساطت سے عامہ اہل سنت کے معتقدات میں داخل ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے تمام صفات شیعوں کے یہاں ائمہ اہل بیت کے لئے ملتے ہیں جو خود ان ہی ائمہ سے مروی ہیں اس لئے کہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ رئیس اہل بیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایسے صفات تجویز کئے جائیں، چنانچہ شیعی کتب احادیث کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان میں ائمہ اہل بیت کے لئے حسب ذیل صفات ملتے ہیں۔

(۱) ائمہ پر بندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں۔

(۲) ائمہ تمام انبیاء و اولیاء اور رسول اللّٰہؐ کے علم کے وارث ہوتے ہیں۔

(۳) ائمہ کو یہ علم ہوتا ہے کہ وہ کب مریں گے۔

(۴) ائمہ اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔

(۵) ائمہ وہ علامات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے "وعلامات وبالنجم ھم یھتدون"

(۶) ائمہ کے پاس وہ تمام کتابیں ہیں جو اللّٰہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور اختلاف السنہ کے باوجود وہ ان کو سمجھتے ہیں۔

(۷) ائمہ ان تمام علوم کے حامل ہیں جو ملائکہ اور انبیاء و رسل کو دیے گئے تھے

(۸) فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" میں ذکر سے مراد رسول اللہ اور اہل سے مراد ائمہ اہل بیت ہیں۔

(۹) قرآن مجید میں علم سے جس کو بھی متصف کیا گیا ہے، اس سے مراد صرف ائمہ اہل بیت ہیں۔

(۱۰) ائمہ کو غیب کا علم ہوتا ہے۔

(۱۱) ائمہ علم ما کان و ما یکون کے عالم تھے اور ان پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔(۷)

مذکورہ بالا احادیث کو جب ہم قرآن کے بیانات کے مقابلے میں رکھتے ہیں تو دونوں میں بالکل تضاد نظر آتا ہے۔ قرآن میں بار بار رسول کو "بشر" کہا گیا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے: انا بشر مثلکم یوحی الی (میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے) کبھی کہا جاتا ہے "قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا (اے رسول! کہدو کہ میرا رب پاک ہے میں تو صرف ایک بشر ہوں) ان آیات کی روشنی میں امام شعرانی نے رسول اللہ کے لئے جو صفات تجویز کئے ہیں، اگر ان کو صحیح مانا جائے تو رسول اللہ بالکل ایک مافوق البشر مخلوق قرار پاتے ہیں یا معاذ اللہ ایک جادوگر جو اپنے طول قامت میں حسب خواہش تبدیلی کر لیا کرتے تھے جس کے بعد ان آیات کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔ اسی طرح ائمہ کے لئے جن صفات کی اوپر فہرست دی گئی ہے، وہ سب وہ صفات ہیں، جن کی قرآن مجید خود رسول اللہ کی ذات گرامی سے بھی نفی کر رہا ہے۔ جیسا کہ حسب ذیل آیات سے معلوم ہوگا۔

(۱) قل لا املک لنفسی نفعا ولا ضرا الا ما شاء اللہ ولو کنت اعلم — اے رسول کہدو! کہ میں اپنے نفس کے لئے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں

---

(۷) تفصیل کے لئے دیکھئے اصول الکافی کتاب الحجۃ۔

الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسّنی السّوء ان انا الا نذیر وّبشیر

(الاعراف ۱۸۸)

بجز اس کے جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت خیر جمع کر لیتا اور کوئی نقصان مجھ کو نہ چھوتا۔ میں تو صرف ڈرانیوالا اور بشارت دینے والا ہوں۔

(۲) قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحی الیّ

(الانعام)

اے رسول! آپ کہہ دیں: میں تم سے یہ تو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ مجھے غیب ہی کا علم ہے نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو بس اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے اوپر آتی ہے۔

(۳) یسئلونک عن الساعۃ ایّان مرسٰھا۔ قل انما علمھا عند ربّی

(الاعراف)

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ کب واقع ہوگی۔ آپ کہہ دیں کہ اس کا علم تو میرے پالنے والے ہی کے پاس ہے۔

(۴) یسئلونک کانّک حفیّ عنھا قل انما علمھا عند اللہ

(الاعراف)

یہ لوگ آپ سے اس طرح سوال کرتے ہیں گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔

منافقین جو گروہ در گروہ مدینے میں آباد تھے، ان کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

(۵) لا تعلمھم نحن نعلمھم

اے رسول! آپ ان سے واقف نہیں ان سے ہم واقف ہیں۔

(۶) ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ٥

(اے رسول!) آپ تو یہ بھی نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔

وغیرہ، غرضیکہ اس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن سے اس قسم کے تمام صفات کی حضرت ختمی مرتبت سے نفی فرمائی گئی ہے جو شیعوں کے یہاں ائمہ اہل بیت کے لئے ان کی کتب احادیث میں ملتی ہیں۔

بہرحال امام رازی کی تحریروں کا یہ اثر ہوا کہ عقیدہ عصمت انبیاء کو اجماع اہل سنت کے ساتھ قبول کرلیا گیا۔ نیز معتزلہ نے گناہان کبیرہ اور صغیرہ کے درمیان امتیاز کو چھوڑ دیا اور رازی کے قول کے مطابق اکثر معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ انبیاء سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب تو جائز نہیں، البتہ کبھی کبھی ان سے صغائر کا ارتکاب ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ قبیح کی حد میں نہ ہوں۔

پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس

اور

میرے مشاہدات و تاثرات

(۱)

سعید احمد اکبر آبادی

پاکستان کی بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ یوں تو ہندوستان میں متعدد اصحاب کے نام آیا تھا لیکن شریک ہم چار اشخاص ہی ہو سکے میں سب سے پہلے یعنی ۴ رمارچ کو ہی پہنچ گیا تھا، جناب حکیم عبد الحمید صاحب مع بیگم صاحبہ کے ۸ر کو لاہور پہنچے اور اس تاریخ سے آخر تک برابر شریک رہے، مولانا قاری محمد طیب صاحب اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب علی الترتیب ۹ رکو پہنچے اور صرف کراچی کے جلسوں میں شرکت کر سکے، دوسرے حضرات کی طرح مجھ کو دعوت نامہ جنوری کی شروع تاریخوں میں ہی مل گیا تھا، پاسپورٹ میرے پاس پہلے سے موجود تھا، وہاں جانے کے لئے گورنمنٹ کی اجازت ضروری تھی، اس لئے ایک طرف گورنمنٹ کو اس دعوت نامہ کی اطلاع دے دی گئی اور دوسری طرف دعوت نامہ کی منظوری اور اس سلسلہ کے دوسرے مطلوبہ کاغذات سوئس امبسی کی معرفت پاکستان بھیج کر میں اطمینان سے بیٹھ گیا کہ اب

اگر وزا آتا ہے تو جاؤں گا ورنہ نہیں، میں نے خود وزا کی درخواست نہیں دی۔

روانگی | دن گذرتے جار ہے تھے لیکن وزا کی کوئی خیر خبر نہیں تھی، جب کانفرنس کے شروع ہونے کی تاریخ سر پر ہی آگئی تو بعض دوستوں نے کہا کہ مجھ کو دعوت نامہ کی منظوری کے ساتھ ہی وزا کی درخواست کا فارم خانہ پری کر کے بھیجنا چاہئے تھا، اگر اسے نہیں بھیجا ہے تو پھر وزا کیسا؟ مگر میں کہتا تھا کہ ہر داعی ملک کا فرض ہے کہ از خود وزا بھیجے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، یکم مارچ کو سوئز ایمبسی نے اچانک مطلع کیا کہ وزا آگیا ہے، میں چار بجے کے بعد وہاں پہنچا اور فارم کی رسمی خانہ پری کے بعد اسے لے آیا، دوسرے دن یعنی ۲ رمارچ کو میں نے ہر چند کوشش کی کہ فرنٹیر میل میں رزرویشن مل جاتے لیکن ۷ رمارچ سے پہلے اس کا امکان نہ تھا، آخر ۳ رمارچ کو نظام الدین ریلوے اسٹیشن سے بارہ بجے دن کے ایک بہت تیز رفتار اور آرام دہ ٹرین امرتسر فلائنگ میل کے نام سے چلنے لگی ہے، میں اللہ کا نام لے کر اس سے روانہ ہوگیا، نئی دہلی کے اسٹیشن پر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولوی عبد الحی صاحب فاروقی اور میرے بچوں نے الوداع کہا، سفر میں سامان ہمیشہ بہت ہلکا پھلکا رکھتا ہوں، کھانے کا وقت ہوا تو کسی اسٹیشن پر کچھ پھل خرید کر گذارہ کرلیا، ٹرین ٹھیک ۹ بجے امرتسر پہنچ گئی، پلیٹ فارم پر اتر کر ارادہ کیا کہ ریلوے ریٹائرنگ روم چلوں۔ مگر معلوم ہوا کہ وہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے، اس اس لئے اسٹیشن سے متصل ہی بیلیس نام کا ایک وسیع اور کشادہ ہوٹل ہے وہاں چلا گیا اور اور ایک کمرہ لے کر مقیم ہوگیا۔

بورڈر | شب بھر آرام سے سویا، صبح اٹھ کر اپنے معمولات پورے کئے، ناشتہ سے فارغ ہوا اخبار پڑھا، جو کتاب ساتھ تھی اس کا مطالعہ کیا اور (دفتر برہان میں جو کتابیں برائے تبصرہ آتی ہیں میں ان کا مطالعہ عموماً سفر میں کرتا ہوں) نو بجے ایک ٹیکسی لے کر بورڈر پہنچا، خیال تھا کہ میں سابقین اولین میں سے ہوں گا۔ مگر یہاں دیکھا مسافروں کا کافی ہجوم ہے اور ان میں اکثریت افغانستان جانے والوں کی ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ساز و سامان کا

انبار ہے" میں اپنا پاسپورٹ حوالہ کر کے کسٹم کے انتظار میں باہر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹہ تک انتظار کرنے پر بھی جب میری باری نہیں آئی تو میں اندر گیا اور کسٹم آفیسر سے جو ایک شریف اور ہمدرد سکھ تھے گفتگو کی، انھوں نے فوراً مسکرا کے کہا: "بہت اچھا! سامان لے آیئے" میرا سامان ہی کیا تھا ایک سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ، قلی نے اٹھا کر اُن کے سامنے رکھ دیا، انھوں نے دونوں پر ایک نگاہ ڈالی اور کسی عدد کو کھلوائے بغیر اسے پاس کر دیا، میں اُن کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہوا اور ارضِ غیر مملکتی (No man's Land) میں سے گذرتا ہوا پاکستانی بورڈر میں داخل ہوا، یہاں سب سے پہلے سابقہ ہیلتھ سکشن سے ہوا، افسر متعلقہ نے کہا: ہیلتھ سرٹیفکٹ دکھایئے" میں نے کہا: جلدی میں چلا ہوں، اس لئے حاصل نہ کر سکا" اُس نے منہ بنا کر کہا: تو آپ واپس جایئے، سرٹیفکٹ کے بغیر تو کوئی یہاں سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا" میں نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا، بہت بہتر ہے، میں ابھی واپس جاتا ہوں لیکن آپ میرا یہ پیغام مولانا کوثر نیازی کو پہنچا دیں کہ میں اُن کی دعوت پر یہاں تک آیا تھا اور اب تندرستی کا سرٹیفکٹ نہ ہونے کے باعث واپس بھیجا جا رہا ہوں' میری طرف سے معذرت!" موصوف نے یہ سن کر فوراً کہا: اچھا! تو اب آپ تشریف لے جائیں" میں نے شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھا اور

مسٹر غلام محی الدین جابری | اُس عمارت میں داخل ہوا جہاں کسٹم وغیرہ کے بہت سے دفاتر ہیں اور جہاں پاسپورٹ کی جانچ ہوتی ہے وہاں جا کر پاسپورٹ حوالہ کیا، افسر متعلقہ دوسرے لوگوں کے پاسپورٹ دیکھ دیکھ کر واپس کر رہے تھے، لیکن انھوں نے میرا پاسپورٹ واپس نہیں کیا اور کسٹم کے ہال میں انتظار کرنے کو کہا، میں ابھی ہال میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ اچانک وجیہ، خوش وضع، اعلیٰ درجہ کے سوٹ میں ملبوس ایک صاحب ہال میں داخل ہو کر میری طرف بڑھے اور بڑے تپاک سے" السلام علیکم! مولانا! کہہ کر مصافحہ کیا اور مجھے ساتھ لے کر دفتر میں آ گئے، دفتر میں داخل ہوتے وقت میں نے اُن کے نام کی پلیٹ پر نگاہ ڈالی تو معلوم

ہوا کہ ان کا نام مسٹر غلام محی الدین صابری ہے اور کسٹم کے افسر اعلیٰ ہیں، کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد جب گفتگو شروع ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ وہ مشرقی یوپی کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی پیدائش وہیں کی ہے، علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں، انھوں نے کہا: میرے آپ سے دو رشتے ہیں ایک یہ کہ میں آپ کا برہان عرصہ سے پڑھ رہا ہوں، آپ کی متعدد کتابیں بھی پڑھی ہیں اور ریڈیو پر آپ کی جو تقریریں ہوتی رہی ہیں وہ سب سُنی ہیں، اور دوسرا رشتہ یہ ہے کہ آپ کے داماد اسلم (پروفیسر پنجاب یونیورسٹی لاہور) میرے عزیز دوست ہیں: اس وقت یہاں چند اور اصحاب بھی بیٹھے ہوئے تھے، صابری صاحب نے میرا اُن سے تعارف کرایا تھا۔ اُن میں ایک صاحب چودھری برکت علی تھے جو غیر ملکی ڈاک (Foreign post.) کے سپرنٹنڈنٹ ہیں، انھوں نے اپنا کارڈ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ میرا تعلق اسی محکمہ سے ہے جس کے ذریعہ آپ کا برہان اور ہندوستان کے دوسرے اخبارات و رسائل پاکستان پہنچتے ہیں اور آپ نے ابھی صابری صاحب سے شکایت کی ہے کہ برہان نہیں معلوم کیوں پاکستان نہیں پہنچ رہا ہے، اس لئے میں اس مسئلہ کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ "میں نے کہا، فرمائیے" وہ بولے کہ ایک عرصہ کے تعطل کے بعد جب ہندوستان اور پاکستان میں اخبارات و رسائل اور کتابوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوا تو بعض لوگوں نے اس کا ناجائز فائدہ حاصل کرنا شروع کر دیا مثلاً اس آڑ میں فلمیں وغیرہ اسمگل کرنے لگے، جب ہمارے علم میں یہ بات آئی تو ہم نے ڈاک روکنی شروع کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ چند مہینوں میں اخبارات و رسائل کے انبار لگ گئے اور ہمارے کئی کمرے ان سے اَٹ گئے، اب ہم نے گورنمنٹ کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا تو ابھی پچھلے دنوں وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے حکم خاص ہم کو بھیجا ہے کہ ڈاک کی آمد و رفت حسب سابق جاری کر دی جائے، چنانچہ میرا محکمہ اس پر تیزی سے عمل کر رہا ہے اور مہینوں کی رکی ہوئی ڈاک کو سرانجام دینے کے لئے ہمیں عملہ میں عارضی طور پر کچھ اضافہ بھی کرنا پڑا ہے، چودھری صاحب نے یہ داستان سنانے کے بعد مجھ کو یقین دلایا کہ اب کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی

آپ اطمینان رکھیں، میں نے چودھری صاحب سے ملاقات پر اظہار مسرت اور حسن بے تکلفی اور کرم گستری سے انھوں نے گفتگو کی تھی اُس کا شکریہ ادا کیا اتنے میں کافی مع اپنے لوازم کے آگئی اور ہم نے اس سے شغل کیا۔

لاہور میں | اب صرف مرحلہ ایک یہ باقی رہ گیا تھا کہ لاہور کس طرح پہنچنا ہوگا، کیوں کہ روا روی میں چلنے کے باعث میں کسی کو کوئی اطلاع نہیں دے سکا تھا صابری صاحب نے میاں اسلم کو ٹیلیفون بھی کیا مگر وہ کلاس روم میں تھے اس لئے بات نہ ہو سکی لیکن کارساز مطلق کی کارسازی کے قربان جائیے کہ آج صبح جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنے برادر خورد حکیم محمد سعید صاحب، جو اس وقت اسلام آباد میں تھے اُن سے ٹیلیفون پر گفتگو کی اور اسی میں از راہِ کرم اُن کو میرے پہنچنے کی اطلاع بھی دے دی۔ اب حکیم محمد سعید صاحب نے فوراً اپنے ہمدرد آفس، لاہور کو ٹیلیفون کیا اور میرے لئے بورڈر پر کار بھیجنے کا حکم دیا، چنانچہ صابری صاحب نے ابھی ٹیلیفون ہاتھ سے رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجی اور ہمدرد آفس نے کار بھیجنے کی اطلاع دی، تھوڑی دیر میں ہمدرد آفس کے ایک نہایت شائستہ و بائستہ افسر جناب اصغر خان صاحب کار لے کر پہنچ گئے اور میں صابری صاحب کی عنایات و الطاف کا شکریہ ادا کرکے اور اُن سے رخصت ہو کر لاہور کے لئے روانہ ہوا، پہلے سیدھا ہمدرد آفس آیا جو مال روڈ پر ایک شان دار بلڈنگ میں قائم ہے، یہاں جناب اشرف صبوحی صاحب اور عملہ کے دوسرے اصحاب منتظر تھے اُن سے ملاقات ہوئی، اشرف صبوحی صاحب میرے دیرینہ عزیز دوست ہیں، دلی کی بیگماتی اور ٹکسالی زبان کے ماہر اور اس سلسلہ میں کئی کتابوں اور درجنوں مقالات کے مصنف ہیں، بے حد بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہیں، بات بات میں لطائف و ظرائف کہتے ہیں ایک عرصہ کے بعد اُن سے اور ہمدرد آفس کے دوسرے احباب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اگر میں چاہتا تو اسی وقت اسلام آباد جا سکتا تھا، لیکن اس خیال سے کہ وہاں مقالات کی نشست تو ختم ہو گئی ہوگی اور کل سے کانفرنس لاہور میں ہو رہی ہے، میں نے لاہور میں ہی ٹھہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اب میں ہمدرد کی ہی کار میں سمن آباد اپنی بچی کے یہاں گیا

(اہلیہ ڈاکٹر محمد اسلم) کے گھر آیا، بلا اطلاع کے اچانک پہنچ جانے سے سب کو بے حد خوشی ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد میاں اسلم بھی یونیورسٹی سے آ گئے،

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی | کھانا کھا کر ابھی فراغت ہی ہوئی تھی کہ مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی تشریف لے آئے، مولانا نہایت وسیع النظر عالم اور بلند پایہ مصنف ہیں ان کا شمار آزاد خیال علما میں ہوتا ہے، کسی کو ان کے افکار سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ لکھتے تحقیق سے اور حوالہ سے لکھتے ہیں، پھر بڑی بات یہ ہے کہ معلومات مستحضر ہیں اس لئے گفتگو بھی مدلل کرتے ہیں، اُردو زبان کے نامور ادیب ہیں، ایک عرصہ تک ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور سے وابستہ رہے، اب اس سے سبکدوش ہو کر کراچی منتقل ہو گئے ہیں، مجھ سے ان کو دیرینہ اخلاص و محبت کا تعلق ہے، یہی وجہ ہے کہ جونہی ان کو میری آمد کی اطلاع ہوئی ازراہِ کرم فوراً تشریف لے آئے مولانا کی گفتگو ہمیشہ علمی ہوتی ہے، آج کل پاکستان میں شیعہ اور سُنّی تنازعہ اور کشمکش بہت زوروں پر ہے اور اس سلسلہ میں سنّیوں کی طرف سے عدالت میں ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے، اثنائے گفتگو میں اس کا ذکر آ گیا تو مولانا نے اس کشمکش کے مذہبی اور تاریخی اسباب پر مختصر مگر جامع اور مدلل تقریر کی اور تھوڑی بہت جو کسر رہ گئی تھی اُس کو میاں اسلم کی عالمانہ اور فاضلانہ تقریر نے پورا کر دیا، میں دونوں کی تقریریں خاموشی سے سُنتا رہا لیکن اُمّتِ مرحومہ کی حالتِ زار اور مستقبل کے اندیشوں کے خیال سے دِل خون کے آنسو رو رہا تھا مگر کیا کیجئے، خدا کی حکمتیں خدا ہی جانتا ہے، آج یہ نئی بات نہیں، پوری تاریخ اسلام میں یہ بلکہ اس سے بھی عظیم فتنے ہر دور میں برپا رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ اَعاذنا اللہ عنہا۔

شام ہمدرد | یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ۳ ½ بج گئے، میاں اسلم نے کہا کہ چار بجے شام ہمدرد ہے اُس میں جانا ہے شام ہمدرد کے نام سے ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے ایک نہایت مفید علمی اور ادبی مجلس کا سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے، یہ مجلس باری باری سے ہر ہفتہ کراچی، پشاور، اسلام آباد اور لاہور میں بڑے اہتمام و انتظام سے مقامی انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل

میں منعقد ہوتی ہے، پروگرام یہ ہوتا ہے کہ پہلے سے مقرر کئے ہوئے عنوان پر کسی ماہر فن اور اسکالر کا مقالہ ہوتا ہے اس کے بعد اُس پر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور پھر نہایت پرتکلف چائے اور اُس کے لوازمات سے شرکائے مجلس کی تواضع ہوتی ہے، کم وبیش ڈیڑھ سو دو سو ارباب علم اور اصحاب ذوق مدعو ہوتے ہیں مقالہ یا تقریر کا موضوع عموماً اسلامی اور علمی ہوتا ہے، حکیم محمد سعید صاحب اگر پاکستان میں ہوتے ہیں تو شہر بشہر ہر مجلس میں خود شریک ہوتے، بلکہ اُس روز صبح سے شام تک وہاں مطب بھی کرتے ہیں جس سے ہزاروں بندگان خدا کو فائدہ ہوتا ہے۔

مولانا سے رخصت ہو کر میں اور میاں اسلم ایک دوست کی کار میں انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل پہنچے (یہی وہ ہوٹل ہے جس میں سیرت کانفرنس کے سب مندوبین اسلام آباد سے آکر مقیم ہونے والے تھے اور کانفرنس بھی اس کے ایک ہال میں منعقد ہونے والی تھی) میں ۶۹ء میں جب پاکستان آیا تھا اُس وقت بھی لاہور اور کراچی کی شام ہمدرد میں شریک ہوا تھا، آج یہ تیسرا موقع تھا، ہال میں داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید سے آنکھیں دوچار ہوئیں، وہ ادبدا کے کرسی سے اُٹھے اور فرط مسرت سے ہنستے ہوئے مجھ سے بغلگیر ہو گئے (ان کا تذکرہ آگے آتا ہے) پھر چند اور اصحاب سے علیک سلیک اور مزاج پرسی ہوئی، میں اور خواجہ صاحب کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ مجلس کی کارروائی شروع ہو گئی قرآن مجید کی تلاوت کے بعد، حکیم محمد سعید صاحب کی اسلام آباد میں مصروفیت کے باعث اُن کی قائم مقامی میں ایک مختصر تقریر صدر جلسہ پروفیسر سراج الدین سابق پروفیسر انگریزی پنجاب یونیورسٹی، و پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اور آج کی شام کے فاضل مقرر (جن کا نام افسوس ہے ٹھیک یاد نہیں رہا۔ غالباً "کارنیواس" تھا یہ پاکستان ہائیکورٹ کے ریٹائرڈ جج تھے) کے تعارف اور اُن کے شکریہ میں اشرف صبوحی صاحب نے کی، اب مقالہ شروع ہوا جو انگریزی میں تھا اور اُس کا موضوع تھا "ریاست اور اخلاق" مقالہ میں

افلاطون کے نظریہ سیاست اور مغربی مفکرین کے افکار وآراء سے بحث کرنے کے بعد قرآن مجید کی آیات، اور امام غزالی اور حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کے بیانات و تصریحات کی روشنی میں موضوع بحث پر سیر حاصل گفتگو کی گئی تھی، فاضل مقرر اگرچہ عیسائی ہیں اُن کا اسلامیات کا مطالعہ وسیع اور ٹھوس ہے، انھوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ ریاست کے لئے اخلاق کا پاکیزہ ہونا ضروری ہے، پورا مقالہ پُر مغز اور مدلل تھا، سب نے اسے کامل توجہ اور غور سے سُنا۔

اس کے بعد جناب صدر کی تقریر ہوئی اور پھر ہمدرد کی طرف سے رسمی شکریہ کے بعد نشست ختم ہوگئی، اب حسب معمول چائے کا دور شروع ہوا تو لاہور کے اور بہت سے قدیم و جدید احباب سے ملاقات ہوئی، لاہور میں علمی اور ادبی رشتہ سے میرے مخلص دوستوں اور قدردانوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، ان میں سے اس وقت جن حضرات کے نام یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر رانا احسان الٰہی، جسٹس ایس۔ اے رحمٰن، ڈاکٹر سعید شیخ، (ڈائرکٹر ادارہ ثقافت اسلامی) ڈاکٹر معزالدین (ڈائرکٹر اقبال اکادمی) شاہد حسین صاحب رزاقی، شیخ نذیر حسین چودھری، سید وزیر حسن عابدی۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کو لاہور کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کا روحِ رواں کہنا چاہیے۔

ہوٹل میں | ان دوستوں سے مل ملا کر میاں اسلم کے ساتھ میں گھر واپس آیا اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر ٹیکسی سے مع سامان کے پھر اسی ہوٹل میں واپس آگیا جہاں کل صبح سے لاہور کا کانفرنس سیشن شروع ہونے والا تھا، ہوٹل میں ایک کمرہ میرے لئے پہلے سے رزروڈ تھا، میں اس میں مقیم ہوگیا، ہوٹل میں سکورٹی کے انتظامات اعلیٰ قسم کے تھے کوئی شخص جو ہم سے ملنے آتا تھا اُس پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی اور چوبیس گھنٹہ پہرا رہتا تھا،

لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید | خواجہ صاحب میرے نہایت دیرینہ عزیز دوست ہیں، اُن کے تعلقات مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے ساتھ بھی ایسے ہی اُس زمانہ سے ہیں جب کہ تقسیم سے قبل وہ گورنمنٹ سروس کے سلسلہ میں میرٹھ چھاؤنی میں ایک شاندار کوٹھی میں رہتے تھے، تقسیم

کے وقت برما میں تھے، وہاں سے پاکستان چلے گئے، ابھی چند برس ہوئے کہ لاہور میں میو ہاسپٹل کے چیف ایڈمنسٹریٹر کے عہدہ سے سبکدوش ہوکر لاہور میں رہ پڑے ہیں یہاں چھاؤنی میں الرشید کے نام سے ایک شاندار اور خوبصورت کوٹھی بنوالی ہے اُس میں رہتے ہیں، پاکستان کی اعلیٰ علمی اور سرکاری سوسائٹی میں خواجہ صاحب کا بڑا وزن اور وقار ہے، علمی ذوق نہایت بلندپایہ رکھتے ہیں، سائنس اور بزنس تو اُن کے فنی مضمون ہیں ہی، اسلامیات، تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور انگریزی اور اردو فارسی شعروادب کا بھی بہت وسیع اور تحقیقاتی مطالعہ رکھتے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت اور اُس میں تدبّر و تفکر سے بے حد شغف ہے، مولانا عبید اللہ سندھی سے باقاعدہ درسِ قرآن لیا ہے، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کے بھی عاشق اور مداح ہیں، اور والہ وشیدا اقبال کے بھی ہیں، اس سلسلہ میں ایک مرتبہ اپنے ان تینوں ممدوحین کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے بڑی پرلطف بات کہی، کہنے لگے: مولانا عبید اللہ سندھی میں علم ہے مگر شخصیت نہیں، اس کے برخلاف اقبال میں شخصیت ہے مگر علم (قرآن) نہیں، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد میں علم بھی ہے اور شخصیت بھی، خواجہ صاحب کا اسلامی نکر ان تین حضرات کا ہی تعمیر کردہ ہے۔

خواجہ صاحب برہان کے شروع ہی سے نہ صرف خریدار بلکہ بے حد قدردان اور ادارہ کے معاون بھی ہیں، برہان میں متعدد علمی مقالات بھی آپ کے قلم سے نکل چکے ہیں اور ادارہ نے عرصہ ہوا آپ کی ایک بلندپایہ علمی کتاب "معارف الآثار" کے نام سے شائع بھی کی تھی، انگریزی، اردو اور فارسی میں ایک درجن سے زیادہ کتابوں اور کم و بیش دو سو مقالات کے مصنف ہیں جو برصغیر ہند و پاک کے علاوہ بیرونی ممالک کے اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں، کتابوں اور اسلامی تہذیب و تمدن کے نوادر کے جمع کرنے کا بڑا شوق ہے، چنانچہ موصوف کا ذاتی کتب خانہ اور میوزیم دونوں قابلِ دید ہیں۔ مشاہیرِ عالم نے ان کو دیکھا اور داد دی ہے، غرض کہ ہر اعتبار سے بڑی عجیب وغریب اور قابلِ قدر شخصیت کے مالک ہیں، اگرچہ وضع قطع اور رہن سہن بالکل یورپین

ہے، لیکن نماز روزہ اور اوراد و وظائف اور تلاوتِ کلام مجید کے سختی سے پابند ہیں، رمضان میں باقاعدہ شب بیداری کرتے ہیں میں نے کبھی اُن سے پوچھا تو نہیں اور نہ میں کسی سے ایسی بات پوچھنی پسند کرتا ہوں اور نہ کبھی انھوں نے اس کا اظہار کیا، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تہجد کی نماز کے بھی پابند ہیں، میں حیدر آباد دکن میں بھی ایک گھرانہ سے واقف ہوں جس کی تہذیب اور تمدن بالکل یورپین ہے۔ یہاں تک کہ لڑکے اور لڑکیاں سب گھر میں بھی انگریزی بولتے ہیں لیکن اس کے باوجود پورا گھر پابندی سے تہجّد کی نماز پڑھتا ہے اور اُس کے بعد یہ سب مل کر ذکر کرتے ہیں۔ حیدر آباد کے ایک سفر میں میں اُن کی عالی شان کوٹھی میں قیام کر چکا ہوں، برہان میں اس سفر کی روئداد کے ذیل میں مَیں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

اُن کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی دین سے بے خبری اور بے چینی کا کتنا درد ہے! اُس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوگا جس سے میں خود بھی بے حد متاثر ہوا۔

شامِ ہمدرد کی تقریب سے فارغ ہو کر جب خواجہ صاحب جانے لگے تو مجھ سے بولے: اب کل (۵ رمارچ) سے تو کانفرنس لاہور میں ہو رہی ہے، آپ صبح سے شام تک اُس میں مصروف رہیں گے، پھر اطمینان کی ملاقات اور گفتگو کیسے اور کب ہو؟ اس کے بعد کہا: آپ کو سحر خیزی کی عادت ہے اور یہی عادت میری بھی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں روزانہ علی الصباح پانچ بجے آجایا کروں، میں نے کہا: بہت خوب! اس سے بہتر ملاقات کا وقت اور کون سا ہو سکتا ہے چنانچہ اس قرارداد کے مطابق خواجہ صاحب کار میں بیٹھ صبح منہ اندھیرے ہی پہنچ گئے، اس وقت اُن سے اِدھر اُدھر کی دسیوں باتیں ہوئیں: نظیری نے اسی جیسے موقع کے لئے کہا ہے:

چہ خوش است از دو یک دل سر حرف باز کردن
سخن گذشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

وحشت کلکتوی نے اسی مضمون کو اُردو میں اس طرح ادا کیا ہے۔

مزا آتا اگر گذری ہوئی باتوں کا افسانہ! کہیں سے ہم بیاں کرتے، کہیں سے تم بیاں کرتے

یہاں سنانے کے قابل جو بات ہے کہ خواجہ صاحب اُس وقت آئے تو میرے لئے ایک قیمتی تحفہ اور اپنی انگریزی کی ایک حالیہ طبع شدہ کتاب لیتے آئے تھے، یہ کتاب کافی ضخیم ہے اور اس کا نام ہے "اسلامی فکر کے اقدار کا از سر نو جائزہ" (Re-evaluation of Islamic Thought) ، درحقیقت یہ کتاب چند مقالات کا مجموعہ ہے جو پاکستان ٹائمز میں نکلتے رہے تھے، ان میں سب سے بڑا مقالہ جو کئی ابواب پر مشتمل ہے یہی ہے اس لئے کتاب کا نام اسی سے منسوب ہے، خواجہ صاحب نے اس کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کیا ہے اور اس سلسلہ میں جو عبارت لکھی ہے اُردو میں اس کا خلاصہ اور ترجمہ یہ ہے،

"انتہائی عاجزی اور نیاز مندی کے ساتھ یہ کتاب ایک حقیر نذرانہ ہے مقدس پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جو قیامت کے دن امت کے خلاف فریاد کناں ہو کر فرمائیں گے: یا رب إن قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً، (الفرقان) اے میرے رب میری امت نے اس قرآن کو ترک کئے ہی رکھا۔"

میں اس کتاب کو کھول کر اُس کا انتساب پڑھنے لگا اور ابھی مندرجہ بالا آیت پڑھنی شروع کی ہی تھی کہ اچانک خواجہ صاحب کی چیخ نکلی اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگے اور دیر تک روتے رہے، میں نے بہت ضبط کیا، آخر کار میرے اشک بھی رواں ہو گئے، میں نے دل میں کہا: اسلام کا درد، حضور سے عشق و محبت اور مسلمانوں کے دین سے بعد اور دوری کا غم اور کرب! یہ سب اللہ کی دین ہے، جبہ و دستار اور جامۂ زہد و پارسائی سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد خواجہ صاحب چلے گئے اور کانفرنس میں شرکت اور دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر گئے۔

(باقی)

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 MAY 197

Subs. Rs 15-00 Per Copi Rs.1-50

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

برہان

جلد نمبر ۷۶ | بابت ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۶ء | شمارہ نمبر ۶

فہرست مضامین

نظرات

خدا کا ہزار شکر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے افسرانِ حکومت کی جو میٹنگ سب پچھلے دنوں اسلام آباد میں ہوئی تھی وہ کامیاب رہی اور امید ہے کہ جولائی کے مہینہ میں سفارتی تعلقات پھر بحال ہوجائیں گے، اور ساتھ ہی دوسرے معاملات طے ہوجائیں گے، ہم کو اس کی بھنک اسی وقت مِل گئی تھی جب ہم ابھی مارچ میں پاکستان میں تھے، چنانچہ ہم نے دیکھا تھا کہ لاہور سے اٹاری تک کی ریلوے لائن کو درست کیا جارہا تھا اور مزدور کام کررہے تھے، اس کے علاوہ بعض ذمہ دارانِ حکومت سے جو گفتگو ہوئی اس سے بھی اس کا اشارہ نکلتا تھا، بے شبہ اس اقدام کے لئے ہماری وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی اور پاکستان کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو دونوں قابلِ مبارک باد ہیں، کیوں کہ جس طرح تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے اسی طرح دوستی کا مصافحہ بھی دونوں طرف سے ہوتا ہے اس فیصلہ اور سمجھوتہ کا ساری دنیا میں جو خیر مقدم کیا گیا ہے اُس سے اندازہ ہوگا کہ عالمی امن کے قیام میں اس کی کیا اہمیت ہے۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اپنے عوام کے فلاح و بہبود اور اُن کی خوش حالی و ترقی کے لئے بہت کچھ کرنا ہے، ان کا معیارِ زندگی اونچا کرنا، غربت اور بے روزگاری کو دور کرنا، اخلاقی اور تعلیمی اعتبار سے انھیں ایک ترقی یافتہ قوم بنانا، صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت شہروں کی تزئین و آئین بندی، علم و فن، تہذیب و تمدن غرض کہ قومی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا

نہیں ہے جس میں ابھی سینکڑوں کام کرنے نہوں اور یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ برصغیر میں امن وامان ہو علاوہ ازیں ترقی یافتہ اور بڑی قوموں نے ہمیشہ کم ترقی یافتہ ملکوں کو اپنے مفاد کی خاطر تگنی کا ناچ نچایا اور اُن میں اتحاد پیدا نہیں ہونے دیا ہے، لیکن آج ایشیا اور افریقہ دونوں بیدار ہو چکے، اور اس کھیل کی حقیقت کو سمجھ گئے ہیں۔ اب اُن میں خود اعتمادی اور عزتِ نفس پیدا ہو رہے ہیں اور وہ اپنے معاملات و مسائل کے حل کے لئے بڑی طاقتوں کی طرف دیکھنے اور اُن کا سہارا لینے کی عادت ترک کر رہے ہیں، فکر و نظر میں یہ تبدیلی ایشیا اور افریقہ کے نشأۃ ثانیہ کے لئے فالِ نیک اور پیش گوئی ہے، اپنے روایاتی تاریخی اور جغرافیائی مقام و مرتبہ کے اعتبار سے اس نشأۃ ثانیہ کی تعمیر وتشکیل میں ہندوستان اور پاکستان کو اہم رول ادا کرنا ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کہ دونوں میں باہم اتحاد و یک جہتی کا رشتہ ہو، اس بنا پر علاقائی امن وامان اور خوش حالی و ترقی اور بین الاقوامی امن و عافیت دونوں کی اہمیت و ضرورت کے پیشِ نظر برصغیر کے ان دو عظیم ہمسایہ ملکوں کا دوستی کی طرف یہ اقدام بہت قابلِ قدر اور اہم نتائج کا حامل ہے۔

برہان کی گذشتہ دو اشاعتوں میں جناب محمود حسن صاحب قیصر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، اس میں چند باتیں ایسی ہیں جو اہلِ سنت والجماعۃ کے نقطۂ نظر سے اصلاح طلب اور تنبیہ کی مستحق ہیں۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ عصمتِ انبیاء اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، قرآن میں نبی کا جو تصور پیش کیا گیا ہے عصمت اُس کا جزء لاینفک ہے، بالکل اسی طرح جیسے ماں اور باپ کے تصور کا لازمی جزء اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرنا ہے اس بناء پر اس بات کی ہرگز ضرورت نہ تھی کہ قرآن میں عصمت انبیاء کا ذکر دلالتِ مطابقی کے ساتھ ہوتا اور اسی وجہ سے قرونِ اولیٰ میں نہ اس پر کبھی بحث ہوئی اور نہ اس پر کبھی مذاکرہ ہوا۔

(۲) قرآنِ مجید میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ اللہ میں اور پیغمبروں میں بحیثیت عبد کے جو فرق ہے وہ واضح اور ذہن میں راسخ رہے تاکہ لوگ حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر کے بارہ میں اور

یہود خود اپنے سے متعلق جس شدید گمراہی میں مبتلا ہو گئے اُس سے محفوظ رہیں - اس بنا پر کسی پیغمبر سے اگر کوئی لغزش ہو گئی ہے جو حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ کے ماتحت آتی ہے تو قرآن میں اُس پر تنبیہ کی گئی ہے، مثلاً عَبَسَ وَتَوَلّٰی یا "لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ"، یہی وہ لغزش ہے جس کے لئے قرآن میں کبھی ذنب کا لفظ بولا گیا ہے اور اُس سے استغفار کا مطالبہ کیا گیا ہے، کبھی بر بنائے بشریت جس لغزش کا امکان تھا اُس پر پہلے سے متنبہ کر دیا گیا اور اُس سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی بتا دی گئی، مثلاً وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطَانِ الآیۃ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انبیائے کرام کی بشریت کا استحضار رہے اور مسلمان دوسری قوموں کی طرح گمراہ نہ ہوں۔

(۳) عصمتِ انبیاء کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت دو قسم کی ہوتی ہے ایک پیغمبری کی اور ایک عام انسان ہونے کی، اب جہاں تک گناہ کبیرہ کا تعلق ہے تو پیغمبر اُس سے بالکل محفوظ ہوتا ہے، پیغمبر ہونے کے بعد ظاہر ہی ہے، اور پیغمبر ہونے سے قبل اس لئے کہ پیغمبر ہونا وہی ہے جو اپنے ملکات اور اخلاق کے اعتبار سے نہایت سلیم الفطرت اور اعلیٰ جبلت کا مالک ہوتا ہے، دنیا میں کتنے لوگ ہیں کہ آپ انھیں قتل کر دیجئے مگر وہ کبھی نہ جھوٹ بول سکتے ہیں، نہ امانت میں خیانت کر سکتے ہیں، نہ کسی کو دھوکا دے سکتے ہیں، اور نہ حرام کاری کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اب رہی بھول چوک! تو اس کا صدور ایک پیغمبر سے عام انسانی افعال میں ہو سکتا ہے، مگر وہ اس پر قائم نہیں رہ سکتا، اللہ کی طرف سے اُس پر تنبیہ ہوتی ہے اور وہ استغفار کے ذریعہ اُس کی تلافی کر لیتا ہے

(۴) حضرت آدم کے لئے قرآن میں جو عصیٰ اور غویٰ آیا ہے تو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ جنت کی بات ہے، تکالیف شرعیہ صرف اس دنیا کے لئے ہیں اور پھر بھی حضرت آدم نے اس پر اظہار ندامت و استغفار کر لیا ہے، رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا الآیۃ - ان وجوہ کی بناء پر یہ کہنا کہ سنیوں میں یہ عقیدہ بواسطۂ تصوف شیعوں سے آیا ہے سر تا سر غلط اور ناقابلِ تسلیم ہے

عہدِ نبوی کے غزوات وسرایا

اور

اُن کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۸)

(سعید احمد اکبر آبادی)

مقتولین کی تعداد اور اس پر بحث مقتولین کی اصل تعداد کیا تھی؟ اس بارہ میں سخت اختلاف ہے، حافظ ابنِ حجر لکھتے ہیں: ابنِ اسحاق کے نزدیک یہ لوگ چھ سو تھے، ابو عمر نے سعد بن معاذ کے ترجمہ میں اس کو ہی صحیح قرار دیا ہے، لیکن قتادہ کی ایک مرسل روایت کی روشنی میں ابن عائذ کے نزدیک یہ سات سو تھے، سہیلی نے کہا ہے کہ تعداد آٹھ سو اور نو سو کے درمیان تھی، اس کے برخلاف جابر کی روایت میں جو ترمذی، نسائی اور ابن حبان کے ہاں صحیح اسناد سے منقول ہے، چار سو فوجیوں کی تعداد بیان کی گئی ہے۔" اس کے بعد حافظ ابن حجر ان مختلف روایات میں تطبیق اس طرح کرتے ہیں کہ ممکن ہے چار سو اصل فوجی اور جنگجو ہوں اور باقی لوگ ان کے اتباع یعنی پیرو کار ہوں" پھر لکھتے ہیں: "ابنِ اسحاق سے یہ بھی مروی ہے کہ بعض لوگوں نے یہ تعداد نو سو بھی بتائی ہے۔"[1] علامہ بدر الدین عینی نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بعینہ یہی ہے[2]، اس کا حاصل یہ ہوا۔

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۳۱۹		[2] عمدۃ القاری ج ۸ ص ۲۵۷

کہ مقتولین کی تعداد زیادہ سے زیادہ نو سو تھی اور کم سے کم چار سو، مولانا شبلی نے چار سو کی روایت کو ترجیح دی ہے لیکن اس سلسلہ میں چند باتیں غور طلب ہیں

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تعداد میں اس قدر شدید اختلاف کہ ایک طرف چار سو اور دوسری جانب نو سو خود اس بات کا قرینہ ہے کہ کوئی تعداد بھی یقینی نہیں ہے، پھر سوال یہ ہے کہ تعداد جو کچھ بھی رہی ہو اُس کا علم کیوں کر ہوا؟ ظاہر ہے اُس وقت رجسٹر رکھنے کا رواج تو تھا نہیں جس میں ناموں کا اندراج ہو، اس بنا پر اس روایت کا دارومدار سننے سنانے پر ہی ہو سکتا ہے، ان بیان کرنے والوں میں کچھ ایسے بھی لوگ ہوں گے جنھوں نے یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا ہو گا تاہم یہ یقینی ہے کہ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے ان کا بیان بھی تخمینی ہی ہو سکتا ہے، قطعی اور حتمی نہیں، اور اس قسم کے مواقع پر انسانی فطرت کا خاصہ مبالغہ کرنا ہے، چنانچہ ہماری عربی اور فارسی کی تاریخیں اُٹھا کر دیکھ لیجئے اُن میں جنگ وجدال کے واقعات کے بیان میں کس درجہ مبالغہ پایا جاتا ہے، اگر دشمن کی فوج کے سو دو سو آدمی مارے گئے ہیں تو مورخین کے ہاں یہی تعداد ہزار سے کم نہیں رہے گی، البتہ محدثین اس باب میں بھی محتاط ہوتے ہیں، اُن کے ہاں یہ مبالغہ آرائی نہیں پائی جاتی، یہی وجہ ہے کہ جہاں تک صحاح ستہ کا تعلق ہے، جیسا کہ آپ نے ابھی حافظ ابن حجر کے حوالہ سے پڑھا۔ ترمذی اور نسائی کے علاوہ باقی چاروں صحاح تعداد کے معاملہ میں خاموش ہیں حالانکہ چار سو انسانوں کا قتل معمولی بات نہیں سینکڑوں آدمیوں نے اسے دیکھا ہو گا۔ اس کے باوجود اکابر محدثین کا تعداد کے بارہ میں خاموش رہنا خالی از علت نہیں ہو سکتا پھر یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ اس واقعہ کی شاہدِ عدل ہیں چنانچہ عورت کے قتل کی راوی وہی ہیں اور حضرت علی اور حضرت زبیر کا تو اس واقعۂ قتل سے براہِ راست تعلق ہی تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی نے مقتولین کی تعداد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۲) واقعہ کی روایت میں اُس کے بعض اجزا سے متعلق مختلف الفاظ ملتے ہیں اور اُن سے مختلف نتائج برآمد ہوتے ہیں مثلاً ابن اسحاق کی روایت میں حضرت سعد بن معاذ کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان تقتل الرجال و تسبی ذراریھم — مردوں کو قتل اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو باندی غلام بنا لیا جائے۔

چنانچہ کم و بیش ارباب سیر اور مورخین یہی کہتے ہیں کہ سعد بن معاذ کے اس فیصلہ کے مطابق بنو قریظہ کے سب بالغ مرد قتل کر دیے گئے اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو باندی غلام بنا کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

لیکن صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید الخدری سے جو روایت ہے[1] اُس میں سعد بن معاذ کے فیصلہ میں "الرجال" کے بجائے "مقاتلھم" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں بنو قریظہ کے سپاہی اور جنگجو۔ ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں مدار قتل بلوغ ہوتا ہے اور دوسری صورت میں مدار قتل بلوغ نہیں، بلکہ جنگجوئی اور محاربہ قرار پاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ صحیح جو بات ہے وہ وہی ہے جو صحیح بخاری سے ثابت ہوتی ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں:

(الف) ایک یہ کہ یہ بخاری کی روایت ہے اور حضرت ابو سعید الخدری ایسے مقدس اور جلیل القدر صحابی سے منقول ہے،

(ب) اور دوسری یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل نفس انتہائی نامرغوب اور ناپسندیدہ فعل تھا اور آپ اس اقدام پر بادل ناخواستہ اُسی وقت راضی ہوتے تھے جب آپ کو یقین ہو جاتا تھا کہ اب اصلاح حال کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار ہے ہی نہیں، اس بنا پر آپ کو کوئی ذرا سا بہانہ ملتا تو ایک واجب القتل کو بھی معاف فرما دیتے تھے، حد یہ ہے کہ آپ کے اس طرز عمل کے باعث فقہ میں ایک مستقل اصل ہے کہ

الحدود تندرء بالشبھات — حدود شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں

چنانچہ اسی قتل بنی قریظہ کے سلسلہ میں آپ نے ذرا ذرا سی بات پر متعدد اشخاص کی

---

[1] ج ۲ باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب و مخرجہ الی بنی قریظہ

جاں بخشی فرمادی (تفصیل کے لئے دیکھئے الاندد ص ۱۹۲) فتح مکہ کے موقع پر آپ نے جس رحمدلی سے دشمنوں سے عفوو درگذر اور مسامحت و مجاملت کا معاملہ اپنے اور اسلام کے سخت ترین دشمنوں کے ساتھ کیا ہے اسلام کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اُس کی داد دینے پر مجبور ہو گیا ہے، مولانا شبلی نے نہایت بلیغ انداز میں اس منظر کی تصویر کشی کی ہے، آپ بھی سنئے فرماتے ہیں :

"خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں وہ بھی تھے جن کے تیغ و سناں نے پیکرِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہو لہان کردیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آکر ٹکرا تا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر اُن کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے،

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا:

تم کو کچھ معلوم ہے! میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں ؟

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اُٹھے :-

اَخٌ کَرِیْمٌ وَّابْنُ اَخٍ کَرِیْم — تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے !

ارشاد ہوا :-

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ، اذھبوا انتم الطلقاء — تم پر آج کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو

(سیرت النبی ج ۱ ص ۵۲۰)

غزوۂ بدر سے زیادہ سخت دن اور کون سا ہو سکتا تھا، لیکن آپ پڑھ آتے ہیں اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر قریش کے چند خاص آدمیوں کے نام لے کر مسلمانوں کو حکم

دیا کہ اگر ان لوگوں پر قابو چلے تو انھیں قتل نہ کرنا، کیوں کہ یہ لوگ قریش کے ساتھ بادل نخواستہ آئے ہیں، علاوہ ازیں کتب حدیث میں کتنے ہی واقعات مذکور ہیں جن میں کسی ایک صحابی یا صحابیوں کی ایک جماعت نے کسی ایک کافر کو خطاءً قتل کر دیا ہے اور جب حضور کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو آپ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور مقتول کا خون بہا دلوایا ہے پس جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا عالم یہ ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آپ نے یہاں بلا تفریق و امتیاز سب بالغ مردوں کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا ہو۔

مذکورۂ بالا دو وجہوں کی بنا پر اس میں کوئی کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ تاریخ و سیر کی عام کتابوں نے جو یہ تاثر دیا ہے کہ بنو قریظہ کے تمام بالغ مرد (کل من انبت) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مارے گئے بالکل غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ مقاتلہ (Combatant) قتل کئے گئے، یعنی مدار قتل بلوغ نہیں بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف صف آرا اور جنگجو ہونا تھا۔[۱]

---

[۱] وہ اصولِ درایت جن کی بنیاد پر ایک روایت رد کر دی جاتی ہے اُن میں ایک اصل یہ بھی ہے کہ روایت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کے طرزِ عمل کے خلاف ہو، چنانچہ بخاری (باب شراء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنسیہ) میں حضرت انس کی روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اپنی ایک ذرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر اُس سے اپنے متعلقین کے لئے جو خرید ے، اس کے بعد حضرت انس نے کہا: "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کبھی ایک صاع (تقریباً تین سیر) گیہوں یا کوئی اور غلہ بیک وقت نہیں ہوا"، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں اس روایت پر کلام کرتے ہوئے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ روایت ظاہر حقیقت حال اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہے، اور حضور تو حضور، کسی صحابی کی بھی اگر کسی روایت سے تنقیص نکلتی ہے تو محدثین نے اُس کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، مثالوں کے لئے دیکھئے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ بابت جون و اگست ۱۹۵۰ء مقالہ مولانا حیدر حسن خاں از مولانا عبدالسلام قدوائی، غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں حضرت حسان بن ثابت سے متعلق ایک روایت ہے، جس سے اُن پر بزدلی کا الزام آتا ہے، حافظ ابن عبدالبر نے اس روایت کو محض اس بنا پر منکر قرار دے دیا ہے کہ اگر یہ الزام درست ہوتا تو جن شاعروں نے حضرت حسان کی ہجو کی ہے وہ اس کا ذکر کرتے۔

(الدرر ص ۱۸۶)

مقاتلہ کی تعداد | آیئے! اب یہ دیکھیں کہ بنو قریظہ کے مقاتلہ کی تعداد کیا تھی؟ اور وہ سب مارے گئے۔ یا سب نہیں بلکہ اُن کی ایک تعداد ماری گئی۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے بنو قریظہ کے فوجیوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ بتائی ہے (عہد نبوی کے میدانِ جنگ ص ۵۷) اور یہ بالکل قرینِ قیاس ہے، کیوں کہ غزوۂ احزاب میں جتنے مسلمان شریک تھے یعنی تین ہزار پا پیادہ اور چھتیس[۳۶] سوار آپ اُن سب کو لے کر بنو قریظہ کے لئے روانہ ہوئے تھے، ظاہر ہے اگر بنو قریظہ کے فوجیوں کی تعداد کم ہوتی تو حضور کو اتنی بڑی جمعیت ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی، پس اگر واقعی بنو قریظہ کے فوجیوں یعنی مقاتلہ کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد تھی اور یقیناً تھی تو حضرت جابر کی روایت کے مطابق چار سو مقاتلہ کے قتل کئے جانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بالغ مرد تو الگ رہے جو فوجی تھے وہ بھی تقریباً ایک چوتھائی مارے گئے، یہ ہرگز نہیں ہوا کہ اُن سب کا صفایا کر دیا گیا ہو، پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حی بن اخطب قریظہ نہیں بنو نضیر سے تھا۔ اس بنا پر عجب نہیں کہ مقتولین کی فہرست میں اسی طرح کچھ اور قبیلوں کے لوگ ہوں۔

مغربی مصنفین | جب بالغ مردوں کے قتل عام کی روایت مسلمان مورخین کے ہاں ہی چلی ہوئی ہو تو پھر غربی مصنفین سے کیا شکایت کی جائے، البتہ فرق یہ ہے کہ سر ولیم میور اور مارگولیوتھ جیسے کٹر متعصب افراد اس کو وحشت اور بربریت کہتے ہیں اور پروفیسر واٹ منٹگمری ایسے سنجیدہ مستشرقین اس کے جواز میں کہتے ہیں کہ بنو قریظہ نے عہد شکنی کر کے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مسلسل پروپگنڈا اور معاندانہ حرکات کر کے اپنا اعتبار و اعتماد کھو دیا تھا اس بنا پر جو لوگ قتل کئے گئے ان کو نرمی کی توقع نہیں ہو سکتی تھی[۱] البتہ ہمارے علم میں مستشرقین میں پروفیسر ہٹی پہلے شخص ہیں جن کے ہاں اُس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے جس کو ہم نے ابھی ثابت کیا ہے، چنانچہ مقتولین قریظہ کی ایک معین تعداد بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں: "باقی لوگوں کو خارج البلد کر دیا گیا۔[۲]"

---

[۱] محمد ان مدینہ ص ۳۲۰ [۲] تاریخ عرب ص ۱۱۷

بہر حال جب سب فوجی بھی قتل نہیں کئے گئے تو تعداد سے قطع نظر جو لوگ قتل کئے گئے وہ یقیناً وہی ہوں گے جو کعب بن اسد کی طرح قوم کے لیڈر، سرغنہ اور فتنہ کی جڑ ہوں گے، ان کی تعداد کیا تھی؟ ابن ہشام اور الروض الانف میں یہودی قبائل کے اُن تمام سرداروں کے نام درج ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور اسلام کی بیخ کنی کی کوششوں میں سب کے پیشرو اور اُن کے سرغنہ تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بنو قریظہ کے ایسے سرداروں کے بھی نام لکھے ہیں، یہ نام شمار میں سترہ ہیں[۵۱]۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ بس یہی سترہ آدمی قتل کئے گئے، سوال یہ ہے کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے قبیلوں کے علاوہ اور دوسرے یہود قبائل میں بھی تو ایسے ہی جنگجو اور فتنہ پرور موجود تھے، جن کے نام تاریخ میں درج ہیں، ابن اسحاق نے ان کی مجموعی تعداد ستر ۶۷ لکھی ہے، تو یہ سب کہاں گئے اور ان کا کیا حشر ہوا؟

نکتہ اصل یہ ہے کہ جب ہم بنو قریظہ، بنو نضیر یا بنو قینقاع بولتے ہیں تو یہ صرف اکثریت کے اعتبار سے بولتے ہیں، مدینہ میں یہی تین قبیلے صاحب اقتدار اور صاحب املاک و جائداد تھے، اُن کے اپنے اپنے قلعے اور علاقے تھے، ان علاقوں میں ان کے بنی اعمام یا بنی اخوال جو دوسرے قبیلوں یا اُن کی شاخوں سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی رہتے تھے مگر عام بول چال میں وہ بنو نضیر، بنو قینقاع یا بنو قریظہ ہی کہلاتے تھے[۵۲]، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ بنو قریظہ کے کچھ لوگ اس واقعہ کے دن مسلمان ہو گئے تھے، لیکن حافظ ابن عبد البر نے تصریح کی ہے کہ یہ لوگ نہ قرظی تھے اور نہ نضیری، بلکہ قبیلہ ہدل کی ایک جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو بنو قریظہ کے ساتھ اُن کے قلعہ میں مقیم تھے[۵۳]۔ اس بناء پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ بنو قریظہ کے اتنے افراد مارے گئے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ سب افراد بنو قریظہ کے ہی تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں بنو قریظہ کے ساتھ دوسرے قبیلوں کے بھی افراد تھے جو بنو قریظہ کے قلعوں میں مقیم تھے، علاوہ ازیں

---

۵۱ ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷ و مابعد و الروض الانف ج ۲ ص ۴۲ ۵۲ تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ العرب قبل الاسلام ڈاکٹر جواد علی ج ۶ الفصل الاول الیہودیۃ بین العرب اور محمد ان مدینہ باب چہارم۔

۵۳ الدرر ص ۱۹۱

یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ حی ابن اخطب قوم کا ایک عظیم سردار تھا اور ایک سردار جب کسی مہم پر روانہ ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ دس پانچ اُس کے معاون و مددگار ضرور ہوتے ہیں اگرچہ نام سردار کا ہی ہوتا ہے اس لئے عجب نہیں کہ اس موقع پر حی ابن اخطب کے ساتھ چند اور نضیری بھی مارے گئے ہوں جن کے نام تاریخ نے محفوظ نہیں رکھے۔

یہودِ مدینہ کے ساتھ یہ اسلام کا آخری معرکہ تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے ساتھ ہر قسم کی ملاطفت اور مدارات کے باوجود ان کی روز افزوں ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں کے باعث ان سے بالکل مایوس اور دل برداشتہ ہو چکے تھے اور آپ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس فتنہ کی جڑ ہی کاٹ دینی ہے اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس موقع پر مقتولین کی تعداد خاصی بڑی رہی ہوگی تاہم یہ باور کرنا مشکل ہے کہ یہ تعداد چار سو تک پہونچی ہوگی اور اس کے وجوہ یہ ہیں :-

(۱) عہدِ نبوی کے تمام غزوات و سرایا میں دشمن کے جو لوگ قتل ہوئے ہیں ڈاکٹر حمید اللہ نے اُن کی تعداد عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ میں بمشکل سے ڈیڑھ سو بتائی ہے (ص ۷) لیکن انھوں نے اپنی انگریزی کتاب "محمد رسول اللہ" میں یہی تعداد "تین سو سے کم" لکھی ہے ڈاکٹر صاحب نے اپنی متعدد محققانہ کتابوں میں بنو قریظہ کے واقعہ کا ذکر کیا ہے، لیکن کہیں ہماری نظر سے یہ نہیں گذرا کہ انھوں نے مقتولین کی تعداد لکھی ہو یا اُس پر بحث کی ہو، اس بنا پر ہمارے خیال مذکورۂ بالا تعداد میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ایک جگہ انھوں نے مقتولین غزوات و سرایا کے ساتھ مقتولینِ قریظہ کو شامل کر لیا ہے اور ایک جگہ نہیں کیا، اور اگر بالفرض تین سو سے کم میں بھی بنو قریظہ شامل نہیں ہیں تو یہ کیسی عجیب و غریب بات ہوگی کہ تمام جنگوں میں جن کے نتیجہ میں دس لاکھ سے زیادہ مربع میل کا رقبہ اسلام کے زیرِ نگین آگیا اور وہ بھی دس برس میں! اُن سب میں تو تین سو کم آدمی مارے گئے اور صرف ایک واقعہ جس میں جنگ ہوئی ہی نہیں اُس میں چار سو آدمی ہلاک کر دئے گئے ہوں۔

(۲) چار سو آدمیوں کا قتل معمولی بات نہیں، اگر ایسا ہوتا تو مدینہ میں تلاطم پیدا ہو جاتا اور بچہ بچہ کی زبان پر اُس کا چرچا ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مدینہ کی فضا اس درجہ پرسکون ہے کہ گویا کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہیں اور کم از کم یہود پر تو اس واقعہ کی دہشت اس درجہ ہوتی کہ مدینہ میں ایک یہودی بھی نظر نہ آتا، حالانکہ یہ ثابت ہے کہ اس واقعہ کے بعد بھی مدینہ میں مختلف قبیلوں کے یہودیوں کی خاصی تعداد آباد رہی ہے اور ان میں ابو الشحم جیسے مال دار اور ارباب ثروت یہودی بھی تھے جو تجارت کرتے تھے

پروفیسر واٹ منٹگمری نے تو قریظہ کے واقعہ کے بعد بھی مدینہ میں خوش حالی کے ساتھ یہودیوں کے باقی رہنے سے اُن یورپین مصنفین کے خلاف استدلال کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کا شروع سے یہ منصوبہ تھا کہ یہود کا مدینہ سے استیصال کر دیا جائے، موصوف اس کی تردید میں لکھتے ہیں کہ یہ کہنا غلط ہے، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے حالات پیدا ہوتے گئے پیغمبر اسلام عمل کرتے گئے، بنو قریظہ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے کسی طے شدہ پالیسی کا نہیں۔ بلکہ وقتی حالات کا نتیجہ تھا[1]۔

(۳) ارباب سیر عموماً ہر غزوہ کے مقتولین و شہدا کے نام لکھتے ہیں، پھر مقتولین قریظہ کے نام کہاں ہیں؟

ان وجوہ کی بنا پر چار سو کی تعداد بے حد شکوک اور مشتبہ ہے اور اسلم طریقہ وہی ہے جو اکابر محدثین اور محتاط مصنفین نے اختیار کیا ہے، یعنی تعداد کا ذکر ہی نہ کیا جائے۔

باقیماندہ بنو قریظہ کہاں گئے؟ اب سوال یہ ہے کہ باقی ماندہ بنو قریظہ کہاں گئے؟ اس سلسلہ میں کوئی قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی، کیوں کہ تاریخ خاموش ہے۔ البتہ قیاسات سے کچھ لیا جا سکتا ہے، پروفیسر ہٹی کا یہ بیان آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ "باقی ماندہ لوگوں کو خارج البلد کر دیا گیا"۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے امام محمد کی کتاب الاصل مخطوطۂ استنبول کے حوالہ سے بنو قینقاع

---

[1] محمد ان مدینہ ص ۲۱۷

کی نسبت ایک عجیب و غریب چیز نقل کی ہے اور وہ یہ کہ بنو قینقاع نے بنو قریظہ کے خلاف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تھی امام محمد کے اس بیان کی بنیاد پر السرخسی نے بھی یہی لکھا ہے (المبسوط ج ۱۰ ص ۲۳) ڈاکٹر صاحب اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"یہ بیان عجیب سا ہے کیوں کہ بنو قینقاع بدر کی لڑائی کے بعد ہی مدینے سے نکال دئے گئے تھے"

لیکن پھر اس کے بعد کہتے ہیں :-

"اگر یہ بیان جو الشیبانی وغیرہ نے لکھا ہے صحیح ہے تو اس کے معنی غالباً یہی ہوں گے کہ بنو قینقاع کو جو سزا دی گئی وہ اس بڑے قبیلہ کے صرف چند خاندانوں کی حد تک محدود ہو گی کیوں کہ جس قصور پر وہ فیصلہ کیا گیا تھا اس کے ذمہ دار بھی چند ہی گھرانے تھے" (عہد نبوی کے میدان جنگ ص ۹۶)

پس جو قیاس ڈاکٹر صاحب نے بنو قینقاع کی نسبت کیا ہے وہی قیاس ہم بنو قریظہ کی نسبت کر سکتے ہیں یعنی جو لوگ سزا کے مستحق تھے اُن کو سزا دینے کے بعد باقی جو مرد اور اُن کی عورتیں اور بچے بچے اُن سب کو منتشر کر دیا گیا، اُن میں سے کچھ دوسرے ملکوں میں نکل گئے ہوں گے اور کچھ مدینہ میں ہی رہ گئے ہوں گے، لیکن چوں کہ ان کی کمر ٹوٹ چکی تھی، طاقت و قوت اور جمعیت باقی نہیں رہی تھی، اُن کے قلعے بھی اُن کے پاس نہیں رہے، اس بنا پر یہ چند باقی ماندہ لوگ مدینہ میں رہے تو مگر بے نام و نشان ہو کر رہے اور دوسرے قبیلوں میں جذب ہو گئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب جب کہ یہودِ مدینہ کی بحث ختم ہو رہی ہے ایک مرتبہ پھر اس پر غور کیجئے کہ مدینہ میں یہود کے جو یہ تین با اقتدار قبیلے آباد تھے اُن کے سامنے صرف تین صورتیں تھیں :-

(۱) اسلام قبول کر لیتے۔

(۲) مدینہ میں پر امن اور اسلامی ریاست کے وفادار شہری ہو کر رہتے۔

(۳) اگر مذکورۂ بالا دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت وہ اختیار نہیں کر سکتے تھے تو سارے جہان کے دستور کے مطابق اُن کا فرض تھا کہ مدینہ کی سکونت چھوڑ دیتے۔

لیکن یہود نے ان میں سے کسی ایک بات کو بھی اختیار نہیں کیا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ برابر لطف و مدارات، دل جوئی اور عدل و مسامحت کا معاملہ کرتے رہے لیکن یہ ذرا نہیں پسیجے اور اُن کی اسلام دشمن حرکات اور فتنہ انگیزیوں میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ان حالات سے سخت مجبور اور پریشان ہو کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف جو اقدام کیا وہ یہ تھا کہ

(۱) بنو قینقاع جلاوطن کئے گئے۔ (۲) بنو نضیر جلاوطن کئے گئے اور ان دونوں قبیلوں نے اس امن و عافیت سے مدینہ چھوڑا کہ کسی ایک کے نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔

(۳) اب صرف ایک بنو قریظہ رہ گئے تھے، ان بدبختوں نے اب تک جو کچھ ہو چکا تھا نہ اُس سے عبرت حاصل کی اور نہ اپنی روش میں کوئی تبدیلی پیدا کی اور اس کے عکس عین اُس موقع پر جب کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہایت نازک صورت حال سے دو چار تھے انھوں نے اسلام کے سینہ میں خنجر بھونک دینے کی اپنی والی پوری کوشش کر ڈالی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کی جاں بخشی کا انجام دیکھ چکے تھے کہ نیکی برباد گناہ لازم، غزوۂ احزاب کی آگ انھیں کی بھڑکائی ہوئی تھی، اس صورت حال میں دنیا کا کوئی بھی مدبر اور سمجھ دار انسان نہ انھیں معاف کر سکتا تھا اور نہ بطور سزا صرف ان کی جلاوطنی پر اکتفا کر سکتا تھا۔ اس بنا پر ان کے سرخیل و سرغنہ اور جن سے آیندہ فتنہ انگیزی کا اندیشہ ہو سکتا تھا اُن کو سزائے موت دی گئی، لیکن اس پر بھی رحمت عالم کی احتیاط اور مروت کا یہ عالم ہے کہ خود اپنی زبان سے اس کا اعلان نہیں فرماتے، بلکہ ان لوگوں نے خود جس کو اپنا حلیف سمجھ کر اس معاملہ میں حکم بنالیا تھا یہ جو کچھ ہوا اُس کے فیصلہ پر ہوا اور فیصلہ بھی ایسا جو خود ان لوگوں کی کتاب ہی پر مبنی تھا

اب یہود مدینہ کی اس پوری سرگذشت کا فرض کیجئے اقوام متحدہ کی عدالت عالیہ کے سامنے پیش کر دو اور پوچھو کیا کیا انتہائی سخت دشمن اسلام کے ساتھ منافقت اور غداری کا کوئی معاملہ اس سے بھی زیادہ

حدیث کا درایتی معیار

(داخلی فہم حدیث)

۱۱

ایمان بالکتب

مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

کتاب سے مراد اللہ کی طرف سے جو علم وادراک نبیوں اور رسولوں کو دیا جاتا رہا اس کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) وہ جو کلامِ الٰہی کی شکل میں اللہ کی طرف سے بذریعۂ فرشتہ اُتار اگیا۔

(۲) وہ جو تشریح وتوضیح کی شکل میں نبوت کی طرف سے بذریعۂ شعورِ نبوت حاصل ہوا۔

پہلی کی حیثیت "اصل" اور دوسری کی حیثیت "فرع" یعنی اخذ واستنباط کی ہے "کتاب" سے مراد علم وادراک کی پہلی قسم ہے جس پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ جس دور وزمانہ میں بھی کلامِ الٰہی جس نبیؑ ورسولؑ پر اُتار اگیا وہ سب برحق اور خالص اللہ کی طرف سے تھا۔

قرآنِ حکیم کی آخری و دوامی شکل

ختمِ نبوت سے پہلے چونکہ جوہرِ انسانیت کے قویٰ وخواص خام حالت میں تھے اور ان میں بتدریج پختگی وتوانائی پیدا کرنے کا مرحلہ تھا اس بنا پر کلامِ الٰہی (کتاب)

ان کی مناسبت سے حسب ضرورت بھیجا جاتا رہا اور وقتاً فوقتاً اس میں ردّ و بدل کر کے بہتر شکل دینے کی کوشش ہوتی رہی تاکہ بتدریج پختگی و توانائی کی راہ ہموار ہو سکے، لیکن ختم نبوتؐ پر جو کلام الٰہی (کتاب) اتار اگیا وہ چوں کہ قویٰ و خواص کی پختگی و توانائی کے بعد صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کے لئے ہے اس میں ردّ و بدل ضرر رساں ہونے کے علاوہ خلافت و نیابت کے لئے حیوانی و نورانی بنیادؔ کے درمیان تجاذبی قوت کی جو حد مقرر تھی اس میں بھی اضافہ کی گنجائش نہ رہ گئی تھی اس بنا پر پختگی و توانائی کے بعد کلام الٰہی (قرآنِ حکیم) کو آخری و دوامی شکل دے کر مہر نبوّت کی تصدیق اس پر ثبت کر دی گئی۔

پہلی کتابوں کا ذکر | پہلی کتابوں کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی (اعلیٰ ع ۱)	یہ باتیں گذشتہ صحیفوں میں بھی ہیں ابراہیمؑ اور موسیٰ کے صحیفوں میں
اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی (طٰہٰ ع ۸)	کیا پہلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی۔
وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (شعراء ع ۱۱)	بلاشبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں ہے۔
وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (النساء ع ۲۳)	اور ہم نے داؤدؑ کو زبور دی
اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ (مائدہ)	ہم نے توراۃ اتاری جس میں ہدایت اور نور ہے
وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ۔ ایضاً	ہم نے عیسیٰؑ کو انجیل دی اس میں ہدایت اور نور ہے

متعلقہ حدیثیں | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انزلت صحف ابراھیم علیہ السلام فی اول لیلة من رمضان وانزلت التوراة لست مضین من رمضان والانجیل لثلاث عشرة خلت من	ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی رات میں اتارے گئے، توراۃ چھ رمضان، انجیل تیرہ رمضان کو نازل ہوئی اور قرآن چوبیس رمضان کو نازل کیا گیا۔

رمضان وانزل الفرقان لاربع وعشرين خلت من رمضان ؎۔

دوسری جگہ ہے۔

اعطیت مکان التوراۃ السبع	میں توراۃ کی جگہ سات لمبی سورتیں دیا گیا زبور
واعطیت مکان الزبور المئین	کی جگہ سو سے زائد آیتوں والی سورتیں دیا گیا
واعطیت مکان الانجیل المثانی	انجیل کی جگہ سو سے کم والی آیتیں دیا گیا اور
وفضلت بالمفصل ؎	اس سے بھی کم آیتوں والی سورتوں کے ساتھ
	میں فضیلت دیا گیا۔

پہلی کتابوں میں نسخ ونسیان کا ذکر | ان کتابوں میں نسخ (ردوبدل) کا ذکر اس آیت میں ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا	ہم اپنے احکام سے جو کچھ بدل دیتے یا بھلا
نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا (البقرہ ع ۱۱)	دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا
	حکم نازل کرتے ہیں۔

"نسخ" میں پچھلی تعلیم موجود تھی اور "نسیان" میں پچھلی تعلیم فراموش ہوگئی تھی لیکن دونوں صورتوں میں ہر نئی تعلیم پچھلی سے بہتر یا اس کے مثل تھی کمتر نہ تھی کیوں کہ بتدریج پختگی و توانائی کی طرف لے جانے کے لئے اصل تکمیل وارتقاء ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لقد جئتكم بها بيضاء نقية ولو كان	میں تمہارے پاس صاف اور ستھری ملت حنفیہ
موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی ؎	لایا ہوں اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان
	کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا۔

دوسری روایت میں ہے

والذی نفس محمد بیدہ لو بدا لکم	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان

---

(۱) و ؎ مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۰۷

؎۳ احمد و مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ الفصل الثانی

موسیٰ فاتبعتموہ وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل ولوکان حیًا وادرک نبوتی لاتبعنی[1]

ہے اگر تمھارے سامنے موسیٰؑ ظاہر ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کرو تو سیدھی راہ سے گمراہ ہو جاؤ گے اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے اور میری نبوۃ کو پاتے تو وہ میری اتباع کرتے۔

بحیثیت مجموعی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم | نسخ و نسیان ہی کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کی نہ تصدیق کا حکم دیا اور نہ تکذیب کا بلکہ بحیثیت مجموعی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا۔

لاتصدقوا اھل الکتب ولاتکذبوھم وقولوا اٰمنا باللہ وما انزل الینا الآیۃ[2]

تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو بلکہ یہ کہو کہ ہم اللہ پر اور ان کتابوں پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئیں۔

نسخ و نسیان دونوں کا تعلق پہلی کتابوں سے ہے جیسا کہ اس سے اوپر کی آیت مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ الخ سے ظاہر ہے نسیان کی صورت اس لئے کہ جب تک حفاظت و یاد رکھنے کا قدرتی انتظام نہ ہو استداد زمانہ کی وجہ سے تعلیم فراموش ہو جاتی ہے۔ چونکہ انسانیت کی پختگی و توانائی سے پہلے چونکہ کتاب الٰہی میں تسلسل و ارتقاء پایا جاتا رہا اس بناء پر حفاظت و یاد رکھنے کا کوئی قدرتی انتظام نہ کیا گیا البتہ نسخ کا تعلق

نسخ کی حقیقت | سمجھنے کے لئے اس کی حقیقت جاننا ضروری ہے۔ لغت کی کتابوں میں نسخ کی یہ حقیقت بیان کی گئی ہے۔

ازالۃ الحکم بحکم یتعقبہ[3] کسی حکم کو بعد کے حکم سے زائل کرنا۔

---

[1] مشکوٰۃ باب الاعتصام الفصل الثالث [2] ایضاً الفصل الاول
[3] راغب اصفہانی المفردات فی غریب القرآن

ابطال الشئ واقامۃ آخر مقامہ[1]	شی کو باطل کرکے اس کی جگہ دوسری شی رکھنا
نسخ الآیۃ بالآیہ ازالۃ حکمھا[2]	ایک آیت کو دوسری آیت سے منسوخ کرنا اس کے حکم کو زائل کرنا ہے۔
النسخ ان تزیل امراً کان من قبل العمل بہ ثم تنسخہ بحادث غیرہ[3]	نسخ یہ ہے کہ پہلی بات جس پر عمل کیا جاتا ہو اس کو زائل کرکے اس کی جگہ نئی بات رکھی جائے۔
النسخ ان تعمل بالآیۃ ثم تنزل آیۃ اخریٰ فتعمل بہا و تترک الاولیٰ[3]	نسخ یہ ہے کہ کسی آیت پر عمل کیا جائے پھر دوسری آیت عمل کے لئے نازل ہو اور پہلی چھوڑ دی جائے
النسخ ابطال شئ واقامۃ غیرہ مقامہ[3]	نسخ کسی شی کو باطل کرکے اس کی جگہ کسی اور شی کو کرنا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ نسخ کی حقیقت ردّ و بدل کرنا ہے یعنی ایک حکم کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا حکم رکھنا جس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کہ خامی دور کرکے بتدریج ترقی دینا مقصود ہو۔ جوہرِ انسانیت کی پختگی و توانائی کے بعد چوں کہ یہ مقصود نہیں باقی رہتا اس بنا پر نسخ کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ ایسی حالت میں نسخ کا تمام تر تعلق پہلی کتابوں سے قائم ہوتا ہے آخری کتاب (قرآن حکیم) چوں کہ پختگی و توانائی کے بعد نازل ہوئی اس بنا پر "نسخ" سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

قرآنی احکام میں ازالہ نہیں بلکہ "امالہ" کی ضرورت ہے پختگی و توانائی کے بعد جو چیز مقصود بنتی ہے وہ اعتدال و توازن برقرار رکھنا ہے جن کے لئے حکم کے ازالہ کی نہیں بلکہ "امالہ" کی ضرورت ہے "امالہ" کا تعلق حکم کے ردّ و بدل سے نہیں بلکہ اس کے نفاذ سے ہے یعنی حکم کو برقرار رکھتے ہوئے نفاذ کے وقت اُس کے اوصاف میں تبدیلی کر دی جائے مثلاً حالات کے لحاظ سے۔

---

[1] ابن منظور۔ لسان العرب فصل النون حرف الخاء
[2] سید محمد مرتضیٰ زبیدی۔ تاج العروس جزء ثانی فصل النون باب الخاء، [3] ایضاً۔
[3] محمد طاہر پٹنی مجمع بحار الانوار ج ۳ نسخ۔

۱۔ عام کو خاص بنا دیا جائے۔

۲۔ مطلق کو مقید کر دیا جائے۔

۳۔ وسعت کو محدود کر دیا جائے۔

۴۔ کسی شرط یا صفت کا اضافہ کر دیا جائے۔

۵۔ بعض صورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

۶۔ عارضی طور پر نفاذ کو روک دیا جائے وغیرہ۔

ایک مثال سے وضاحت | اس کی مثال ماہر طبیب کے اس نسخہ کی ہے جس کو وہ نبض کی حرکت مریض کی حرارت مرض اور مزاج کی کیفیت قویٰ عمر اور موسم کو ملحوظ رکھ کر تجویز کرتا ہے اور پھر مریض بدن اور موسم کے احوال میں تبدیلی کے ساتھ نسخہ میں معمولی تبدیلی کرتا رہتا ہے اگر سابقہ حالت پھر واپس آجاتی ہے تو سابقہ لکھی ہوئی دوائیں دوبارہ استعمال کرانے لگتا ہے بعینہٖ اس کا یہی طرزِ عمل تجویز کی ہوئی غذا کے بارے میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں نہ نسخہ کی کسی دوا کو نظر انداز کیا جا سکتا اور نہ طبیب کے اختیارِ تمیزی کو سلب کیا جا سکتا ہے۔

یہ "امالہ" گویا طبیب کا اختیارِ تمیزی ہے جس کے لئے ہماری زبان میں موقع و محل کی تعیین کا لفظ زیادہ موزوں ہے اور اس کے لئے احکام منصوصہ و غیر منصوصہ کی تخصیص نہیں ہے۔ امالہ

ثبوت میں ایک آیت | یا اوصاف میں تبدیلی کا ثبوت بڑی حد تک قرآنِ حکیم کی اس آیت میں ہے۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (النحل رع ۱۴)

جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے گھڑ لیا ہے ایسا نہیں ہے بلکہ ان میں کے اکثر نہیں جانتے ہیں۔

اس آیت میں ابدال کے بجائے "تبدیل" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد کہیں ذات کی تبدیلی اور کہیں صرف اوصاف کی تبدیلی ہوتی ہے ذات اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔

التبدیل التغییر مطلقا اما فی الذات کتبدیل الدراھم بالدنانیر او فی الاوصاف کتبدیل الفضۃ خاتماً[1]

"تبدیل" سے مطلقاً بدلنا مراد ہے خواہ ذات میں ہو جیسے درہم کی تبدیلی دینار کے ساتھ یا اوصاف میں ہو جیسے چاندی کی تبدیلی انگوٹھی کی شکل میں۔

ابدال اور تبدیل کا یہ فرق بیان کیا گیا ہے

ان التبدیل تغییر الصورۃ الی صورۃ اخری والجوھرۃ بعینھا والابدال تنحیۃ الجوھرۃ واستئناف جوھرۃ اخری[2]

تبدیل صرف صورۃ کو بدلنا ہے اصل جوہر اپنی جگہ باقی رہے اور "ابدال" جوہر کو بدلنا ہے کہ اس کی جگہ دوسرا جوہر آجائے۔

کلام عرب میں دو محاورہ ہیں۔

ابدلت الخاتم بالحلقۃ

بدّلت الخاتم بالحلقۃ

دونوں کے استعمال میں فرق ہے پہلا اس وقت استعمال ہوتا ہے جب انگوٹھی کو ہٹا کر چھلا اُس کی جگہ رکھ دیا جائے اور دوسرا اُس وقت جب کہ انگوٹھی کو پگھلا کر چھلا بنا لیا جائے، پہلے میں اصل "جوہر" بدل جاتا ہے اور دوسرے میں جوہر باقی رہتا ہے صرف اوصاف میں تبدیلی ہوتی ہے[3]

لفظ تبدیل کا استعمال | قرآنِ حکیم میں لفظ تبدیل کا استعمال دونوں طرح ہے۔

ذات کی تبدیلی مثلاً

فاولٰئک یبدل اللہ سیاٰتھم حسنٰت

یہی لوگ ہیں کہ اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے

---

[1] شیخ محمد طاہر پٹنی۔ مجمع بحار الانوار ج ۱

[2] محمد مرتضیٰ زبیدی تاج العروس جزء سابع فصل الباء من باب اللام۔ [3] ایضاً

(الفرقان ع ٦) بدل دے گا۔

صرف اوصاف کی تبدیلی مثلاً

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا (النساء ع ۸) جب کبھی ان کی کھال جل جائے گی تو ہم اس کی جگہ دوسری کھال بدل دیں گے۔

پہلی کتابوں میں رد و بدل کا ذکر لفظ "نسخ" کے ساتھ اور آخری کتاب (قرآنِ حکیم) میں بدلنے کا ذکر لفظ تبدیل کے ساتھ خود اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں "تبدیلی" سے مراد صرف اوصاف کو بدلنا ہے ذات اپنی جگہ برقرار رہتی ہے جیسا کہ اس کی تائید رسول اللہ اور صحابہ کرام کے فیصلوں نیز متقدمین کے طرزِ عمل سے ہوتی ہے مثلاً۔

رسول اللہ کے فیصلوں سے اوصاف کی تبدیلی کی مثالیں

قرآنِ حکیم میں حدود قائم کرنے کا حکم عام ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جنگ اور دشمن کی سرزمین میں حدود قائم کرنے سے منع کیا ہے

لا تقطع الايدی فی الغزو[1] غزوہ میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔

لا تقطع الايدی فی السفر[2] سفر میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔

(۲) اجنبی عورتوں کی طرف دیکھنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ وساوس شیطان دفسانہ کا دفعیہ ہو اور اللہ کی حرمتیں محفوظ رہیں لیکن جس سے شادی کا ارادہ ہو رسول اللہ نے اس کو دیکھنے کی اجازت دی۔

انظر اليها فانه احری ان يؤدم بينكما[3] اس کو دیکھ لو اس سے آپس میں الفت و محبت کی زیادہ امید ہے۔

(۳) ایک شخص نے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جس سے میرے اوپر حد لازم آتی ہے آپ حد جاری کر دیجئے اس پر آپ نے فرمایا

---

[1] و [2] مشکوٰۃ باب قطع السرقۃ

[3] احمد و ترمذی و مشکوٰۃ باب النظر الی المخطوبۃ

الیس قد صلیت معنا قال نعم قال فان اللہ قد غفرلک ذنبک او حدک[1]	کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی اس نے عرض کیا ہاں پڑھی ہے آپ نے فرمایا اللہ نے تمہارا گناہ یا تمہاری حد معاف کردی۔

معافی کا اثر اُس شخص پر یہ ہوا کہ اُس نے شراب نوشی سے توبہ کرلی بعض روایتوں میں ہے کہ اُس نے کہا آپ کے کوڑوں کے خوف سے شراب چھوڑنے میں اپنی توہین سمجھتا تھا لیکن جب آپ نے معاف کردیا تو واللہ اس ملعون کو کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

(۴) زناء کے ایک واقعہ میں مجرم کی جگہ غیر مجرم پکڑ لیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سزا کا حکم بھی سنا دیا لیکن بعد میں مجرم نے خود ہی اپنے جرم کا اقرار کرلیا اور ماخوذ شخص کو اس سے بری قرار دیا۔ یہ صورت دیکھ کر رسول اللہ نے دونوں کی سزا معاف کردی ماخوذ شخص کی اس بناء پر کہ وہ اصل مجرم نہ تھا اور مجرم کی اس بناء پر کہ محض دوسرے کی جان اور حق کے تحفظ کی خاطر اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔

حضرت عمرؓ نے اس خیال سے کہ اعتراف جرم کے بعد سزا نہ دینا مجرم کی حوصلہ افزائی ہے رسول اللہ سے سزا دینے کی درخواست کی تو آپ نے انکار فرمایا

فابی رسول اللہ فقال لانہ قد تاب الی اللہ[2]	آپ نے انکار کیا اور فرمایا کہ اللہ کی طرف اس نے رجوع کرلیا ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جن کو رسول اللہ کی مخصوصات (جو آپ کے لئے خاص ہیں اور کسی عام قاعدہ و قانون کے تحت نہیں آتے) قرار دے کر نظر انداز کردیا جاتا ہے حالاں کہ ان سے اوصاف کی تبدیلی کا بہترین ثبوت ملتا ہے۔

صحابہؓ کے فیصلوں سے اوصاف کی تبدیلی کی مثالیں

صحابۂ کرام کے فیصلوں میں بھی اوصاف کی تبدیلی کی بکثرت مثالیں ہیں یہاں صرف حضرت عمرؓ کے چند فیصلے ذکر کئے جاتے ہیں کہ ان کے سمجھنے میں

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ [2] ابن قیم۔ اعلام الموقعین ج ۳ فصل فی تغیر الفتوی

لوگ طرح طرح کی غلط فہمیوں کے شکار ہوئے ہیں

(۱) حضرت عمرؓ نے کتابیہ (اہلِ کتاب) عورت سے نکاح کرنے کی ممانعت کر دی حالانکہ قرآن حکیم میں اس کی اجازت موجود ہے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (المائدہ ع ۱)	اور اہلِ کتاب کی پاکدامنہ عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں

ابو بکر جصّاص نے ممانعت کے سلسلہ میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

"حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودیہ عورت سے نکاح کیا جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو ہوئی تو انھوں نے علیحدگی کا حکم دے دیا حذیفہؓ نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ حرام ہے؟ اس پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں حرام تو نہیں کہتا ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم لوگ بدکار عورتوں کے جال میں پھنس جاؤ گے[۱]"

امام محمد نے مدائن کا مذکورہ واقعہ بیان کر کے حضرت عمرؓ کا یہ جواب ذکر کیا ہے۔

فانی اخاف ان یقتدی بک المسلمون فیختاروا نساء اھل الذمۃ لجمالھن وکفی بذالک فتنۃ لنساء المسلمین[۲]	میں ڈرتا ہوں کہ دوسرے مسلمان تمھاری پیروی کریں گے اور ذمیہ (کتابیہ) عورتوں کی خوبصورتی کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ان کو ترجیح دیں گے یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ مسلمان عورتوں کے لئے فتنہ بن سکتی ہے۔

(۲) بیت المال (سرکاری خزانہ) میں چوری سے ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں دیا اور فرمایا کہ بیت المال میں سب کی شرکت ہے۔

لیس علیہ قطع[۳]	ایسے چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

---

[۱] ابو بکر جصاص۔ احکام القرآن ج ۲ باب تزوج الکتابیات۔
[۲] محمد۔ کتاب الآثار باب تزوج الیہودیۃ والنصرانیۃ۔
[۳] ابو یوسف۔ الخراج فصل ما یجب فیہ الحدود فی سرقۃ۔

ایک خادم نے مالکہ کے آئینہ (جس کی قیمت ساٹھ درہم تھی) کی چوری کی حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اس کا ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا۔

خادمکم سرق متاعکم[1]   تمھارے خادم نے تمھارے مال کی چوری کی

اُن غلاموں کو بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جنھوں نے ایک اونٹ چرایا تھا جب انکلیں معلوم ہوا کہ غلاموں کا مالک ان کو ننگا بھوکا رکھتا ہے۔ چنانچہ حکم واپس لیتے ہوئے فرمایا

اراك تجيعهم[2]   میں دیکھتا ہوں کہ تم ان کو بھوکا رکھتے ہو

اسی طرح قحط سالی میں چوری سے ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں دیا۔

لا تقطع اليد فی عذق وعام سنة[3]   خوشہ کی چوری اور قحط سالی میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔

جب کہ قرآنِ حکیم کی آیت عام ہے اس میں نہ کوئی تخصیص ہے اور نہ استثنا ہے

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا (المائدہ ع ۶)   چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کا ہاتھ کاٹ دو

یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے ہٹانے کا حکم دیا حالانکہ قرآنِ حکیم میں ان کا ذبیحہ حلال کیا گیا ہے

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ (المائدہ ع ۱)   اور اہلِ کتاب کا ذبیحہ تمھارے لئے حلال کیا گیا ہے۔

(۴) اس صورت میں پورا مہر واجب کیا جس میں شوہر اور بیوی کے درمیان خلوت صحیحہ ہو اور پھر طلاق ہو جائے۔

عن عمرؓ فی اغلاق الباب وارخاء الستر انه يوجب المهر[4]   دروازہ بند کر دینے اور پردہ گرا دینے سے وہ مہر واجب کرتے تھے۔

---

[1] مالک۔ مؤطا باب لاقطع فیہ [2] ایضاً [3] ابن قیم۔ اعلام الموقعین ج ۳ المثال الثالث فی سقوط الحد [4] اسمٰعیل بن یحییٰ المزنی مختصر المزنی باب الحکم فی الدخول و اغلاق الباب الخ برحاشیہ کتاب الأم للشافعی ج ۲

حالاں کہ قرآنِ حکیم میں ہے کہ نکاح کے بعد اگر کوئی شخص تعلقات کی ادائیگی کے بغیر طلاق دے تو نصف مہر واجب ہوتا ہے۔

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ (البقرہ ع)	اگر تم عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دو اور ان کا مہر مقرر کیا ہو تو مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جو حالات کے لحاظ سے حکم کے اوصاف میں تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں یعنی حکم اپنی جگہ برقرار رہتا ہے اور حالات کے لحاظ سے اس کے اوصاف میں تبدیلی ہوتی ہے جو اُسی وقت تک برقرار رہتی جب تک حالات باقی رہتے ہیں

متقدمین کے نزدیک نسخ کا استعمال

غالباً ان مثالوں ہی کے پیشِ نظر متقدمین نے قرآنِ حکیم میں "نسخ" کا استعمال تبدیلی اوصاف کے مفہوم میں کیا ہے ابن قیمؒ کہتے ہیں

ان النسخ عند المتقدمین رفع دلالۃ العام والمطلق والظاھر وغیرھا تارۃ اما بتخصیص او تقیید او حمل مطلق علی مقید وتفسیرہ وتبیینہ حتی انھم سمون الاستثناء والشرط والصفۃ نسخا لتضمن ذلک رفع دلالۃ الظاھر وبیان المراد فالنسخ عندھم وفی لسانھم ھو بیان المراد بغیر ذلک بل بالخارج عنہ۔[1]	نسخ متقدمین کے نزدیک عام مطلق اور ظاہر وغیرہ کی دلالت اُٹھا دینے کو کہتے ہیں کبھی عام کو خاص یا مطلق کو مقید بنایا جاتا یا مطلق کو مقید پر حمل کر کے اس کی تفسیر و توضیح کی جاتی ہے یہاں تک کہ استثناء۔ شرط اور صفت کو بھی "نسخ" کہا جاتا ہے کیوں کہ ان کے ذریعہ بھی ظاہر کی دلالت اٹھا دی جاتی اور مراد کو بیان کیا جاتا ہے "سلف" کی زبان میں "نسخ" مراد کے بیان کا نام ہے یہ بیان اس لفظ کے غیر بلکہ کسی امر خارج سے بھی ہوتا ہے۔

[1] ابن قیم۔ اعلام الموقعین ج ا فصل المراد بالنسخ عند عامۃ السلف۔

دوسری جگہ ہے۔

هو رفع الظاهر لتخصيص او تقييد او شرط او مانع فهذا اكثر من السلف يسميه نسخاً[1]	کسی تخصیص - تقیید - شرط یا مانع کی وجہ سے ظاہری حمل کو نظر انداز کرنا عمومی طور پر سلف اس کا نام "نسخ" رکھتے ہیں۔

حکم کو برقرار رکھتے ہوئے اُس کے اوصاف میں تبدیلی کی بکثرت مثالیں راقم کی کتاب "احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت" میں ملیں گی۔ حالات کے لحاظ سے احکام کے نفاذ میں اگر اوصاف کی تبدیلی نہ تسلیم کی جائے تو قرآنِ حکیم کے آخری و دوامی شکل مجروح ہوتی اور صلاحیتوں کی ضابطہ بندی میں اعتدال و توازن برقرار رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ اوصاف میں تبدیلی کے بعد پھر رہتی دنیا تک کسی نئی کتاب (کلام الٰہی) کی ضرورت نہیں رہ جاتی یہی آخری کتاب ہر دور و زمانہ کے لئے کافی ہوتی ہے۔ صرف اس کی حفاظت کا سوال رہتا ہے جس کی ذمہ داری اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

اوصاف میں تبدیلی ہی سے قرآن کی آخری و دوامی شکل برقرار رہتی ہے

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (حجر ع ۱)	ہم نے ہی قرآن اتارا اور ہم ہی اُس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن کی حفاظت کا جو انتظام ہے اور جس طرح وہ محفوظ ہے تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ قدرتی انتظام و حفاظت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ (باقی)

---

[1] ابن قیم - اعلام الموقعین ج ا فصل المراد بالنسخ عند عامة السلف۔

مقصود تخلیقِ کائنات

(۲)

جناب غلام نبی صاحب مسلم لاہور

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کی ہوئی امت اب ہمیں انتہائی بلندی پر نظر آتی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں نے تمھیں دنیا میں برگزیدہ کیا، منتخب کیا، چن لیا، تم اس زمانے میں بہترین اُمّت ہو، اور یہ شرف قیامت تک حاصل رہے گا، تمھارے بعد اب کوئی دوسری امت نہیں ہوگی، تمھاری اتباع ہی اب رضائے الٰہی کے حصول اور ارتقائے انسانیت کی ضامن ہے۔ تمھیں عین تمھاری فطرت کے مطابق کتاب ہدایت دی گئی ہے۔ جس کی پیروی میں کوئی الجھن اور مشکل نہیں، تم ہی وہ امت مسلمہ ہو، جس کے لئے تمھارے آبا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے دعا کی تھی، تم ہی حاصلِ کائنات ہو، اور قرآن حکیم میں بھی تمھیں یہی نام دیا گیا ہے، تم دنیا میں اللہ کی ہستی، خاتم الانبیاؐ کی صداقت اور قرآن پاک کی تعلیمات کی عظمت پر گواہ ہو، تمھارا فرض ہے، کہ تم اپنے علم و عمل سے اسلام کی صداقت دنیا میں ظاہر کرو، خدمتِ خلق اور حسن سلوک کے ذریعے امتِ خیر ہونے کا ثبوت مہیا کرتے رہو، اور قیام حق، استیصال باطل، اور استحکام عدل و انصاف کے لئے متواتر جہاد کبیر کرتے رہو، حتیٰ کہ تم باطل کو کچل ڈالو، اسلام کو غالب کرو، اور ظلم و جور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۱۱۰)

تم سب سے زیادہ نفع رساں اُمت ہو، جو لوگوں کی بھلائی کے لئے ظاہر کی گئی ہے، تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں کی بیخ کنی کرتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو"

اس امت کا اولین فریضہ یہ قرار پایا کہ وہ اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں قیامت تک يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کے مقصد خداوندی کی تکمیل و تعمیل کرتی رہے، دنیا میں قرآنی تعلیمات پہنچاتی رہے، نوعِ انسان کا تزکیہ کرے، اور انھیں کتاب حکمت کی تعلیم دیتی رہے،

انبیأ کی موعود امتِ مسلمہ گذشتہ سطور میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ تخلیقِ آدم سے اللہ تعالیٰ کا منشا، ایک امتِ مسلمہ کا قیام تھا، جو دنیا میں آسمانی تعلیمات اور روحانی اقدار کی نمائندہ وحامل ہو، جو نہ صرف خود عدل وانصاف پر قائم ہو، بلکہ برادرانِ نوع کو اس کی دعوت دے اور نوعِ انسان کو انجامِ کار حسنِ نظر و کردار کی بلندیوں پر پہنچا کر دنیا کو امن وسکون کا گہوارہ بنادے، اس امت کی تشکیل کے لئے ہدایت سماوی کا نزول ہوا، اس کے لئے رسول مبعوث ہوئے اسی کی آرزو اور دعا ابوالانبیا، حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے کی، اسی کی خاطر افضل الرسل خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اور یہ وہی امت ہے۔ جسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تربیت کر کے تیار کیا جو آپؐ کی جانشین ہوئی، اور جس کے سپرد آج بھی نشرِ توحید، قیامِ انسانیت، احترامِ آدمیت، اتحاد و حریتِ عالم اور استحکام عدل وانصاف کا جہاد ہے، حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ۔

یہی وہ امت ہے۔ جس کا پہلی کتبِ مقدسہ بالخصوص توریت وانجیل میں ذکر پایا جاتا ہے، جو يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ کا خلاصہ اور مصداق ہے۔ سورہ

الفتح میں اسی کی تصریح ملتی ہے :

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (الفتح)

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو اُن کے ساتھ ہیں کافروں کے مقابلے میں قوی اور آپس میں رحم کرنے والے آپ ان کو رکوع کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں ، وہ اپنے رب کا فضل اور اُس کی رضا چاہتے ہیں - ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ظاہر ہے، یہ ان کی مثال توریت میں ہے ، اور اُن کی مثال انجیل میں کھیتی کی طرح ہے ، جس نے اپنی سوئی نکالی پھر اسے مضبوط کیا سو وہ موٹی ہوئی پھر اپنی نالیوں پر سیدھی کھڑی ہو گئی - کسانوں کو تو خوش کرتی ہے ، تا کہ ان کی وجہ سے کافروں کو غضب میں لائے ، اللہ نے ان میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں، مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔"

یہ سورۂ الفتح کی آخری آیت ہے ، جو امّت محمدیہ کی تشفی ، کامیابی ، تعلق باللہ ، باہمی محبّت اور عظمت کے اظہار کے لئے نازل کی گئی - اس آیت سے قبل اسی سورت میں اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا کے الفاظ میں فتح کی نوید سنائی گئی ہے ، اور صلح حدیبیہ میں جب ان چودہ سو جاں نثاران اسلام نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا انتقام لینے پر قتال کی بیعت کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے الفاظ میں اپنی رضامندی اور خوشنودی کی دولت سے

نوازا، اور اس بات کی سند عطا کی کہ خدا ان کا محبوب ہے، اور وہ خدا کے محبوب ہیں الغرض
آخر میں اس خلاصۂ انسانیت کے اوصاف عالیہ و صالحہ کو جامع الفاظ میں بیان کر دیا
گیا ہے، جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور جو جماعت ان کے ساتھ شریک
عمل و مجاہدہ ہے وہ دشمنانِ دین کے مقابل قوی اور سخت ہے، اور آپس میں سراپا رحمت
ہے، اس کی ظاہری پہچان یہ ہے کہ وہ خدا پرست ہے، ان کے چہروں پر ایمان کا نور ہے،
اور پیشانیوں پر سجدوں کے نشان، اور جس طرح ان کے پیغمبر کی بشارت کتب سماوی میں ملتی
ہے، اس جماعت کا ذکر بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ اگر توریت میں پیشانیوں پر سجدوں کا نشان ان
کی نمایاں علامت ہے۔ تو انجیل میں انھیں ایسے پودے سے تشبیہ دی گئی ہے، جسے کسان
بوتا ہے، وہ پھوٹتا ہے، اس سے تنا بنتا ہے، پھر وہ مضبوط اور بڑا ہو کر پھل پھول نکالتا
ہے، مخلوقِ خدا اُس سے مستفیض ہوتی ہے، کسان تو اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا، لیکن
اس کے دشمن حسد کی آگ میں جل جاتے ہیں، اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت
مسلمہ کا بیج بویا، شب و روز اس کی تربیت فرمائی، حتیٰ کہ یہ امت مضبوط ہو گئی، اس
کی ترقی سے اللہ تعالیٰ کا رسول مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا، مگر برگ و بار سے لدے ہوئے
ان اشجار، آپ کے ساتھیوں، اصحابِ رسولؐ، امتِ مسلمہ کے ملعون و نامراد مخالفین کا
گروہ آتشِ غیظ و غضب میں جلتا رہا اور اب تک جل رہا ہے، جب کہ خدا نے اس امت
کو مغفرت اور تائید سے نوازا اور رسول کی نصرت و اطاعت، خدا پرستی، باہمی محبّت
و ایثار کی وجہ سے مغفرت اور اجرِ عظیم عطا کیا۔

توریت اور انجیل کی اس موعود و مبشّر جماعت کی تعریف قرآنِ پاک میں قدرے
تفصیل کے ساتھ ایک دوسرے مقام پر بھی کی گئی ہے، اور اس تعریف میں بھی حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ یہ امت دنیا بھر میں منفرد نظر آتی ہے، جیسا کہ
ارشادِ الٰہی ہے :-

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبہ)

"اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں۔ اس کے بدلہ میں ان کے لئے جنت ہے، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، سو وہ مارتے ہیں اور مرتے ہیں، یہ وعدہ اس کے ذمہ سچا ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے؟ سو اپنے سودے پر جو تم نے اُس سے کیا ہے، خوش ہو جاؤ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔"

یہ آیت سورۂ توبہ کی ہے، اور آں حضرت صلعم کے آخری ایام کی، جب کہ اصحابِ رسولؐ، اُمتِ مسلمہ، صلحائے ملت اکیس سال کی صبر آزما قربانیوں اور دس سال کی جنگوں اور مالی ایثار کے بعد آخری غزوۂ تبوک سے فائز و کامران لوٹے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے پھر انھیں تیسری بار رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کی بشارت سے نوازا تھا، اور اس کے بعد پھر انھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جنگ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی، انھوں نے خدا اور رسولؐ سے ایفائے عہد کیا تھا اور فوز عظیم کی خوش خبری حاصل کی تھی۔

تاریخ کے اوراق الٹئے اور بار بار اُلٹئے اور بتایئے کہ دُنیا میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ امتِ مسلمہ کے سوا دوسری کون سی امت گزری ہے جس نے آئندہ زندگی میں رضائے الٰہی کی خاطر، اس دنیا میں اپنی جان، مال، عزت، گھر بار اہل و عیال، غرضیکہ ہر شے کی محبت کو قربان کر دیا، اور بڑے سے بڑا ابتلا ان کے قدموں کو متزلزل نہ کر سکا

تزکیہ و تشکیل اُمتِ مسلمہ کی مسلسل صبر آزما داستان

انبیاء کے موعود اور میثاق النبیین کی مصداق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں مکہ مکرمہ میں جلوہ افزائے عالم ہوئے۔ دنیا بالخصوص

متمدن دنیا کا مرکزی مقام ہونے کی وجہ سے نشر و اشاعتِ توحید کے لئے مکہ موزوں ترین مقام تھا، اپنی دیگر خصوصیات کی وجہ سے بھی ضروری تھا۔ کہ مکہ ہی میں خدا کا آخری نبیؐ، خدا کا آخری کامل پیغامِ ہدایت لے کر مبعوث ہو جو دنیا میں نشرِ وحدانیت، امنِ عالم اور وحدتِ نسلِ انسانی کی بنیاد رکھے اسی جگہ بتکدۂ عالم کے درمیان موحدِ اعظم حضرت خلیل اللہ کا تعمیر کردہ بیت اللہ موجود تھا جو خاص طور پر خالص توحید کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس بیت اللہ کی بنیادوں میں اُس عشق و محبت الٰہی کی روایات کا سمنٹ بھر اگیا تھا جو حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے قائم کی تھیں، چنانچہ دنیا میں یہی ایک مقدس جگہ تھی، جہاں بت پرستی کے باوجود صدیوں سے، ہر سال لاکھوں انسان خانہ کعبہ کا طواف کرتے اور اللھم لبیك لا شریك لك کا بلند آواز سے اعلان کرتے چلے آتے تھے، مکہ ہی میں خانہ کعبہ، صفا، و مروہ اور چشمہ زمزم کی شکل میں وہ آثار و نشانات موجود تھے، جو سیدنا ابراہیمؑ، سیدہ ہاجرہؑ اور سیدنا اسماعیلؑ کے بے نظیر ایثار، عشقِ الٰہی اور اطاعتِ خداوندی کا اظہار کرتے تھے۔ اور جس کی یاد عملاً ہر سال زائرینِ بیت اللہ کے قلوب میں تازہ ہوتی رہتی تھی، یہی وہ مقام تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ نے کفر و شرک کے تہذیبی و مادی مراکز سے بہت دُور، اپنے فرزند اسماعیلؑ کو آباد کیا تھا۔ تاکہ وہ کفر زارِ عالم میں شمع توحید و ایمان روشن رکھیں، پھر شرق و غرب، شمال و جنوب کے درمیان تجارت مکہ مکرمہ کی راہ سے ہوتی تھی، اور قافلے یہاں سے گزرتے تھے، خود قریش مکہ تجارتی قافلے لے کر ایران، روم، مصر، یمن اور حبش تک جاتے تھے، مگر وہاں کے ادیان و مراسم سے باخبر ہونے کے باوجود اپنے آبائی طریق پر کم و بیش قائم تھے اور کعبہ کے قرب نے انھیں دوسری طرف جھکنے سے روکے رکھا، یہی ریگ زار اور بے آب و گیاہ خطہ تھا، جہاں کے خود سر، اکھڑ، جری، نڈر، صحرائی لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اور اس عظیم اور جرآت آزما پیغام کو قبول کرنے اور اسے اقصائے عالم میں پہنچانے

کے لئے موزوں و منفرد تھے، چنانچہ منشائے الٰہی اور آرزوئے ابراہیمؑ کی تکمیل کے لئے خاتم الانبیاء، رحمۃ للعالمین، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا، تاکہ آپ ذریتِ خلیل اللہ سے امتِ مسلمہ تیار کر کے قیامت تک باطل پرستوں کے خلاف جہاد کے لئے تیار کر دیں۔ اور یہ حزبُ اللہ شیطانی قوتوں کا سر کچلے اور انسانی معاشرے کو پاک و بلند کر کے پھر سے جنت کی فضاؤں میں پہنچا دے، جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ الٰہی سے اپنی قوم کو لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی دعوت دی، خدائے واحد کی عبادت اور محمدؐ رسول اللہ کی رسالت ایک ایسی اساس، مضبوط و مستحکم اساس تھی، جس پر وحدتِ دین، وحدتِ امت، وحدتِ نوعِ بشر، عدل و انصاف، امنِ عالم اور خوش حالی کی عظیم عمارت تعمیر کی جا سکتی تھی، چنانچہ اس دعوت کو سنتے ہی سعید الفطرت انسانوں کا ایک گروہ آگے بڑھا اور لبیک کہتے ہوئے پکار اٹھا۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِیْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا (آل عمران) "اے ہمارے مولا! ہم نے ایک پکارنے والے کی صدا کو سنا کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ پس ہم ایمان لے آئے ہیں"

لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی دعوت دنیا کی ہر باطل قوت سے ٹکر لینے اور احکامِ الٰہی کے قیام کے لئے دیگر تمام نظاموں کو تہ و بالا کرنے سے عبارت تھی، حضرت رسولؐ اللہ نے یہ دعوت دے کر جہاں انتہائی بلندیوں کی طرف اٹھایا وہاں مخالفت کے پہاڑوں سے ٹکرانے اور عداوت کے سمندروں کو عبور کرنے کی آزمائش میں ڈالا، ان حالات میں جس خوش نصیب فرد نے آمنّا کا نعرہ لگایا اس کے ایمان کی نظیر دوسری امتوں میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بالخصوص جس ماحول میں یہ دعوت دی اور قبول کی گئی، وہ وحشت، غیر ذمہ داری، لاقانونیت، ظلم و شقاوت، قتل و غارت، خود سری و خود پرستی، نسب و نسل پر فخر و غرور کا خوفناک مرقع تھا، اور

اہلِ مکہ، مجاورانِ حرم، تو خاص کر معبودانِ باطل اور آباء و اجداد کے توہمات کے مقابل۔
کسی قربانی اور ظلم سے دریغ نہ کرتے تھے، اور کعبہ کی تولیت نے انھیں عربوں میں جو ممتاز
مقام بخش رکھا تھا، اس نئی دعوت کو قبول کر کے اس سے کسی قیمت پر دست بردار ہونا ان
کے اقتدار اور منزلت کی موت تھا، اور دنیا میں کوئی فرد یا گروہ جیتے جی اپنی عزت، شہرت،
وقار اور رسوخ کے محضر موت پر بخوشی دستخط نہیں کرتا۔

تدریجی تزکیہ و تطہیر کا مختصر سا جائزہ | جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اسلام کی
دعوت دی تو قریش مکہ اور اہلِ عرب نہ صرف بتوں کے پجاری تھے، بلکہ وہ رنگ، نسب اور
دولت پر مبنی امتیازات کا بھی شکار تھے، پھر وہ اخلاقی لحاظ سے خواہشاتِ نفسانی کے
غلام اور حیوانی تقاضوں کی آہنی گرفت میں تھے، اور اس ضمن میں کسی قسم کی اخلاقی پابندیاں برداشت
کرنے کو تیار نہ تھے، ایسے حالات میں ہر قبیلے اور خاندان کے سعید الفطرت افراد دائرہ اسلام
میں داخل ہونے لگے، ان کا تعلق مکہ کے چھوٹے بڑے سبھی قبائل سے تھا اور چوں کہ اس
زمانے میں قبیلے کے استحکام، بقا اور دوام ہی دوسری ہر شے پر مقدم تھا۔ اور اسلام قبول کرنے
کا مطلب یہ تھا کہ کسی قبیلے کا فرد اسلام قبول کر کے اپنی اطاعت، عقیدت اور وفاداری قبیلہ
سے باہر، پیغمبر اسلام سے وابستہ کر چکا ہے اپنے قبیلے کے دین، رسومات اور عصبیت سے منحرف
ہو گیا ہے۔ اور قبیلے کو چھوڑ کر غلاموں، ضعیفوں، عجمیوں اور دشمنوں پر مشتمل جماعت کا رکن بن
گیا ہے۔ اس لئے ہر قبیلے میں اضطراب اور نفرت کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے پوری قوت سے
اسلام کی عالمگیر تحریک کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے والوں میں احرار و اشرافِ قریش
بھی تھے اور غلام بھی، ان میں دولت مند بھی تھے اور مفلس و نادار بھی، عربی بھی تھے اور عجمی بھی،
چنانچہ جوں ہی آپ نے تبلیغ کی ابتدا کی آپ کی رفیقۂ حیات ام المومنین خدیجہؓ اور آپ کی
صاحبزادیاں سیدہ زینبؓ، سیدہ رقیہؓ، خورد سال سیدہ فاطمہؓ اور سیدہ ام کلثوم، آزاد کردہ

غلام حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، اسلام پر ایمان لانے والوں میں زندگی کے قریب ترین رفقاء کی شرکت بانیٔ اسلامؐ کے کردار کی بلندی اور صداقت پر نشان ہے، بیوی (خدیجہؓ) دوست (ابو بکر صدیقؓ) اور خادم (زید بن حارثہؓ) سے آپ کی حیاتِ طیبہ کا کون سا گوشہ پوشیدہ تھا، اور ان تعلقات کے پیش نظر عام حالات میں آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر لینا اور اپنی زندگی آپؐ کی اطاعت میں دے دینا، آپؐ کی غیر معمولی شخصیت اور عظمت کی بدولت ہی ممکن تھا، لیکن آپؐ کی عظمت، بے داغ زندگی اور امانت داری پر آپ کا یہ اعلان بھی شاہد تھا کہ لَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ میں نے تم ہی میں پیدا ہو کر تمھارے درمیان بچپن اور جوانی کے مسلسل چالیس سال گزارے ہیں جس کی پاکیزگی پر بچہ بچہ گواہ ہے، پھر تمھیں میرے دعویٰ رسالت پر کیا اعتراض اور شک ہے نیز لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ کے الفاظ بھی آپ کے کردار عالیہ پر غور کی دعوت دیتے ہیں۔ کہ یہ رسول تمھارے ہی شہر، تمھاری ہی نسل وقوم تمھاری ہی زبان سے تعلق رکھتا ہے اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تمھارے درمیان تمھاری نگاہوں کے سامنے گزرا، اس نے تمھارے دکھ درد، شادی غمی میں شرکت کی ہے، اور تم ان کی دیانت، امانت، صداقت، عدالت، راست روی اور دل سوزی پر شاہد ہو، ان باتوں کے ہوتے ہوئے تمھارے پاس اسے جھٹلانے اور اطاعت سے انکار کی کیا وجہ اور دلیل ہے

ایک بے نظیر ناصر کی رفاقت ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کو عام کیا تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ہارون علیہ السلام کی صورت میں ایک معاون و ناصر عطا کر دیا تھا، اسی طرح اس مثیل موسیٰؑ کو بھی ابتدا ہی میں سیدنا ابو بکرؓ کی ذات میں ایک پر جوش و مخلص ناصر اور جاں نثار مل گیا، ارشادِ خداوندی ہے:۔

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ اے رسول: اعلان کر دے کہ یہ میرا راستہ ہے،

عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیۡ — میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور وہ بھی جو میرا
(یوسف) پیروی کرتا ہے، دونو بصیرت پر قائم ہیں۔"

اعلانِ رسالت کے بعد آپ کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ
واحد مومن اور متبع ہیں، جنھوں نے ارشادِ خداوندی کے مطابق اتباع کا کامل ترین نمونہ پیش
کیا اور اپنی زبان، دولت اور ایثار سے تاریخِ اسلام کی اور جہاں ابتدا ہی میں آپ کی مبارک
مساعی سے مکہ کے معزز خاندانوں کے بعض چشم و چراغ، حضرت عثمانؓ بن عفان اُمویؓ، حضرت
زبیرؓ بن العوام اسدی، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف زہری، حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ تیمی، حضرت
سعدؓ بن ابی وقّاص وغیرہم امت مسلمہ میں شامل ہو گئے (یہ پانچوں عشرہ مبشرہ میں سے ہیں)
وہاں اس ناصرِ رسول نے مالی قربانی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور مکہ کے جو غلام ایمان لانے کی وجہ
سے کفار کے جور و ستم کا شکار ہو رہے تھے، انھیں زرِ کثیر صرف کر کے ان کے ظالم آقاؤں سے
خرید کر آزاد کر دیا، حضرت بلالؓ، حضرت ابوفکیہہؓ، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت زنیرہ
وغیرہم کو خرید کر آزاد کرنے کا شرف سیدنا صدیق ابوبکر کو ہی حاصل ہے، پھر اسی قدر نہیں
آپ آں حضرت صلعم کے ہمراہ مختلف قبائل میں تبلیغ کے لئے جاتے رہے: اور کئی بار اپنے
آقا کو بچاتے ہوئے خود شدید زخمی ہوتے مکی زندگی میں یہ شرف زیادہ تر صدیق اکبرؓ کو ملا، حتیٰ
کہ ہجرت کے وقت، حضور اکرمؐ کی معیت اختیار کر کے مال و جان کو پیش کر دیا، اور اس ایثار
کے صلہ میں غارِ ثور میں آں حضرت صلعم کی زبانِ مبارک سے اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کی بشارت ابدی
سے شرف یاب ہوئے، مکہ میں تیرہ سال کے عرصہ میں، امت مسلمہ کے اس آیندہ قائد نے
اپنی شہرت، تجارت اور مجلسی وقار و عزت کو حق کی راہ میں قربان کر دیا، اور تاریخ امت کے
اس انتہائی نازک دور میں ایثار و قربانی کی دوڑ میں سب پر سبقت لے گئے، سیدنا صدیق اکبرؓ
جب اتباعِ نبیؐ میں ثابت قدم رہے۔ ہر آزمائش میں پورے اُترے اور ابتلار کی بھٹی سے کندن
بن کر نکلے، تو خوش ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آں حضرت صلعم نے اپنی رحلت کے وقت حج،

تہجد اور صلوٰۃ میں آپ کو امام المومنین بنا دیا، وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

اسلام کے ابتدائی دور میں اہلِ ایمان کی تعداد بتدریج بڑھی، اس لئے آں حضرت صلعم کو جہاں مخالفین میں اشاعت اسلام کی فرصت ملتی رہی وہاں آپ نے پوری توجہ ان نو مسلموں کی دینی تعلیم، تزکیہ نفس، تعمیر اخلاق اور قیادت عالم کی تربیت پر صرف کر دی، اہلِ ایمان کا یہ مختصر گروہ دن میں ایک بار کہیں نہ کہیں محفوظ مقام پر اکٹھا ہوتا، قرآن کی نئی نازل شدہ تعلیمات سے آگاہ ہوتا، آں حضرت صلعم سے معارفِ قرآن سنتا، جماعتی مشکلات پر غور کر کے اُس کا حل سوچتا، برادرانِ نوع کی فلاح و بہبود کے وسائل پر غور کرتا، راتوں کو اُٹھ کر خدا کی عبادت کرتا، جس کی تائید سورۂ مزمل کے الفاظ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ (اے نبی! بے شک تیرا رب جانتا ہے، کہ تو قریب دو تہائی، نصف اور ایک تہائی رات، تہجد ادا کرتا ہے، اور اہلِ ایمان کا ایک گروہ بھی تیری اقتدا کرتا ہے) سے ہوتی ہے پھر یہ گروہ قربِ الٰہی کی اس ساعت میں، بارگاہِ خداوندی میں الحاح و زاری کرتا ہے۔ کہ دنیا میں توحید کا دور دورہ ہو، خدا کا نام بلند ہو، خانۂ کعبہ بتوں کی نجاست سے پاک ہو، ملک میں عدل و انصاف اور امن و امان ہو، جور و ستم ختم ہو، انسان انسان کے استحصال و مظالم سے آزاد ہو، غربت، جہالت اور بد اخلاقی دور ہو، اور ہر طرف اخوت، مساوات اور حریت کی جاں فزا ہوائیں چلیں۔

دعائے ابراہیمی کے ہر دو ثمرات ——— مطہر و مزکی رسولؐ اور امتِ مسلمہ ———

ابتدا میں کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ کی مانند انتہائی کمزور تھے مگر ان کے ایمان چٹانوں کی طرح مضبوط، حوصلے پہاڑوں کی طرح بلند اور ایثار و قربانی کا جذبہ تاریخ عالم میں بے مثال تھا۔ انھیں ہر گونہ مظالم کا نشانہ بنایا گیا، لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ بعثت کے پانچ سال بعد، اس آسمانی باغبان کے لگائے ہوئے اشجارِ امت کی تعداد بڑھ کر ایک سو مرد و زن تک جا پہنچی، اس نو نہال امت کا تنا مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا، اس لئے دشمن کا غیض و

غضب بھی شدت اختیار کر رہا تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ کی سنت کے ان پیرو کاروں نے سنتِ ابراہیمی کو زندہ کیا، اور اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ کا اعلان کرتے ہوئے ایک سو سے زیادہ زن و مرد، رضائے الٰہی کی خاطر، گھربار، مال و دولت، خویش واقارب، اپنے پیارے نبی اور بیت اللہ شریف کا قرب چھوڑ کر مغرب میں سمندر پار ملک حبشہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ تاکہ آزادانہ ایمانی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، ایمان کی خاطر ایسے ایثار کا مظاہرہ اُس اعلیٰ تربیت کا نتیجہ تھا جو ہادی برحقؐ نے ایک قلیل مدت میں فرمائی۔

ان فرزندانِ توحید کے نزدیک قبولِ اسلام محض زبان سے اقرارِ توحید و رسالت کا نام نہ تھا، بلکہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے عبارت تھا، محض زبان سے کسی صداقت کا اقرار اور عملاً اس سے دوری کفر سے چنداں دور نہیں، اور یہ منتخب روزگار رجال تو ایمان لاتے ہی باطل سے ٹکراتے اور اسلامی زندگی کے سانچے میں ڈھل جاتے، گویا کہ وہ چلتے پھرتے اسلام، قرآن اور آں حضرتؐ کا عکس تھے، ان کے نزدیک قرآن کے رنگ میں رنگین ہو جانے اور رسولِ خداؐ کے ہر حکم کی پیروی کا نام اسلام پر ایمان لانا تھا۔ ورنہ کفر اور کھلی منافقت، جس کا نتیجہ دنیا و آخرت میں خدا کی لعنت اور ذلت و رسوائی ہے۔ اہلِ ایمان تو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ اکرمؐ کی محبت سے سرشار ہو جاتے، بدیوں کو پاؤں تلے روندتے، معاشرے کی ہر غیر اسلامی حرکت سے اظہارِ بیزاری کرتے، حسن و احسان کی راہ پر چل نکلتے، اور اس طرح ان کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا، نتیجہ یہ نکلتا کہ اپنے اور بیگانے سب ان کے حسنِ عمل اور اخلاقِ حسنہ سے متاثر ہو کر اسلام کے قریب آجاتے۔ یہی وجہ ہے کہ حبش پہنچنے پر انھیں سر آنکھوں پر جگہ دی گئی، وہ جب تک وہاں رہے، امن سے رہے، اور جب کفارِ مکہ کے رؤسا انھیں واپس لانے کے لئے نجاشی والیٔ حبشہ کے دربار میں پہنچے تو اس نے مہاجر مسلمانوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا، کیا یہ تائیدِ ایزدی ایمان کے بغیر ممکن تھی؟

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "ھُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ

لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ" (اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول ہدایت اور حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے) کا اعلان ایسے حالات اور زمانے میں کیا تھا، جب کہ مسلمان قلیل اور کمزور تھے، اس کے ساتھ ہی آپؐ نے اپنی تبلیغ کو جبر و تشدد سے آزاد اور حق و حکمت کے ساتھ لوگوں تک قرآن پیش کرنے تک محدود رکھا تھا، اور آپؐ کے مٹھی بھر نام لیوا اسی یقین سے سرشار، اپنے قول و عمل سے اسلام کی اشاعت کر رہے تھے۔ مگر بعض اہلِ ایمان ایسے بھی تھے جو کفار کی مادی اور جسمانی قوت کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اور نہایت بے خوفی سے ان کی محفلوں میں اظہار ایمان کرتے تھے، ان کی اس جرأتِ ایمانی سے جہاں کمزور و ناتواں اہلِ ایمان کے حوصلے بلند ہوتے تھے، وہاں مخالفین کے قلوب میں بھی خوف پیدا ہوتا تھا اور اس قسم کے واقعات سے لوگوں کی توجہ بار بار اسلام کی طرف مبذول ہوتی تھی، مکی زندگی میں اس قسم کی بعض نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔

حضرت فاروق اعظم عمر ابن الخطاب مکہ کے مشہور قبیلہ عدی کے فرزند تھے، عین جوانی میں ۲۷ سال کی عمر میں قبول اسلام کی سعادت نصیب ہوئی، اپنی قوت، شجاعت اور شمشیر زنی میں مشہور تھے، قریش مکہ میں معزز مقام رکھتے تھے، اسلام لاتے ہی خدمتِ نبوی میں عرض کی کہ حضورؐ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بتوں کے پجاری، باطل کے پرستار تو حرم کعبہ میں من مانی کریں، اور خدائے واحد کے پرستار دُبکے بیٹھے رہیں، آپ میرے ساتھ تشریف لائیے، اور حرم میں باقاعدہ آزادانہ نماز باجماعت ادا کیجئے دیکھتا ہوں کون ماں کا لال ہمیں روکتا ہے۔ اس پر آں حضرت صلعم صحابہ کے ساتھ اُٹھے، حضرت عمرؓ شمشیر بکف آگے آگے چلے، حرم کعبہ میں پہنچے، مسلمانوں نے پہلی بار وہاں باجماعت نماز ادا کی، اور سیدنا عمرؓ کے خوف سے کسی مخالف کو روکنے کی جرأت نہ ہوئی، اس کے بعد آپ نے کفار کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے ایمان کا اعلان کیا، اور ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی، یہی عمرؓ جب چند سال بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے لگے، تو کھلے بندوں اعلان کیا، کہ کسی کو جرأت ہو تو روکے، مگر کسی کو آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ نہ پڑا، اور وہ

آپ کئی ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ تشریف لے گئے، اسی قسم کا واقعہ سیدنا حمزہؓ کو پیش آیا، ایک دن ابوجہل عمرو بن ہشام مخزومی نے آں حضرت صلعم سے سخت کلامی کی، آپ کے چچا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو معلوم ہوا تو جوش حمیت میں بھتیجے کا انتقام لینے کے لئے ابوجہل کے پاس گئے، اسے سخت سُست کہا اور اپنی کمان سے اسے زخمی کر دیا مگر ابوجہل کو مقابلے کی جرأت نہ ہوئی، اور پھر آں حضرتؐ کی ترغیب و تبلیغ سے اسلام قبول کر لیا، اور کسی کو اُف کرنے کا حوصلہ نہ پڑا، لیکن اس عاشقانہ دلیری سے کفار کے سینوں میں آتش انتقام اور بھڑکتی تھی، اور اس کا ہدف اکثر امتِ مسلمہ کے ضعفاء بنتے تھے۔

کسی باقاعدہ آئین، حکومت، ضابطۂ اخلاق اور نظامِ عدل و امان کی عدم موجودگی میں کسی مومن کی جان، مال اور آبرو مکہ کی سرزمین بے آئین میں محفوظ نہ تھی، لیکن اہلِ ایمان کو کسی حد تک جس بات نے قتل و ہلاکت سے محفوظ رکھا وہ قبائلی عصبیت و حمیت تھی، عرب کے قبائلی نظام میں ایک ایک فرد انتہائی قیمتی ہوتا تھا اور ہر قبیلے کا فرض تھا کہ وہ قبیلے کے ہر فرد کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کرے کیوں کہ کسی قبیلے کی غیرت، عزت، حریت اور مروت کا یہ تقاضا تھا کہ وہ اپنے ہر رُکن کی حفاظت کرے، خواہ اس کا عقیدہ، مذہب چال چلن کیسا ہی کیوں نہ ہو، خود آں حضرت صلعم نے لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کے الفاظ میں اسی قرابت داری کو اپیل کیا، کہ میں تم سے رشد و ہدایت کے صلے میں کسی بات کا طالب نہیں ہوں، لیکن میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت داری ہے اسے نظر انداز نہ کرو یہی وجہ ہے کہ گو بڑے بڑے قبائل کے افراد مسلمان ہوئے لیکن انھیں خاندانی دباؤ یا نفرت کے سوا زیادہ جسمانی تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑا اور جس شخص کا قبیلہ طاقتور ہوتا تھا، دوسرے قبائل اسے قتل کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے، کیوں کہ کسی خاندان کے فرد کی کسی دوسرے قبیلے کی طرف سے ایذا رسانی باہمی جنگ اور شدید خونریزی کی شکل اختیار کر لیتی، خود آں حضرت صلعم کے قبیلہ کے اکثر افراد آپ پر ایمان نہ لائے، آپ کے چچا ابولہب، اس کی بیوی

ام جمیل اور دیگر افراد پریشان کرتے رہے، اور بعض دوسرے لوگ تحقیر آمیز سلوک کرتے رہے۔ لیکن آپ کی جان خطرے میں نہ تھی حتیٰ کہ جب آپؐ کا مجلسی مقاطعہ کیا گیا تو (بجز ابولہب) بنی ہاشم نے مقاطعہ کے خاتمے تک مصائب میں آپؐ کا ساتھ دیا۔ لیکن یہ شہادت نہیں ملتی کہ اس قدر خاندانی عصبیت کے باوجود کوئی آپ پر ایمان بھی لایا ہو، حتیٰ کہ جنگِ بدر میں خاندان کے دیگر افراد تو درکنار ابوطالب عبدِ مناف کے دو بڑے فرزند اور سیدنا علیؓ کے برادران بزرگ طالب اور عقیل، آپ کے چچا عباس اور عمزاد بھائی نوفل بن حارث وغیرہم کفار کی طرف سے آپؐ کے خلاف صف آرا تھے جن میں سے طالب تو قتل ہوا اور عقیل اور عباس گرفتار کر لئے گئے، یہی حال دیگر مسلمانوں کا تھا، چنانچہ ایک بار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کفار کے تشدد سے بے ہوش ہو گئے۔ تو آپ کے قبیلے کے لوگ آپ کو بچا کر لے گئے، حالاں کہ وہ مسلمان نہ تھے، اس کے علاوہ عربوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب کوئی ان سے پناہ طلب کرتا تو پھر ان کا وقار آڑے آتا اور وہ اپنی شرافت و حمیت کے پیشِ نظر پناہ دے دیتے، اور اس طرح کئی مسلمان ان کی پناہ کی وجہ سے محفوظ رہتے، چنانچہ ایک بار حضرت ابوبکر صدیقؓ ہجرت کے ارادے سے مکہ چھوڑ گئے تو قبیلہ قارہ کے رئیس ابن الدُّغُنَّۃ انھیں اپنی پناہ میں واپس لے آئے۔ اور کسی نے آپ کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھا۔ اسی طرح جب آں حضرت صلعم طائف کے حادثہ کے بعد مکہ کو لوٹے تو آپ مکہ میں داخلے کے وقت خطرہ محسوس کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ بنی نوفل کے رئیس مطعم بن عدی کی پناہ میں گھر آئے۔ (باقی)

گزارش

خریداری بُرہان یا ندوۃ المصنّفین کی ممبری کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقع پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس

اور

میرے مشاہدات و تاثرات

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

خواجہ صاحب کے جانے کے بعد میں غسل اور ناشتہ کر کے بیٹھا ہی تھا کہ ہمدرد کے منتظمین میں سے ایک صاحب لاہور کے تازہ پھلوں کی ایک بڑی پلیٹ لے آتے اور اس کے بعد ایک اور صاحب آئے اور رجسٹریشن کے بغیر ہی میرے نام کا تھیلہ کمرہ پر پہنچا گئے، یہ تھیلہ پالش کئے ہوئے اعلیٰ قسم کے سیاہ چمڑے کا تھا، اسے کھول کر دیکھا تو حیرت میں رہ گیا۔ کانفرنس سے متعلق ہر قسم کی معلومات کا پورا لٹریچر، دعوت نامے، پروگرام، اسٹیشنری کا پورا سامان یہاں تک کہ گوند دانی، چھوٹی بڑی پنیں، اور پھر ایک کیس میں بند پلاسٹک کی خوبصورت جانماز، اُس کے ساتھ تسبیح اور ٹوپی بھی، یہ معمولی اور چھوٹی باتیں ہیں لیکن حسنِ انتظام اور خوش سلیقگی کا اندازہ انھیں چیزوں سے ہوتا ہے، کہتے ہیں فرانس میں تو لوگ ایک آدمی کے کلچر کا اندازہ اس سے کرتے ہیں کہ وہ روزانہ کتنا صابون استعمال کرتا ہے۔

لیجئے اب مندوبین اسلام آباد سے اُڑ کر لاہور پہنچنے والے ہیں اس [illegible] ہوٹل کے حصۂ زیریں

میں ایک ہماہمی اور سرگرمی پیدا ہو گئی، آپ شروع سے اُس کی روئداد سُنئیے،

شریک ممالک | اس کانفرنس میں ۴۲ ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی، کانفرنس کی طرف سے شائع شدہ تعارف نامہ کی ترتیب کے مطابق اُن کے نام یہ ہیں :۔ افغانستان، الجزائر، آسٹریا، بحرین، بنگلہ دیش، بلجیم، کناڈا، جزائر کومرو، سائپرس، مصر، فن لینڈ، فرانس، گھانا، انڈیا، انڈونیشیا، ایران، جاپان، اُردن، کینیا، کویت، لبنان، لبیا، ملیشیا، موریتانیا، مارشیس، مراکو، مسقط، ہیدرلینڈ، نائجیریا، فلپائن، سعودی عرب، سنگاپور، سری لنکا، سوڈان، شام، جمہوریہ ٹوگو، ٹرینی ڈاڈ اور ٹوباگو، ٹیونس، ترکی، متحدہ عرب امارات، متحدہ دول برطانیہ و امریکہ، مغربی جرمنی، شمالی یمن، پاکستان۔

بیرونی ممالک کے مندوبین کی تعداد مختلف تھی، کہیں سے دو کہیں سے پانچ چھ، مجموعی طور پر دو سو کے لگ بھگ ہوں گے، ظاہر ہے خود پاکستان کے مندوبین کی تعداد بہت زیادہ ہونی چاہیے تھی، لیکن اُن کو علاقہ وار تقسیم کر دیا گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو اسلام آباد میں مندوب ہیں وہ لاہور، پشاور اور کراچی میں نہیں اور جو مثلاً لاہور میں مندوب ہے وہ دوسرے شہروں میں نہیں، ایسا کرنے سے دو فائدے ہوئے، ایک یہ کہ مجمع کم ہو گیا، دوسرے یہ کہ پاکستانیوں کے قیام کا انتظام ہوٹل میں کرنے کی ضرورت نہ ہوئی، ورنہ سخت دشواری پیش آتی، بیرونی ممالک کے مندوبین میں بعض حضرات مع اپنی بیویوں کے آئے تھے، کانفرنس نے دعوت نامہ میں اس کی اجازت دی تھی۔

مندوبین میں امریکہ اور برطانیہ کے مستشرقین اور خواتین کی بھی خاصی تعداد تھی۔

مندوبین آگے پیچھے اِدھر اُدھر سے ۲ / مارچ کی شام تک کراچی پہنچ گئے، شب ہوٹل میں بسر کی اور دوسرے دن دوپہر تک اسلام آباد آ گئے، یہاں شام کو کانفرنس کا افتتاحی جلسہ ہوا۔ اس میں قرآن مجید کی تلاوت کے بعد پہلے مولانا کوثر نیازی وزیر اوقاف و امور مذہبی (مفصل تعارف اور تذکرہ آگے آئے گا) نے تقریر کی، کانفرنس کی اصل زبان عربی و انگریزی تھی،

ان میں سے کسی ایک میں تقریر یا مقالہ ہوتا تھا تو دوسری زبان میں اُس کا ترجمہ ہوجاتا تھا اور یہ خدمت پوری کانفرنس میں دو صاحبوں نے انجام دی، ایک کویت کے سید یوسف ہاشم الرفاعی اور دوسرے امریکہ کے ڈاکٹر محمد عبدالرؤوف۔ رفاعی صاحب کئی مرتبہ ہندوستان آچکے ہیں اور یہاں کے باخبر لوگوں کے جانے پہچانے ہیں، موخر الذکر اصلاً مصری ہیں اور آج کل واشنگٹن میں اسلامک سینٹر کے ڈائرکٹر ہیں، جامعۂ ازہر سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد فرانس اور انگلینڈ میں تعلیم پائی اس لئے انگریزی اور فرانسیسی دونوں پر تحریر اور تقریر کی قدرت رکھتے ہیں۔

وزیر اعظم مسٹر بھٹو کی افتتاحی تقریر مولانا نے تقریر انگریزی میں کی اُس میں انھوں نے وزیر اعظم کا استقبال کیا اور کانفرنس کی اہمیت، اُس کے اغراض و مقاصد اور اس سلسلہ میں آیندہ جو کام پیش نظر ہیں اُن پر روشنی ڈالی، اس کے بعد مسٹر بھٹو نے حسب معمول ایک طویل تقریر کی اور اُس میں کہا:-

" مقدس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی تعلیمات میری گورنمنٹ کی داخلہ اور خارجہ پالیسی، لیبر، تعلیم اور دوسرے بہت سے امور سے متعلق ہماری پالیسی کا سرچشمہ رہی ہیں، پاکستان کی عوامی پارٹی جس کی قیادت کا مجھے شرف حاصل ہے اُس کی رہنما بھی یہی دو چیزیں ہیں، اس بنا پر جو کچھ اچھائیاں ہمارے پاس ہیں، یا جو اچھی چیزیں ہم نے حاصل کی ہیں، خصوصاً ہمارا مساوات انسانی اور سماجی عدل و انصاف کا تصور، یہ سب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دین ہے، یہ سیرت کانفرنس جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور آپ کی تعلیمات کے ان پہلوؤں پر غور و خوض کرے گی تو اُس کو معلوم ہوگا کہ ماڈرن انسان کے دماغ میں اس موقع پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ اگر مساواتِ انسانی، سماجی انصاف اور اتحاد و اتفاق واقعی اسلام کی تعلیمات ہیں اور حضور ان کا نمونہ تھے تو پھر آج ہمارے ملک کی اکثریت کیوں سماجی ناانصافی، ظلم و تشدد، عدم مساوات، باہمی بغض و عناد، نفرت، استحصال بالجبر اور رنگ و نسل کے امتیاز اور تعصبات کا شکار ہے، ؟ تعلیم، فی کس آمدنی اور دوسرے ترقیاتی امور میں ہمارا اتنا سب دوسری بہت سی قوموں کے مقابلہ میں کیوں کم ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں

کہ ہم سے کہیں غلطی ہوئی ہے، یا ہم حضور کی سیرت اور آپ کی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں، مجھے یقین ہے کہ سیرت کانفرنس کے آئندہ بارہ دنوں میں آپ ان مسائل پر غور کریں گے۔

اس سلسلہ میں میرے نزدیک پہلی چیز جس پر سیرت کانفرنس کو توجہ کرنی چاہئے سیرت کا وہ حصہ ہے جو روایاتی اور افسانوی انداز کا ہے اور جس میں بحیثیت ایک اعلیٰ انسان کے حضور کا کیرکٹر اور کردار غیر اہم ہو کر رہ گیا ہے، اس بنا پر مسلمان علماء اور فضلا کا یہ فرض ہے کہ وہ سیرت سے اخذ کر کے حضور کا پیغام اور عمل جدید انسان کے سامنے بالکل صاف اور واضح شکل میں پیش کریں،

دوسری چیز جو آپ حضرات کی توجہ کی مستحق ہے وہ مغرب کے علمائے اسلامیات سے متعلق ہے، مغرب میں حضور کی تصویر کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے اس میں نفرت، عناد اور تعصب کی آمیزش ہے، یہ بات بڑی افسوسناک اور تکلیف دہ ہے کہ مغرب کا جدید انسان دنیا اور اس کے پڑوسی سیاروں کے بارہ میں اس درجہ روشن خیال ہے، لیکن دوسری طرف اسلام اور اس کے بانی کے متعلق وہ اب بھی قرونِ وسطیٰ کی تنگ نظری اور تاریک دماغی کا شکار ہے، سیرت کانفرنس کا یہ بھی فرض ہونا چاہئے کہ وہ اُن وسائل اور ذرائع پر غور کرے جو مغرب کے ان قدیم العہد تعصبات کو دور کرنے اور سیرت مقدسہ کو اُس کی صحیح شکل و صورت میں پیش کرنے میں کامیاب ہوں، ہمیں حضور کی سیرت مقدسہ کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرنا چاہئے کہ وہ مختلف مذہب و ملت کے لوگوں کے درمیان مفاہمت اور اُن میں باہمی اشتراک و تعاون کی بنیاد بن سکے اور اُس سے عالم میں امن و امان قایم کرنے میں مدد ملے، مجھ کو امید ہے کہ سیرت کانفرنس ان خطوط پر کام کرے گی، میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کا حامی اور ناصر ہو، بس ان الفاظ کے ساتھ میں بڑی خوشی سے اس پہلی عالمی سیرت کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں۔

اس تقریر کے بعد وزیر اعظم کے شکریہ کا ایک رزولیوشن جس کو حکیم محمد سعید نے پیش کیا تھا منظور ہوا اور جلسہ ختم ہو گیا، دوسرے دن یعنی ۴ / مارچ کو صبح کے وقت سیرت کانفرنس کا ابتدائی

جلسہ ینٹینل اسمبلی، پاکستان کے اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی اور ڈاکٹر عبدالرؤوف (امریکہ) کی مشترکہ صدارت میں منعقد ہوا اور مختلف حضرات نے سیرت کانفرنس کی اہمیت اور اُس کے لئے پاکستان گورنمنٹ کی پیش قدمی پر اظہارِ تحسین کیا۔ مقالات کا جلسہ سہ پہر میں ہوا۔ اس کے صدر ترکی کے وزیر امور مذہبی جناب حسن اکسوئے (Aksoy) تھے، اس میں دس مقالات پڑھے گئے، ترکی کے مندوب جناب عصمت بزدہ نے " اسلام اور سوشل جسٹس " پر مقالہ پڑھا اور اس میں کہا کہ اب تلوار کی جنگ کا زمانہ ختم ہوگیا اور افکار و نظریات کی جنگ کا زمانہ ہے، اس میں بھی اسلام کو وہی رول ادا کرنا ہے جو اُس نے تلوار کی جنگ کے دور میں ادا کیا تھا، قبرص کے مفتی ڈاکٹر رفعت مصطفیٰ نے اپنے مقالہ میں ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبرص کو اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنانا چاہتے تھے، چنانچہ ۲۸ھ میں مسلمانوں کا سب سے پہلا بحری بیڑا یہاں پہنچا تھا۔ حضرت ام حرام جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی والدہ کی طرح عزیز رکھتے تھے اُن کا مزار بھی یہیں ہے، لیکن ترک مسلمانوں کو اس جزیرہ سے بے دخل کرنے کی غرض سے یونانیوں نے وہاں جو قیامت برپا کر رکھی ہے اس کی وجہ سے مسلمانوں کے معابد و مقابر کے ساتھ حضرت ام حرام کے مزار کی بھی بے حرمتی کی گئی ہے، پروفیسر چارلس گڈیس (Geddes) ڈائرکٹر امریکن انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ڈینور یونیورسٹی نے اپنے مقالہ " اسلام امن وصلح کی ایک طاقت " میں اس حقیقت کا صاف اعتراف کیا کہ اسلام امن کا مذہب ہے اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کو لازمی طور پر عالمگیر سمجھنا چاہئے، انھوں نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ عیسائیوں اور یہودیوں نے عام طور پر اور خصوصاً مغربی ممالک میں، اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو بالکل سمجھا اور جانا ہی نہیں یا اُن کو غلط جانا اور اُن کی غلط تشریح کی ہے۔

پوری کانفرنس میں جو مقالات پڑھے گئے اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی، پھر سب مقالات یکساں معیار کے تھے بھی نہیں، بعض بلند پایہ اور غور و فکر اور تحقیق سے لکھے ہوئے

اور بعض ایسے کہ گویا عید میلاد النبی کے جلسہ میں وعظ ہو رہا ہے، علاوہ ازیں چوں کہ کانفرنس کی طرف سے کسی کو کوئی معین عنوان نہیں دیا گیا اور ہر مقالہ نگار کو اس کی آزادی تھی کہ وہ جس عنوان پر چاہے مقالہ لکھے اس بنا پر ایک ہی عنوان پر کئی کئی مقالے جمع ہو گئے،

ہمارے فاضل اور عزیز دوست جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے اپریل کے معارف میں اس کانفرنس کی جو روئداد لکھی ہے اُس میں انھوں نے ہر مقالہ کے عنوان کے ساتھ مقالہ نگار کا نام بھی لکھ دیا ہے، یہ بڑا طول عمل تھا جسے انھوں نے گوارا کر لیا، اس لئے جس کسی کو مقالات اور مقالہ نگاروں کی مکمل فہرست دیکھنی ہو معارف کو دیکھے، میں صرف خاص خاص مقالات کے ذکر اور اُن کے خلاصہ پر اکتفا کروں گا۔ البتہ چوں کہ ایک مورخ کے قلم سے جو چیز نکلتی ہے تاریخ بن جاتی ہے اس لئے یہ تنبیہ کر دینا ضروری ہے کہ سید صاحب نے اپنے سامنے مطبوعہ پروگرام رکھا اور اُس سے یہ فہرست مرتب کر لی، حالانکہ اس پروگرام میں بہت کچھ تغیر تبدل ہوا ہے، اگر وہ پروگرام کے بجائے کانفرنس کی طرف سے جو بلیٹن شائع ہوتے رہے اگر وہ اُن کو پیش نظر رکھتے تو یہ غلطی نہ ہوتی، مثلاً پروگرام میں حکیم عبدالحمید صاحب کی صدارت اور مقالہ دونوں موجود ہیں چنانچہ معارف میں بھی اس کا ذکر ہے، لیکن اس تاریخ (۶ و ۷ مارچ) تک حکیم صاحب لاہور پہنچے ہی نہ تھے، اس لئے نہ صدارت ہوئی اور نہ مقالہ، بہرحال اسلام آباد میں کل دس مقالات پڑھے گئے

لاہور میں | ۷ مارچ کو کانفرنس کا اجلاس اسلام آباد میں ختم ہو گیا۔ شب وہاں گذار کر ۸ کی صبح کو مندوبین لاہور پہنچے، آج جمعہ تھا اس لئے مقالات کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ مندوبین دیر سے پہنچے تھے، پھر اپنے کمروں تک پہنچنے اور کپڑے وغیرہ بدلنے میں دیر ہو گئی اس لئے جلدی جلدی لنچ زہر مار کر کے ایک بجے کے قریب شاہی مسجد کے لئے روانہ ہوئے، یہ مسجد اورنگ زیب عالمگیر کی بنائی ہوئی ہے اور وسعت میں آگرہ اور دلی کی جامع مسجدوں سے بڑی ہے، تقسیم سے پہلے یہ شکستہ حالت میں تھی لیکن اب مرمت کے بعد نئی جیسی ہو گئی ہے، مسجد میں مندوبین کے لئے

امام کے پیچھے کی دو تین صفیں مخصوص تھیں، مسجد میں اُن کے داخلہ کا انتظام بھی مغربی دروازہ سے تھا جہاں پیادہ اور سوار پولس کے اور سکورٹی کے انتظامات بہت بڑے پیمانہ پر تھے، شاہی مسجد کے مستقل امام اور خطیب مولانا عبدالقادر صاحب ہیں، بڑے جوش و خروش اور ہوش وگوش کے عالم اور مقرر ہیں۔ مجھ سے ان کو غائبانہ بڑی محبت اور خلوص کا تعلق تھا دس کے سفر میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں جو دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس ہوئی تھی تو اُس موقعہ پر بھی جمعہ کی نماز مولانا عبدالقادر صاحب نے پڑھائی تھی، لیکن آج امام حرم کعبہ شیخ عبداللہ بن سبیل ہمارے ساتھ تھے اس لئے ان کے سوا اور کس کو امامت کا حق ہو سکتا تھا، شاہی مسجد کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اُس کے بام و در امام حرم کعبہ کی خطابت و تلاوتِ کلام مجید کی دل نواز و روح پرور صدا سے گونج رہے تھے، نمازیوں پر جن کی تعداد دس بارہ لاکھ سے یقیناً کم نہ ہوگی اس تصور اور رحمت کی یاوری سے عالم وجد طاری ہوگیا، خود میرا حال یہ ہوا کہ

دل میں اِک درد اُٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

نماز ختم ہو چکی تو جلسۂ عام شروع ہوا، قرآنِ مجید کی تلاوت کے بعد مولانا کوثر نیازی شمالی یمن کے وزیر اوقاف محمد الصباحی، اور شام اور لبنان کے مفتی شیخ حسن خالد اور شیخ احمد کفتارو نے تقریریں کیں، میں کچھ دیر جلسہ میں بیٹھا۔ پھر اُٹھ کر دیوار قبلہ کی پشت پر ایک بڑا چبوترہ ہے اُس پر متعدد صوفہ سٹ اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر بہت سے مندوبین پہلے سے موجود تھے، میں یہاں چلا آیا اور سب سے الگ ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے عہد ماضی کے تصورات میں غرق ہوگیا۔

شاہی مسجد اپنے دامن میں تاریخی عظمت کے بہت سے گوہر ہائے گرانمایہ رکھتی ہے اس کی مشرقی دیوار کے پیچھے علامہ اقبال کے مقبرہ نے اس مقام کی عظمت میں اور چار چاند لگا دیئے ہیں

مقبرہ سے متصل ایک پارک ہے جس کی وجہ سے یہ پورا علاقہ حضوری باغ کہلاتا ہے، مجھ کو اس مقام اور اُس کے ماحول سے ایک قسم کا جذباتی لگاؤ ہے کیوں کہ عنفوانِ شباب کی بہت سی یادیں اس سے وابستہ ہیں، ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے کہ میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہو چکا تھا اور پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا اور اب انگریزی تعلیم کے اورنٹیل کالج، لاہور میں داخلہ لیا تھا، اُس وقت تک کالج کا ہوسٹل نہیں بنا تھا اس لئے ہندو، مسلمان اور سکھ سب طلبا اسی حضوری باغ میں بڑے دروازہ کے اوپر دونوں جانب جو بارکیں بنی ہوئی ہیں ان میں بطور ہوسٹل کے رہتے تھے، یہیں نمبر۶ کے کمرہ میں میں تنہا رہتا تھا، کم و بیش نو مہینے یہاں قیام رہا ہوگا، اس زمانہ میں لاہور علم و فضل اور شعر و ادب کا قرطبہ و بغداد تھا اور پورے ملک میں اس کی عظمت و شہرت کا ڈنکا اس طرح بج رہا تھا کہ دلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کی عظمت دیرین کے ترانے مدہم ہو گئے تھے. اکابر علم و فن اور محققین میں علامہ اقبال، علامہ عبداللہ یوسف علی، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبالؔ حافظ محمود شیرانی، علماء میں مولانا احمد علی، مولانا نجم الدین، مولانا سید طلحہ، اربابِ صحافت و ادب میں مولانا ظفر علی خان، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، سر عبدالقادر، احمد شاہ بخاری، امتیاز علی تاج، اور شعرا میں تاجور نجیب آبادی، اختر شیرانی. حفیظ جالندھری، ترلوک چند محروم، اور محمد دین تاثیر، یہ سب حضرات وہ تھے جو اُس زمانہ میں غیر منقسم ہندوستان کی علمی اور ادبی فضا پر چھائے ہوئے تھے، کسی سے کم، کسی سے زیادہ میل جول اور ملاقات تو سب سے ہی تھی، لیکن علامہ اقبال اور مولانا احمد علی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا، ان دونوں حضرات کو اس کا علم تھا کہ حضرت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ کشمیری) سے مجھ کو صرف شرفِ تلمذ ہی حاصل نہیں، بلکہ حضرت مجھ پر شفقتِ خاص بھی رکھتے ہیں اس بنا پر یہ دونوں بزرگ بھی التفاتِ خاص سے نوازتے، اور مختلف مسائل پر بے تکلف اظہارِ خیال کرتے تھے اس سے عصری مسائل پر غور کرنے اور دنیا کا رُخ سمجھنے کا ذوق پیدا ہوا، پھر احباب میں.

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے اہلِ علم و اربابِ ذوق شامل تھے، ان سے اکثر مجالسیں اور صحبتیں رہتی تھیں، پھر لاہور زندہ دلانِ پنجاب کا وطن تھا اور یہاں زندہ دلی کے تمام سامان موجود تھے، اللہ کا شکر ہے کہ دامن کبھی آلودۂ معصیت نہیں ہوا۔ لیکن مناظرِ فطرت سے لطف اندوز ہونے میں کوتاہی نہیں ہوئی ان وجوہ کی بنا پر لاہور میں میرے تعلقات اس درجہ وسیع تھے اور لاہور اتنا عزیز ہو گیا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد بھی تقسیم سے ایک سال پہلے تک کوئی برس ایسا نہیں ہوا کہ میں گرمیوں کی تعطیلات میں کم از کم دس پندرہ دن کے لئے یہاں نہ آیا ہوں۔

میں عہدِ گذشتکی ان یادوں اور تصورات میں غرق تھا ہی کہ جلسہ ختم ہو گیا، اس کے بعد علامہ اقبال کے مزار پر حاضری اور فاتحہ خوانی کا پروگرام تھا، مگر شاید تاخیر ہو جانے کے باعث وہ ملتوی ہو گیا، اور سب مندوبین یہیں قریب میں ایک اسلامی میوزیم ہے وہاں پہنچ گئے، یہ میوزیم میں نے بھی اب تک نہیں دیکھا تھا، اس لئے جی بھر کر دیکھا، یہاں مسلمانوں کے آرٹ، فنونِ لطیفہ خطاطی، برتن سازی اور پارچہ بافی کے اعلیٰ نمونے اور نوادر اور مخطوطات کا بھی بڑا ذخیرہ موجود تھا، ایک کونہ میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے دوست خواجہ عبدالرشید کے کلکشن کا بھی ایک حصہ مع اُن کے نام اور فوٹو کے رونقِ میوزیم تھا جو انھوں نے وقف کر دیا تھا، یہیں میوزیم کی طرف سے عصرانہ کا انتظام تھا جو بہت پر تکلف اور شان دار تھا، یہاں یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ کانفرنس کے دوران کوئی استقبالیہ، کوئی لنچ اور کوئی ڈنر ایسا نہیں ہوا جو نہایت پر تکلف اور شان دار نہ ہو اس لئے اب میں آئندہ صرف استقبالیہ لنچ یا ڈنر لکھوں گا اور اُس کو کسی صفت سے موصوف نہ کروں گا۔ میں عادۃً لنچ اور ڈنر کے درمیان چائے کی ایک پیالی کے سوا کچھ نہیں کھاتا، لیکن یہاں چکن پٹی جو پیسٹری کے اقسام میں مجھے سب سے زیادہ مرغوب ہے اس قدر اعلیٰ قسم کی اور گرم تھی کہ اُس کے تین پیس نوشِ جان کر گیا، اس کے بعد مغرب کے قریب ہم سب ہوٹل واپس آ گئے۔

ان اجتماعات کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے اور کچھ نئے لوگوں سے تعارف اور اُن میں سے بعضوں سے دوستی ہو جاتی ہے، حکیم محمد سعید صاحب سے تو ملاقات صبح جب مندوبین اسلام آباد سے آئے تھے اُسی وقت ہو گئی تھی، اُن سے اور اُن کے خاندان سے گھر کے سے اور دیرینہ تعلقات ہیں، مندوبین میں متعدد حضرات میرے پہلے سے جانے پہچانے اور بعض ذاتی دوست بھی ہیں مثلاً ڈربن کے ڈاکٹر صالح مال اور انکی بیگم، جاپان کے عبدالکریم اسٹو، ایران کے مجتہد زادہ - کویت کے شیخ یوسف رفاعی، امریکہ کے پروفیسر منٹگمری واٹ، مصر کے ڈاکٹر عبدالحلیم محمود شیخ ازہر، وغیرہ وغیرہ - مغرب کی نماز کے بعد ان سب حضرات سے ملاقات اور بات چیت ہوئی۔

مولانا کوثر نیازی | مولانا کوثر نیازی سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی، اگرچہ اُن کا قیام میرے کمرہ کے سامنے والے کمرہ میں ہی تھا - مگر اُن کے کمرہ پر پہرا تھا اس لئے میں نے وہاں جا کر ملنا مناسب نہیں سمجھا، پھر وہ باہر نکلے تو مجمع میں رَل مِل گئے، اور مجمع میں گھس کر کسی سے ملنا میری افتادِ طبع کے خلاف ہے۔ البتہ یہیں ہوٹل میں پنجاب کے چیف منسٹر یا گورنر کی طرف سے جوڈنر تھا اُس میں ایک موقع پر میرا آمنا سامنا ہو گیا اور میں نے اُن کو اپنا نام بتایا تو زور سے آخاہ! کہتے ہوئے بغلگیر ہو گئے، مولانا فیڈرل گورنمنٹ میں اوقاف اور امور مذہبی کے وزیر ہیں، نہایت ذہین، طباع اور بڑے وجیہ اور فاضل ہیں، انگریزی، عربی اور اردو تینوں زبانوں کی تحریر و تقریر پر قادر ہیں، اب تک ایک درجن سے زائد کتابیں جن کا تعارف آئندہ کرایا جائے گا اُن کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکی ہیں اور وہ تینوں زبانوں میں ہیں - کانفرنس میں انھوں نے تینوں زبانوں میں تقریریں کیں، اردو زبان کے پرجوش خطیب اور مقرر ہیں اور پنجابی تو ان کی مادری زبان ہے اُس کے تو ہوں گے ہی، مولانا نے، جیسا کہ انھوں نے بیان کیا، میری سب کتابیں پڑھی ہیں اور اُن کے قدر دان ہیں، علی الخصوص ایک صحبت میں صدیق اکبر کی بے حد تعریف کی اور فرمایا "میرے نزدیک اسلامی لٹریچر میں اس کتاب کا جواب نہیں" اور یہ فرما کر دعائیں دیں، برہان کا شروع سے بڑے شوق اور پابندی سے مطالعہ

کرتے ہیں، چنانچہ احمد سعید صاحب ملیح آبادی نے اپنی کتاب "آج کا پاکستان" میں مولانا کوثر نیازی سے انٹرویو کے سلسلہ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، کئی سال کے تعطل کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں رسائل و مجلات بھی آمد و رفت کا راستہ کھلا تو وزارت کے سکریٹری زاہد ملک صاحب نے مولانا کی طرف سے اڈیٹر برہان کو خط لکھا کہ "اب راستہ کھل گیا ہے، رسالہ جاری کر دیجئے، اور زرِ چندہ بھیجنے کا جب امکان ہوگا اُس وقت بھیج دیا جائے گا، دفتر کی جانب سے جواب گیا کہ رسالہ جاری کیا جارہا ہے، اب آئندہ یہ آپ کے پاس اعزازی آتا رہے گا آپ چندہ کا خیال نہ کریں" برہان کے ساتھ اس درجہ تعلق کے باعث مولانا کو میرے ساتھ بھی محبت اور اخلاص کا گہرا تعلق ہے جس کا اظہار کانفرنس کے دوران میں اور اُس کے بعد بھی بار بار ہوا، اس وقت ہماری یہ ملاقات پہلی تھی مگر مولانا اس طرح ملے کہ گویا برسوں کے ساتھی اور دوست ہیں، پنجاب کے گورنر اور چیف منسٹر اس وقت ساتھ تھے مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا تو یہی کہہ کر کہ یہ اُس رسالہ کے اڈیٹر ہیں جسے میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، مولانا علمی اور ادبی کمالات کے ساتھ بڑے خوش اخلاق، شگفتہ طبع اور بذلہ سنج بھی ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں، اُن کی نعتیں اور غزلیں قوال گاتے ہیں اور ریڈیو سے نشر ہوتی ہیں۔ باقی

تفسیر کاشف الحقائق کا نادر مخطوطہ

جناب مولانا نظام الدین احمد صاحب کاظمی

یہ تفسیر علامہ محمد بن احمد بن محمد الشریحی الکندی ثم التھانیسری ثم الگجراتی کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔ تفسیر کا پورا نام "کاشف الحقایق وقاموس الدقایق" ہے اس تفسیر کا ایک گراں قدر اور نادر قلمی نسخہ حضرت مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجددی نقشبندی دہلوی سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ ابوالخیر قدس سرہٗ کے ذاتی کتاب خانہ میں موجود ہے۔

تفسیر کاشف الحقایق کا یہ مکمل نسخہ خط نسخ کی دیدہ زیب کتابت کا عمدہ نمونہ ہے ۱۱۲۶ صفحات کی یہ ضخیم کتاب کاتب نے بڑے اہتمام اور شوق کے ساتھ لکھی ہے، نکھرے ہوئے حنائی رنگ کے چکنے اور قیمتی کاشمیری کاغذ پر سیاہ چمکیلی روشنائی کی کتابت اور اس میں جگہ جگہ شنگرفی تحریر کی لالہ کاری نے کتاب کے حسن وجمال کو دوبالا کر دیا ہے۔

اس نسخے کا خوبصورت سائز لمبائی میں ۲۵ سینٹی میٹر اور چوڑائی میں ½۱۴ سینٹی میٹر ہے۔ مسطر کا سائز لمبائی میں ۱۹ سینٹی میٹر اور چوڑائی میں ۹ سینٹی میٹر ہے۔ ہر صفحے میں ۲۳ سطریں ہیں۔ قلم درمیانی اور بین السطور مناسب ہے۔ حاشیہ کی جگہ بالکل سادہ ہے۔

قرآنِ حکیم کی یہ مکمل عارفانہ اور عالمانہ تفسیر عربی میں ہے۔ زبان وبیان کی سلاست اور حلاوت کے ساتھ حقیقت وطریقت کے حقایق ودقایق کا انکشاف مصنف کے کمالِ علم وفضل کا آئینہ دار ہے۔ آغازِ کتاب کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین ۔ الحمد للہ رب العالمین الذی انزل علی حبیبہ القرآن وجعلہ ھادیا الی دقائق لاھل العرفان واودع فیہ لطائف اسرار"

خطبۂ کتاب کی عبارت بہت مختصر ہے لیکن اس کے مطالعے سے خود مصنف کے الفاظ میں تفسیر لکھنے کی غرض وغایت اور مفسر کا نام اُن کی نسبی اور وطنی نسبتوں کے ساتھ معلوم ہوجاتا ہے ۔ اس لئے بلفظہٖ نقل کی جاتی ہے :۔

" اما بعد فیقول اضعف عباد اللہ المعجّد محمّد بن احمد بن محمّد الشریحی الکندی ثم التھانیسری ثم الگجراتی اصلح اللہ شانہ وغفرلہٗ ولوالدیہ وانعم علیھما وعلیہ بما لدیہما کانت اکثر التفاسیر مملوۃ لفوائد العربیۃ والشرعیۃ ولم یکن تفسیر حاویا لدقائق الطریقہ والحقیقہ بحیث یکون احسن تحریرا واصلح تقریرا اردت ان اکتب تفسیرا موجزا شاملا لاسرار الالھیات کاشفا لما فی القرآن من التدقیقات ھادیا الی طریق الرشاد موصلا الی سبیل السداد وترکت الایجاز والاطناب لیصل الی مقصودہ کل احد من ذوی الالباب واخذت من بعض التفاسیر بعین کلامہ المنقول وقلت فی اکثر مواضع لطائف منی لم یطلع علیھا ذوی العقول فان وقع شیٔ ظاھرا فی تنیا فی خلاف الشرعیۃ فانی قائل ذلک بطریق المجاز لا بسبیل الحقیقۃ وان تری بیانا لا یوافق بشان النزول ولا یطابق بما ھو المنقول فاعلم ان ذلک معنی الاشارۃ لا نحوی الکلام ولم ینکر ھذا احد من الاصحاب الکرام بل وصل ذلک للمتاخرین

والخاف عن المتقدمین والسلف وسمیته کاشف الحقایق وقاموس الدقایق، ارجوان یکون لی ذخیرة یوم القیمة وشفیعی الاکبر اذا وقعة الواقعة لیس لوقعتها کاذبة وقد لبشرت بھذہ التفسیر فی النوم فشرعت تالیفہ اثر ذلک وباللہ التوفیق والاعانة ''

مصنف کی اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ اکثر تفسیریں عربیت اور شریعت کے مطالب اور مسائل سے مملو ہیں۔ کوئی تفسیر ایسی نہیں ہے جس میں حقیقت و طریقت کے رموز و اسرار بیان کئے گئے ہوں۔ اس لئے میں نے یہ تفسیر لکھی امید ہے کہ یہ میرے لئے قیامت کے دن ذخیرۂ خیر اور شفیع اکبر ہوگی۔

تفسیر کا اختتام درج ذیل عبارت پر ہوا ہے۔

'' واما قولھم رویة الاشیاء بدلائل التوحید فانھم یریدون احدیة کل موجود علین الدلیل علی احدیة الحق۔ من الجنة والناس ''۔

تفسیر کاشف الحقایق و قاموس الدقایق کے ایک قلمی نسخے کا تعارف ڈاکٹر محمد سالم قدوائی نے بھی اپنی کتاب (ہندوستانی مفسرین اور اُن کی عربی تفسیریں صفحہ ۲۶ تا ۲۷ شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی) میں کرایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ تفسیر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ کتاب صاف ستھرے خط میں لکھی ہے۔ اس میں ۱۳۷، اوراق ہیں۔ اکثر جگہوں پر حواشی بھی لکھے ہیں۔ غالباً مصنف کے تحریر کردہ ہیں۔ کہیں کہیں پر کرم خوردہ ہے۔ آخر کے دو صفحے خاصے بوسیدہ ہیں بیچ بیچ میں نسخہ کی جگہوں پر سادہ رہ گیا ہے۔ غالباً اصل سے نقل کرتے وقت رہ گیا ہوگا۔ یا اگر یہ نسخہ خود مصنف کے قلم کا ہے تو انھوں نے اس لئے چھوڑ دیا ہوگا کہ بعد میں لکھیں گے لیکن پھر نہ لکھ سکے ہوں گے۔ کچھ جگہوں پر اوراق غلط طریقہ پر مرتب ہوئے ہیں ''۔

یہ بہت ہی نادر تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے نسخے کا پتہ نہیں چلتا۔ مندرجہ بالا سطور میں جو قیاسات ڈاکٹر محمد سالم صاحب نے ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے کو مصنّف کا نسخہ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ظاہر کئے ہیں۔ وہ احقر کے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی ناقص اور غیر مرتب نسخے کی نقل ہے۔ اور بعد میں ناقل کو دوسرا اکمل و مرتب نسخہ دستیاب نہیں ہوا جس سے وہ اپنے ناقص اور نامکمل نسخے کی تکمیل کرتا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مصنّف نے تفسیر پوری لکھی اور اس کا مکمل و مرتب نسخہ آج بھی حضرت مولانا زید فاروقی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ تاہم ڈاکٹر قدوائی کی یہ کوشش و کاوش قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے تفصیل کے ساتھ تفسیر کاشف الحقائق سے روشناس کرایا۔ اور اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ تفسیر محمدی اور تفسیر کاشف الحقائق ایک ہی تفسیر ہے اور اس کے مصنّف محمد بن احمد بن نصیر میانجیو گجراتی (متوفی ۹۸۲ھ) ہیں۔

اس غلط فہمی اور غلط مبحث کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ تفسیر کاشف الحقائق اور تفسیر محمدی دونوں کے مصنفوں کا نام محمد اور والد کا نام احمد ہے۔ پھر دونوں گجراتی بھی ہیں۔ نام ولدیت اور سکونت کی یکسانیت التباس کا باعث بن گئی۔ اور اسی التباس کی وجہ سے شاید ڈاکٹر زبید احمد صاحب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے دونوں تفسیروں کو ایک ہی مصنّف کی ایک ہی تفسیر ظاہر کیا۔ غالباً ہر دو حضرات کو تفسیریں دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ کہ وہ ان میں فرق و امتیاز کرتے دوسری وجہ التباس کی یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ علامہ محمد بن احمد بن محمد الشریحی الکندی ثم التھانیسری ثم الگجراتی کے حالات کا علم تاحال ہمارے ریسرچ اسکالرس کو نہیں ہے۔ خود ڈاکٹر محمد سالم صاحب کے دامنِ فکر و تلاش کو ناموں کے التباس نے ایک نئے اور قوی شبہ میں الجھا دیا اور وہ یہ کہ تفسیر کاشف الحقائق کے مصنّف محمد بن احمد الشریحی الکندی ثم التھانیسری ثم الگجراتی گویا شیخ احمد التھانیسری ہیں (متوفی ۸۲۰ھ) چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون میں جو انھوں نے "تفسیر محمدی" کے تعارف کے لئے ماہنامہ معارف نمبر ۲ جلد ۹۷ ص ۱۳۸ تا ۱۴۹ ماہ فروری ۱۹۶۶ء میں شائع کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"مختلف تذکروں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد بن محمد تھانیسری نام کے ایک ہی بزرگ اس زمانے میں ہوئے ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر یہ شبہ خاصا قوی ہو جاتا ہے کہ یہی کاشف الحقائق کے مصنّف ہیں"۔

حالانکہ شیخ احمد تھانیسری، احمد بن محمد التھانیسری ہیں اور کاشف الحقائق کے مصنّف کا نام محمد بن احمد الشریکی ہے۔

افسوس ہے کہ تفسیر کاشف الحقائق کے مذکورہ بالا دونوں قلمی نسخوں میں سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کس عہد کی تصنیف ہے اور فاضل مفسّر کی یہ تفسیر جس کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بقول مفسر اوّلیت کا شرف حاصل ہے، اپنے عہد تک لکھی جانے والی عربی تفاسیر میں کیا درجہ رکھتی ہے۔ اس ضمن میں خاصی اور کافی جستجو کی ضرورت ہے۔ مردانِ کار کی کمی ضرور ہے، فقدان نہیں ہے۔ دیکھئے یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔

تاریخ ادبیات ایران

"تاریخ ادبیات ایران" تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ادبیات "ڈاکٹر رضا زادہ شفق" کی قابلِ تعریف تالیف ہے جس کو سید مبارز الدین رفعت نے اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے اس کتاب میں ادبیاتِ ایران اور اس کی ثقافت کے ایک ایک گوشے پر دل پذیر اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قبل اسلام ایرانی ادبیات سے لے کر موجودہ دور کی ادبیات، شاعری اور اُس کے زبردست اثرات کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ایران کے ہر دور کے شاعروں اور آدمیوں کے حالات اور کلام کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے، ایرانی کلچر و ثقافت، اس کی نظم و نثر، شاعری اور شاعروں کے حالات پر آج تک اس پایہ کی کوئی کتاب اُردو میں شائع نہیں ہوئی تھی۔

صفحات ۵۶۰ سائز ۲۶×۲۰ قیمت

ادبیات

غزل

جناب شبیر احمد راہی (ایم۔ اے)
"بھیونڈی" تھانہ

چھوڑ کر سارے جہاں کو ترے در پر آئے
جستجو میں تری ہم بن کے گداگر آئے

سر جھکایا نہ کبھی ہم نے کسی کے آگے
لاکھوں بت خانے سجے، سینکڑوں آذر آئے

اس طرح خانۂ دل میں مرے خوشیاں آئیں
جیسے بستی میں غریبوں کے تونگر آئے

اتنا کہنا تھا کہ جو کچھ ہے جہاں میں تو ہے
تیرے دیوانے پہ ہر سمت سے پتھر آئے

تشنہ لب کم نہیں ساقی ترے میخانہ میں
مجھ کو شکوہ نہیں، آئے کہ نہ ساغر آئے

اس طرح چھوڑ کے دنیا کو چلا ہوں جیسے
صبح کا بھولا ہوا شام ڈھلے گھر آئے

آج راہی کو عجب شان سے آتے دیکھا
جیسے محفل میں کوئی مردِ قلندر آئے

تبصرے

آج کا پاکستان از جناب احمد سعید صاحب ملیح آبادی اڈیٹر روزنامۂ آزاد ہند، کلکتہ، تقطیع متوسط ضخامت ۲۸۰ صفحات، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد -/15 پتہ: دفتر آزاد ہند نمبر ۲۲ - اے بیاگردت لین، کلکتہ - ۱۲ -

لائق مولف اُردو زبان کے مشہور صحافی ہیں اور اپنی سمجھ بوجھ بالغ نظری حسن نگارش اور فنی لیاقت وقابلیت کے باعث اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں جو دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی موصوف ہندوستان کے واحد جرنلسٹ تھے جو اُس میں شریک ہوئے تھے، کانفرنس کے اختتام پر انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا، ہر چیز بصیرت اور بصارت سے دیکھی، عمائدِ حکومت اور مختلف جماعتوں اور پارٹیوں کے لیڈروں سے بحیثیت ایک صحافی کے انٹرویو لئے، وطن واپس آکر موصوف نے اپنے مشاہدات وتاثرات قسط وار اپنے اخبار میں لکھے تھے جو اس درجہ مقبول ہوئے کہ متعدد اخبارات نے انھیں نقل کیا اور بعض انگریزی اخبارات نے اُن کی تلخیص اپنے یہاں انگریزی میں شائع کی، اس کے بعد پبلک کے مطالبہ پر انھیں مضامین کو از سرِ نو مرتب کرکے اور اُن میں بہت کچھ اضافہ کرکے زیر تبصرہ کتاب کی شکل میں شائع کردیا گیا ہے۔

کتاب دو حصوں پر تقسیم ہے، پہلے حصّہ میں جو صفحہ ۱۶۸ تک پھیلا ہوا ہے، پاکستان کی معیشت ومعاشرت، اُس کی داخلی پالیسی اور خارجہ پالیسی میں چین امریکہ، روس، ایران اور عرب ممالک کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت

ان تعلقات میں نشیب و فراز، اس کے وجوہ و اسباب، ہندوستان کی پُرامن کوششیں پاکستان کا ہندوستان کے متعلق نقطۂ نظر، مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش میں تبدیل ہوجانے کے اسباب و علل، اس کے نتائج، ایوب خان اور یحییٰ خان کی سیاست مسٹر بھٹو کی شخصیت، ان کی گورنمنٹ کے اقتصادی اور سیاسی کارنامے، مہاجرین کی حالت، پاکستان کی اقلیتیں، پاکستان کے عوام میں اندرا گاندھی کی مقبولیت، بازار میں اشیا کا نرخ، تعلیم، صنعت و حرفت اور تجارت، اردو کی حالت، اِن سب پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرا باب سفرنامہ کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں کلکتہ سے روانگی سے لے کر واپسی تک کے تمام حالات جن میں سفر کی دلچسپ روئداد کے علاوہ اسلامی سربراہوں کی دوسری کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال، تقریریں، دعوتیں اور پارٹیاں، بنگلہ دیش کے تسلیم کرلینے کا اعلان، مسٹر بھٹو کی پریس کانفرنس، پورے پاکستان کا دورہ، ملاقاتیں، دعوتیں اور پھر وزرائے حکومت، مخالف پارٹیوں کے لیڈروں سے انٹرویو، یہ سب چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ جو کچھ لکھا ہے مدلل اور اعداد و شمار کی روشنی میں بڑی محنت اور تحقیق و تدقیق سے لکھا ہے۔ جو رائے ظاہر کی ہے متوازن اور معتدل ہے، زبان و بیان شگفتہ، دلچسپ اور سنجیدہ و متین ہے۔ اس کتاب نے اردو صحافت کو انگریزی صحافت کے پہلو میں لا بٹھایا ہے۔ اردو میں کیا انگریزی میں بھی پاکستان کے ماضی قریب اور اس کے حال پر اس قدر سنجیدہ، معتدل و متوازن اور پُر از معلومات کتاب شاذ و نادر ہی ہوگی۔

بازگشت از جناب کبیر احمد صاحب جائسی لکچرر فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ، تقطیع متوسط ضخامت ۱۹۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد -/16، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار - دہلی-۶ -

یہ اُن چھ مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف معیاری مجلات و رسائل میں چھپتے رہے تھے۔ ان میں پہلا مضمون مجیر بیلقانی کی غزلوں پر ہے جو چھٹی صدی ہجری کا مشہور شاعر اور خاقانی کا شاگرد ہے۔ اگرچہ بعد میں اس سے بگاڑ ہو گیا تھا۔ اس میں مجیر کے حالات و سوانح حیات کہنے کے بعد غزل گو ہم عصر شعراء سے مقابلہ و موازنہ کر کے مجیر کی غزلوں کا مرتبہ و مقام متعین کیا گیا ہے اور اس کی شاعری پر بعض لوگوں نے جو اعتراضات کئے ہیں۔ اُن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ باقی مقالات کے عنوانات یہ ہیں۔ (۱)۔ اقبال اور حافظ (۲)، غالب کی فارسی غزلگوئی (۳)۔ دستنبو پر ایک نظر یعنی اسے در حقیقت غدر ۱۸۵۷ء کی تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے۔ (۴)، احمد کسروی تبریزی، ایران کے عصرِ حاضر کے نامور محقق، ادیب اور مصنف کے دلچسپ حالات و سوانح جو ان کی خود نوشت سوانح عمری سے ماخوذ ہیں۔ (۵)۔ استاد عبدالعظیم قریب، ایران کے مشہور معلّم ادیب اور شاعر، اُن کے حالات اور کارنامے اور غزلوں سے نفرت کے جذبہ میں انھوں نے جو بے راہ روی اختیار کی ہے اس کا جواب یہ مقالہ بھی صاحب سوانح کی خود نوشت سوانح حیات پر مبنی ہے۔ مقالات فارسی زبان و ادب کے طلبار کے علاوہ عام اربابِ ذوق کے مطالعہ مطالعہ کے لائق ہیں۔ ان سے لائق نوجوان مؤلّف کا ذوقِ تحقیق، تنقیدی شعور اور وسعتِ مطالعہ نمایاں ہیں۔ زبان برجستہ و شگفتہ اور سلیس و رواں ہے۔

پروانہ چراغ مزار خودیم ما از ڈاکٹر شعیب اعظمی لکچرر فارسی جامعہ ملّیہ اسلامیہ، تقطیع متوسط، ضخامت ۲۸۸ صفحات، کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت -/12 پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶۔

اعظم گڑھ ایک بڑا مردم خیز خطّہ ہے اس جیسے اور علاقوں کے سوتے خشک ہو گئے یا ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس کی زرخیزی نہ صرف قائم بلکہ روز افزوں ہے۔ اس خطّہ نے جو افراد پیدا کئے اُن میں حکیم محمد اسحاق صاحب (متوفی ۱۸ فروری ۱۹۱۵ء) بھی تھے۔ مرحوم پرانی وضع کے جامع الصفات بزرگ

تھے پختہ استعداد کے عالم وفاضل، حاذق اور کامیاب طبیب، اعلیٰ درجہ کے حافظ اور قاری، سرگرم اور پرجوش قومی کارکن، عابد شب زندہ دار، خدمتِ خلق اُن کا شعار، مہمان نواز متواضع خندہ جبین و شگفتہ طبع غرض کہ بہر صفت موصوف تھے۔ مرحوم نے اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھنی شروع کی تھی جو ناتمام رہی۔ اب لائق نوجوان مرتب نے جو مرحوم کے فرزند رشید ہیں اس کو مرتب اور اپنی طرف سے اس کی تکمیل کر کے شایع کر دیا ہے اور شروع میں اعظم گڑھ کی تاریخ پر ایک مختصر مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ فرد واحد کی داستانِ حیات ہے لیکن ساتھ ہی گذشتہ نصف صدی کی علمی، ادبی، سماجی، سیاسی، اور تہذیبی تاریخ بھی ہے۔ اس کا مطالعہ مفید بھی ہوگا اور معلومات افزا بھی۔

زبان فارسی تازہ از جناب خان محمد عاطف صاحب ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی، تقطیع خورد ضخامت ۹۶ صفحات، کتابت و طباعت معمولی، قیمت 2/- پتہ: دانش محل امین آباد لکھنؤ

یہ کتاب جدید فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم کے لئے لکھی گئی ہے۔ اسمیں پہلے بے ترتیب جملے اور مفرد الفاظ اردو معانی کے ساتھ ہیں۔ پھر افعال اور ابواب کی گردانیں ہیں۔ اسکے بعد حروفِ ربط اور اضافت وغیرہ کا بیان مع مثالوں کے اور پھر مفرد الفاظ کی ایک فہرست ہے لیکن اول تو کتاب چھپی بہت غلط ہے جو اس جیسی کتابوں کے لیے سخت مضر اور نقصان رساں ہے اور پھر کتاب کے مضامین مربوط نہیں ہیں۔ جدید فارسی بچوں کو سکھانے کے لئے مناسب یہ تھا کہ جملے کی تعریف اور اسکے اقسام بیان کرنے کے بعد اسمار افعال اور حروف الگ الگ بیان کئے جاتے اور جملوں کے ذریعہ ان کی تشریح کے ساتھ مشق کرائی جاتی۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بتایا جاتا کہ قدیم فارسی میں اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں مگر جدید فارسی میں یوں کہتے ہیں۔ پھر جدید فارسی کے الفاظ و محاورات اور ان کے محلِ استعمال کی ایک سیر حاصل فہرست ہوتی۔ موجودہ حالت میں کوئی طالبِ علم استاد کے بغیر اس سے استفادہ مشکل سے ہی کر سکے گا۔